کا

جلد دوم

تالیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی
صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)
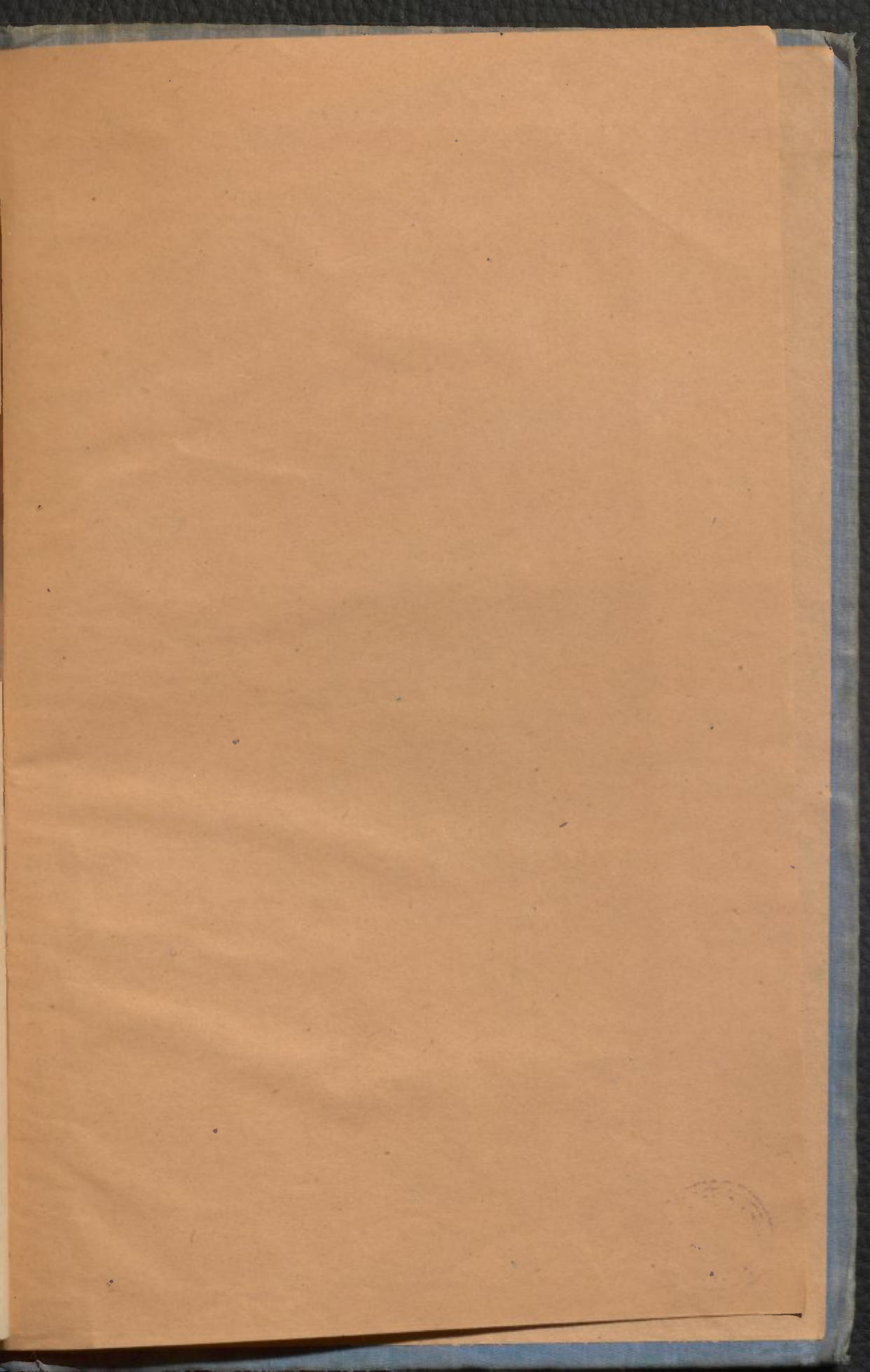
ندوۃ المصنفین دہلی

سلسلۂ مطبوعات ندوۃ المصنفین (۲۳)

ہندوستان میں مسلمانوں
کا
نظامِ تعلیم و تربیت
جلد دوم

جس میں نہایت تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے زمانے سے لیکر اب تک تاریخ کے مختلف دوروں میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت کیا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ جگہ جگہ اہم اور معرکۃ الآرا مباحث آ گئے ہیں۔

تالیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی
صدر شعبۂ دینیات، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن
رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین

مطبوعہ

مطبع انتظامی حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلاۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

بجائے ایک جلد کے وہی کتاب جو ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں شروع ہوئی تھی دو جلدوں میں تقسیم ہوگئی۔ پہلی جلد کے بعد دوسری جلد اب آپ کے سامنے ہے۔ جنگ کی افراتفری میں جہاں دنیا کے دوسرے بڑے چھوٹے کام متاثر ہو رہے ہیں، اشاعت و طباعتِ کتب کا مسئلہ بھی حصہ رسدی کے مطابق مصائب کا شکار ہے۔ کتاب کی اس دوسری جلد کی کاپی دلی میں لکھی گئی، چھپنے کے لئے حیدرآباد آئی۔ اس طول عمل کی وجہ سے جو رکاوٹیں پیدا ہوئیں، اب ان کی تفصیل

سفینہ اپنا کنارہ جب آ لگا غالب خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

البتہ اس تگ و دو، اور ذمہ داریوں کو مختلف حضرات کے سپرد کرنے کا خمیازہ کہیئے یا بحالتِ بیکسی و مسافرت اِس غریب کتاب کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ عام طباعی اغلاط کے دو جگہ ایسی ناقابلِ عفو فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ اُن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔ پڑھنے سے پہلے ہی ناظرین کو ان سے واقف کر دینا ضروری ہے:۔

ملاحظہ ہو کتاب کا ص ۲۰۹ اس میں ایک روایت کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ کس کتاب کی یہ روایت اس کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ لیکن بحمد اللہ بعد کو امام بخاری کی کتاب ادب المفرد میں وہ روایت مل گئی، اس لئے پہلی عبارت کو قلمزد کر کے کتاب کا حوالہ دے دیا گیا۔ لیکن کاتب صاحب کی مہربانی کہ انھوں نے اُسے قلمزد نہیں فرمایا، گویا روایت کے مل جانے اور نہ ملنے کا ذکر اس میں درج کیا ہے۔

اسی طرح ص ۲۹۳ میں ایک نوٹ جس کا اندراج حاشیہ میں ہونا چاہیئے تھا، کاتب صاحب نے اصل کتاب کی عبارت میں اس کو اس طرح شریک کر دیا ہے کہ مضمون ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ اربابِ نظر سے توقع ہے کہ ان غلطیوں کو معاف فرمائیں گے۔

باقی عام غلطیوں کے متعلق کیا لکھا جائے۔ غلط ناموں کا اضافہ عموماً مفید ثابت نہیں ہوا ہے مشکل ہی سے پڑھنے والے ان سے نفع اُٹھاتے ہیں، کاغذ کی گرانی کے اس زمانہ میں اس لئے اس کے اضافہ کی ہمت نہ ہوئی۔

کتاب کی پہلی جلد کو پڑھکر مختلف دوائر اور حلقوں میں اس کا جو اثر لیا گیا، مسکین مصنف کے توقعات سے وہ بہت زیادہ ہے۔ البتہ ترتیب، اور مضامین کا عنوانوں سے خالی ہونا ان دونوں باتوں کی بجا شکایت لوگوں نے ضرور کی ہے۔ لیکن کن مجبوریوں سے یہ نقائص رہ گئے ہیں، اب اسے کیا بتایا جائے، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ ان

کوتاہیوں کا ازالہ کردیا جائے گا۔ خصوصاً ذیلی عنوانوں کا اندراج اصل کتاب میں اور ان ہی کے اعتبار سے مفصل فہرست کا شروع میں اضافہ بہت ضروری ہے۔ البتہ ترتیب مضامین کے متعلق تصنیفی نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی، اس میں آورد کی بدمزگی کے ساتھ آمد کا لطف جاتا رہے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو ان کے لئے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ آب پاشی کی رپورٹ، یا بنیوں کا مدواری کھاتہ ان کو بنا دیا جائے۔ ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے اسی حال میں اس کو چھوڑ دیا جائے۔ لاکھوں مرتبہ کتابوں کے ساتھ آخر کیا بگڑے گا اگر ایک غیر مرتب کتاب بھی لوگوں کے سامنے ہو۔

منجملہ دیگر اہم مقاصد کے جو اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کے پیش نظر تھے، بڑا مقصد "نظامِ تعلیم کی وحدت" کے نظریہ کو پیش کرنا تھا، خدا کا شکر ہے کہ بعض ممتاز مفکرین اور اربابِ سعی و عمل نے اسے مستحقِ توجّہ قرار دیا ہے۔ بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی نے خصوصیت کے ساتھ مختصر لفظوں میں خاکسار مصنف سے چاہا کہ "اس تعلیمی خاکے" کو مرتب کرکے ان کی خدمت میں پیش کروں۔ سید صاحب موصوف نے "معارف" ماہ جولائی ۱۹۴۵ء میں تمہیدات کے تعارفی نوٹ کے ساتھ اس خلاصے کو شائع بھی کردیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اس جلد کے ساتھ اس خلاصہ کو بھی اس کا ضمیمہ بنا دیا جائے۔ جو یہ ہے :-

---

ضمیمہ

مسلمانانِ ہند کا

نظامِ تعلیم و تربیت

(از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مشکلات ہی کا حل میری کتاب نظامِ تعلیم تربیت میں پیش کیا گیا ہے۔ جو سالہاسال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے۔ چونکہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی ہے اسلئے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ مسلمان رہتے ہوئے اور حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کی آبیاری کرتے ہوئے مسلمان کسطرح تعلیم حاصل کرسکتے ہیں میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سر دست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ جن مشکلات کے تصوّر نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے وہ کیا ہیں۔

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہوجانے کے بعد حکومت مسلّطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے قایم کیا، مشاہدہ بتارہا ہے، کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں تبدریج اسلام اور اسلامی زندگی سے بعد پیدا ہوتا چلا جارہا ہے یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے، ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں، یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا سا

تھا، لیکن وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے، ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو، وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں، اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدا نخواستہ واقع نہ ہو تو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائیگی۔

(۲) حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے، اس وقت تک تو اس تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کررہی ہے، لیکن وہ دن دور نہیں ہے، کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائیگا کہ حکومت کے منظورہ نصاب کی تعلیم لزوماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے، جسکے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اسکا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائیگا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہو کر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

(۳) مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہونچنے کے بعد کیا ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے بعد ممکن ہے، لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کریگا، تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

در اصل یہی تین باتیں ہیں، جنھیں دیکھ دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین بیچین ہیں خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر رہا ہے، تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں، یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں ان سے بحث میں طوالت ہو گی، اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب تعلیم و تربیت میں میں نے کیا ہے ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومت مسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں اس کی دوئی اور اثنینیت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے، اسی لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے

رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومتِ مسلّطہ سے قبل مسلمانانِ ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا۔ عام طور پر "درس نظامیہ" کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر و انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی ابتدا سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی۔ اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے) حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو بظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ لیکن ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ حکماً و عملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے خیرآبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ بیضاوی کا جزو نصاب تھا۔ لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی، تو مطلب کیا ہوا؟ یہی تو کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرانے کیلئے کافی سمجھا جاتا تھا ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلباء جو کچھ پڑھتے تھے فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورۂ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا یعنی علم کلام، اور علم اصول فقہ معانی و بیان وغیرہ انہی علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا جن میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس

سے متجاوز تھی۔

میں نے بزرگوں کے اسی طرزِ عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کیلئے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے، کہ غیر دینی علوم کے اس حصّہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے ان کو نکال کر عصرِ جدید کے مقبولہ علوم اور عہدِ حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے،

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی۔اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے، اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی، ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہونگے، اور مسٹر ملا، عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے "نظریۂ وحدتِ نظامِ تعلیم" کے نام سے اپنی کتاب میں میں نے پیش کیا ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں میری تجویز پر جو شبہات کئے جاتے ہیں، ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائیگا، پہلا شبہ یہ ہے، کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لئے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے، اسی کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق یہ بتایا گیا ہے، کہ اردو بولنے والی قوموں کے لئے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت

رکھتا ہے، یعنی اسی پچاسی فیصدی الفاظ اس حصے کے اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں، چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے، البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت و عہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات و مسامرت وانشاء خالص ادبی نثر و نظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے۔ لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے، جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر و اختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے، میری گفتگو صرف عام و لزومی واقفیت تک محدود ہے، درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت و مناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کیجاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت و مناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں؛

باقی تبحر و اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لئے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی، جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے، وہی طرز عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں بلکہ طبعاً اختیار کرنا چاہیے،

تیسرا شبہہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا، پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو، تو کیا ان کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا مناسب ہوگا، علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے، خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح و توضیح کے لئے ایجاد کیا تھا مثلاً اصول فقہ، کلام یا بیان و معانی و بدیع وغیرہ کا جو حال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں جواب دیا ہے۔ کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھدینا کافی ہوگا، کچھ لوگوں کا

پڑھنا پڑھانا ان کی بقاء اور ارتقاء کے لئے کافی ہے،

بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ ان کو وہی اختیاری مضامین میں شریک کرکے زندہ رکھا جائے لیکن ہر مسلمان کا میلان باقی رکھنے کے لئے خصوصاً موجودہ حالت میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لازمی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے بعد اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائے گی؟ کیا ان کا جو ماحول ہے اسی کے سمی اثرات کے ازالہ کے لئے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلا شبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے، ماحول حکومت کے نقطہ نظر کا تابع ہوتا ہے، جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر و عزت کی توقع غلط توقع ہے لیکن پھر کیا کیا جائے، کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو، اسی کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے، اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا محمد علی مرحوم ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑتا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے، ہو سکتا ہے کہ قرآن کی، پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے۔ سب کو نہیں تو بعض کو تو انشاء اللہ ضرور متاثر کرے گی اور ان بعض کا اثر انشاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان حکومت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کیلئے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کئے جائیں، اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائیگا تو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت

یہ بھی ہو سکتی ہے،

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جوامع اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پا سکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں ان میں جب جدید نصاب کو جاری کر دیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں، جدید علوم و فنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لئے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کئے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں کا کرتے ہوں، بحمد اللہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہو چکی ہے تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سر دست نہ بھی لیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل علم کا تقرر کر کے ہم خود اپنے یہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں، جو آگے چل کر خود ہمارے قدیم علوم و فنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں"

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے، اس کا بیان کرنا ہے، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیے لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہئیے، کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے، اور اسی طرح آشنا کیا جائے، کہ جیسے اس وقت کیا جاتا ہے پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے، جیسے اب تک رواج ہے، قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خط نستعلیق[1] سے بھی ان کو آشنا کیا جائے، یعنی

[1] نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے، جب تک طباعت کے لئے نسخ کے حروف کو اردو کے لئے تسلیم نہیں کیا گیا ہے اگر یہ مسئلہ طے ہو گیا تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہے گی، البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیے، انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدلی ہوئی ہے، یہی طرز عمل ہم بھی اختیار کریں گے، نسخ طباعت کے لئے اور نستعلیق کتابت کے لئے، ۱۲

اردو پڑھائی جائے، اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے، اور آئندہ اردو کو چھوڑ اکر فارسی کے آمدنامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طالب لگا دیا جائے، یہی عربی پڑھتے ہوئے بی۔ اے تک پہونچے گی اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درس نظامیہ والی کتب ثلثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی، عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا،

میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے، رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے، مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے، البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں، اگر عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا،

(۱) تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہونچانا چاہئیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطالب کے ساتھ قرآن ختم کرلیں، اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعۂ حدیث کی پڑھادی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنے معلومات حاصل کرلینا چاہئیے جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے میں کرتا چلا آرہا ہوں ان میں سے قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہئے لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے، مقصود معیار کو تعین کرنا ہے، یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث و فقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیئے، املاء کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ کتاب کے ذریعے سے زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقے کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے،

(۲) میرا خیال ہے کہ وحدتِ تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کرلیا جائے تو عربی کے عام مدارس کو مدارسِ فوقانیہ (ہائی اسکول) کی شکل میں بدل دیا جائے، جن میں دینیات کی تعلیم صرف قرآن

قرآن پڑھانے تک ختم ہو جائے گی، البتہ بعض بڑے تعلیمی مراکز ان کے تحتانی درجوں کو تو ہائی اسکول کی حیثیت دے دی جائے اور ان بڑے مراکز میں سے مختلف مرکزوں کو مختلف دینی و اسلامی علوم کی تکمیل کی تعلیم گاہ بنا دی جائے جہاں عام یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ طیلسانیوں کو دینی علوم میں سے کسی خاص علم مثلاً تفسیر یا حدیث یا فقہ یا کلام میں اعلیٰ تکمیلی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہو، ہو سکتا ہے کہ تفسیر کے لئے ندوہ کو اور حدیث کے لئے دیوبند کو مختص کر دیا جائے اور فقہ کے لئے فرنگی محل میں کوئی تکمیلی ادارہ قائم کیا جائے۔ کلام اور تصوف کے لئے اجمیر شریف میں انتظام کیا جائے، جہاں اس وقت بھی سرکار نظام کی طرف سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں جن باتوں کا اجمالاً تذکرہ مقصود تھا وہ ختم ہو چکیں، آخر میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بعضوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے اس تعلیمی مطالبے کو کیا تسلیم کرے گی؟ اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک مطالبوں کے تسلیم کرنے پر اس زمانہ میں جب حکومت کو مجبور کیا جا سکتا ہے، تو مسلمانوں کا صرف اتنا مطالبہ کہ ایسی تعلیم جو بتدریج ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی چلی جا رہی ہے، اس تعلیم میں اتنی ترمیم کر دی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے اس سیلاب کا انسداد ممکن ہو جائے، تو یقیناً کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے، جسے خواہ مخواہ حکومت مسترد کرنے پر ضد کرے گی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کو حیلہ بنا کر پیش کیا جائے۔ لیکن اس حیلہ کا جواب با آسانی دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں یہ تحریک جو ہندو لیڈروں نے پیش کی تھی، پاس ہو گئی ہے، کہ سنسکرت زبان کی تعلیم ہندو طلبہ کے لئے لازم کر دی جائے۔ گو مسلمانوں کی طرف سے کوئی بولنے والا کھڑا نہ ہوا، لیکن تعلیمی وزن کو برابر کرنے کے لئے مسلمان طلبہ پر بھی ان کی کلاسیکل زبانوں (عربی و فارسی) میں سے کسی زبان کا لینا ضروری قرار دیا گیا ہے نہ جاننے کی وجہ سے کہیئے یا خود مولویوں کی طرف سے عربی کی دشواری کی غلط شہرت، عموماً بجائے عربی کے فارسی ہی کے لینے پر طلبہ کو سُنا ہے کہ آمادہ کر رہی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے اور

جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہونچی ہے اس میں شک کی بہ ظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، تو یوں سمجھئے
کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں، حکومت اس مطالبہ کو منظور کر چکی
ہے کلاسیکل زبانوں کی تشریح و تفصیل خود ہم مسلمانوں کو اسی شکل میں کرنا چاہیے۔ جس کا ذکر
اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے، جس میں اردو و فارسی و عربی تینوں زبان کی تعلیم عربی زبان کی
تعلیم کی عملی شکل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم
بغیر کسی کش مکش کے بآسانی حل کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط
اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل
بچوں کو پڑھائی جائے۔ بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لئے ضرورت ہے، فارسی سے مناسبت پیدا کرانے کی
اور فارسی میں قوت وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے جانے
سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری
کے بعد تیسری کے پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا
ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی، اور فارسی کے بعد عربی سے طلبا کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔
یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر بے خطا نسخہ ہوگا۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض
بھی کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس و کیمیا وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے
عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی ناممکن ہے۔ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی
مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس
میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔ چاہے تو کہہ
سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان
بنا لیا جائے۔ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس جو عموماً اسوقت شہروں اور
قصبوں میں قائم ہیں، ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم و فنون کا ہائی اسکول
مسلمانوں کے لئے بنا لیا جائے۔ اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس

مدارس کو قرار دیا جائے۔

اِس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سیکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول موجود ہیں، لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صرف صفر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کر لیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس مناسبت سے اُن کی تعداد بڑھ جائے۔ کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم و فنون کی تعلیم کو قبول کر لینے کے بعد حکومت کا محکمۂ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے، ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ کہنے کو تو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے، لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہونگے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گذرے گا۔

باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہو گئی، لیکن کیا کروں ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنی بات جس پر اپنی کتاب میں میں نے کافی بحث کی ہے، اور بھی کہہ دینی چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائیگا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہو گئی ہے، روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اس کا خاتمہ نہیں ہو سکتا

آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہو رہے ہیں، لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لئے پیدا ہو جائیں کہ مذہب کے نمایندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے، بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمایندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے (لا فعل اللہ) میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا جو دیا جارہا ہے، کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے۔ اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے، کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے۔ جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہو جائیگی

یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن و حدیث سے واقف بنانا

دادن تیغے بدستے راہ زن

کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے؛ بظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیئے، تجربہ اس کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی و صحت کے نقطۂ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور اسی لئے

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا خطرہ غلط نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچکر علت کی شکل نہ اختیار

کرے۔ لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی اُلجھے ہوؤں میں سے انشاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے، اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی انشاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہرحال مذہب اور مذہبی تعلیم عمومیت سے گریز میرے نزدیک تو برہمنیت ہے، اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اسکی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو، اس سے نفع اُٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کردیں، اپنے آخری دین کی بہرحال وحفاظت فرمائیگا۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت بندی

قدیم نظامِ تعلیم پر جو اعتراضات اس زمانہ میں کیے جاتے ہیں، ان میں ایک نمایاں اعتراض یہ بھی ہے کہ جماعت بندی کا جو دستور عصری مدارس و کلیات میں ہے، یہ چیز اس وقت نہ تھی، اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہے، اتنی سخت صف آرائی جس کی پابندی آج کل کی تعلیم گاہوں میں کی جاتی ہے، اتنی سخت کہ صف سے الگ ہو کر اگر کوئی کچھ بھی پڑھنا چاہے نہیں پڑھ سکتا، بلکہ پڑھنے اور سیکھنے کے لیے ان علمی صفوف میں سے کسی نہ کسی صف میں اپنے آپ کو شریک کرنا ناگزیر ہے، میں یہ مانتا ہوں کہ اس کا رواج اس وقت نہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس فوجی صف بندی، کے اصول کو تعلیم گاہوں میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوئی؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر ایسا نہ کیا جائے اور ہر پڑھنے والے کو آزادی دی جائے کہ جس کتاب کو جس وقت چاہے، پڑھے۔ تو تنخواہ دار استادوں کی محدود جماعت سے ظاہر ہے کہ اس کا نباہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اب تو ہر اسکول میں چند اساتذہ مقرر ہیں، ہر استاد سے چند صفوف، اور جماعتوں کا تعلق ہے جسے جو کچھ پڑھنا ہے ان ہی صفوف میں گھس کر پڑھتا ہے، انفرادی طور پر ہر طالب العلم کے لیے بلکہ طلبہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے لیے کون نظم کر سکتا ہے۔

بلا شبہ اجر و مزد کے اس عہد میں اس طریقہ کے سوا اور کوئی دوسرا طریقۂ تعلیم کا ممکن بھی نہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے، ایک ہی لاٹھی سے آپ نے کل بھینسوں کو ہنکانا شروع کر دیا جو ذہین لڑکے ہیں اگر ان کو غبی لڑکوں کی رفاقت پر مجبور نہ کیا جاتا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جتنی مدت میں ایک

کتاب، پڑھائی جاتی ہو وہ چند کتابیں ختم کر لیتے، مگر ان کے دماغ کی ذاتی خصوصیتوں سے تو بحث نہیں ہی، مجبوراً جماعت کے غبی کند دماغ لڑکوں کے ساتھ ان کو بھی گھسٹنا پڑتا ہی، اور یہی نہیں دوسری طرف ان کند دماغ بچوں پر بھی ظلم ہو جاتا ہی کہ ان کو تیز رو لڑکوں کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا جاتا ہی، ہو سکتا تھا کہ ذہین بچے جس نصاب کو سال بھر میں پورا کرتے ہیں اُسے یہ بیچارے دو سال میں پورا کرتے، لیکن ان کو تو اپنے رفقاءِ درس کے ساتھ گھسٹنا ہی، عموماً صلاحیت سے زیادہ محنت کا ان پر غیر معمولی بار پڑ جاتا ہی، نیز جن لڑکوں کے ساتھ وہ چل نہیں سکتے تھے ان کے ساتھ ان کو چلانے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہی کہ امتحان میں وہ فیل ہو جاتے ہیں جس کا اثر ان کے جذبات اور حوصلوں پر پڑتا ہی، کتنے بدبخت لڑکے محض فیل ہونے کی چوٹ کھا کر ایسے زخمی ہوئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پڑھنے سے ان کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ حالانکہ اگر ان کو دوسروں کے ساتھ باندھا نہ جاتا تو اپنی صلاحیت کے مطابق اُستاد سے روزانہ سبق کی مقدار پڑھ کر آگے بڑھتے رہتے، دوسروں نے اگر اسی کتاب کو ایک سال میں ختم کیا تھا تو یہ ڈیڑھ سال میں ختم کرتے، لیکن ناکامی اور نامرادی کی اس چوٹ سے تو محفوظ رہتے، اسلامی عہد میں چونکہ بلا معاوضہ پڑھانے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہر جگہ مل جاتی تھی کہ قدرتاً مسلمانوں کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ رسّی لے کر طلبہ کی ایک خاص تعداد کو خواہ ذہناً و حافظۃً و محنتاً ان میں جتنا بھی تفاوت ہو کمر سے کمر ملا کر باندھ دیں، اور یوں آگے بڑھنے والوں کو بڑھنے سے روکا جائے یا پیچھے رہنے والوں کو زبردستی آگے بڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ چھوٹی کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ کو بڑی کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ میں اساتذہ کی کافی تعداد ہر جگہ مل جاتی تھی، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تعلیم کے خاص پیشہ ور اساتذہ کے سوا ہر شہر میں حکام و ولاۃ بلکہ دیگر خوش باش لوگوں میں بھی پڑھانے والے مل جاتے تھے، طلبہ کو اپنی دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے پوری آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے یا پیچھے رہنے کا موقعہ مل جاتا تھا، لیکن ظاہر ہی کہ اب اس نظام کو واپس لانا تقریباً ناممکن ہی، کسی قسم کی تعلیم ہو، جماعت بندی کے

بغیر تنخواہ یاب اساتذہ کی اس محدود جماعت سے استفادہ کا اب کوئی دوسرا طریقہ باقی نہیں۔ ایک
ایک کلاس میں کبھی کبھی سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو طلبہ داخل ہو جاتے ہیں۔ استاد کی نہ آواز ایسی صورت
میں سب کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے نہ اس ہنگامہ میں طالب العلم ہی استادوں سے کچھ پوچھ سکتا
ہے نہ اساتذہ طلبہ کی انفرادی توجہ کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے اسکولوں اور مدرسوں کے
فنڈ اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کم از کم اس جماعت ہی کو چند حصوں میں تقسیم کر کے مختلف اساتذہ
کے سپرد کر دیا جائے، چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جس طرح کام چل رہا ہے چلنے دو، کسی مدرسہ یا کالج میں جب
کوئی اجنبی آج داخل ہوتا ہے اور ایک ایک صف میں اسے طلبہ کی فوج در فوج نظر آتی ہے،
اس حال کا اندازہ جب پچھلے زمانہ کی اس تعلیم سے کرتا ہے جس میں عموماً ایک ایک مدرس
یا اُستاد کے پاس دس پانچ سے زیادہ طلبہ کی جماعت نہیں رہتی تھی بلکہ بسا اوقات تین چار
ہی ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے تو عصری تعلیم گاہوں کی یہ سطحی رونق آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، ناواقف
سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم کے ارتقاء کا نتیجہ ہے، حالانکہ بھیڑ یا دھسان کی یہ صورت آج طلبہ کی استعداد
کو جتنا نقصان پہنچا رہی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں پڑھنے پڑھانے کا ذاتی تجربہ
حاصل ہوا ہو۔ کتنا دردناک سماں ہے کہ جو پڑھنا چاہتے ہیں جماعت کی آہنی زنجیر ان کے
پاؤں میں پڑی ہوئی ہے اور جو پڑھ نہیں سکتے ہیں اُن کو زبردستی گھسیٹا جاتا ہے۔ ناکامی و فیل ہونے کے
کچوکوں سے بلاوجہ ان کو مجروح کیا جا رہا ہے اور ایک ہی ترازو میں آپ جب سب کو تولنا
چاہیں گے تو اسکا نتیجہ اسکے سوا اور کیا ہوگا آخر ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو جو برابر کرنا چاہیگا وہ مجبور ہے کہ اپنی
لانبی انگلیوں کو توڑے یا چھوٹی انگلیوں کی رگوں کو ڈھیلی کر کے اپنے آپ کو دکھ میں مبتلا
کرے۔ دماغوں اور ذہنوں کو جب قدرت ہی نے برابر کر کے پیدا نہیں کیا ہے تو تعلیم جس
کا بالکلیہ قاطبۃً تعلق دماغ و ذہن ہی سے ہے، سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس قدرتی تفاوت سے
آزاد ہو کر جس حد تک لوگ نفع اُٹھا سکتے ہوں نفع اُٹھانیکا انکو موقع دیا جائے، آپ نے
تو اس کو سوچا نہیں اور جن لوگوں نے اپنے امکان کی حد تک اس میں آزادی پیدا کرنے

کی کوشش کی تھی، انھی کو مطعون وملام ٹھہرایا، زیادہ دن کی بات نہیں ہی۔ مرحوم نواب صدیق حسن خاںؒ بھوپال والے مفتی صدرالدین خانصاحب سے دلّی میں پڑھتے تھے، مفتی صاحب نے ان کی خاص دماغی حالت کو دیکھ کر ان کے لیے اسباق کا الگ مستقل انتظام کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ بیان تقریبًا نواب صاحب کے اپنے قلم ہی کا قلمبند کیا ہوا ہی۔

ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانشمندی کو سبقًا سبقًا حاصل کیا تحصیل کی سند حاصل کی، کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا یہ ہیں۔

لہ ہندوستان کے ان عالموں میں جن کی کتابیں ہند کے سوا مصر و قسطنطنیہ میں بھی طبع ہوئی ہیں اُن میں نواب صاحب بھی ہیں۔ خدا نے ان کو ایک موقعہ دیا تھا جس سے علم و دین کی خدمت میں اُنھوں نے پورا پورا نفع اُٹھایا اسلامی علوم میں شاید ہی کوئی فن ہوگا جس میں نواب صاحب کی کتاب نہ ہو لیکن مجھے مصر کی ایک کتاب "اکتفاء القنوع" میں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اُس نے نواب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہی:

اصلہ من عوام الناس الا انہ توصل الی ملکۃ بھوپال فی اقلیم الدکن، فی الہند وتزوج بہا وسمی نائبا عنہا فعندما اغتنی بالمال جمع الیہ العلماء وارسل الناس فابتاع الکتب الخطیۃ من کل جہۃ وجمع مکتبۃ کبیرۃ وکلف من حولہ من العلماء بالتالیف ثم اخذ مصنفاتہم ونسبہا لنفسہ بل کان یختار الکتب القدیمۃ التی لم تکن لہا سوی النسخۃ الواحدۃ ویغیر العنوان ویبدلہ باسم اخر ویضع علی الصحیفۃ الاولی اسمہ مع القاب الفخر۔ ص ۲۵۲۔

دراصل ان کا تعلق عوام کے خاندان سے ہی لیکن کسی طرح بھوپال دکن کی ملکہ تک رسائی حاصل کی اور اُن سے شادی کر لی اور اُن کی طرف سے نائب بن بیٹھے، پھر جب دولتمند ہو گئے، تب علماء کو اپنے اردگرد جمع کیا اور لوگوں کو کتابوں کے خریدنے کے لیے ادھر اُدھر دنیا کے مختلف حصّوں میں روانہ کیا جو ہاتھ کی لکھی ہوئی قلمی کتابیں فراہم کر کے ان تک پہنچاتے تھے، اس ذریعہ سے ایک بڑا عظیم کتب خانہ اس شخص نے جمع کر لیا۔ اور اپنے دربار کے علماء کو حکم دیا کہ کتابیں تصنیف کریں۔ پھر انہی کی تصنیف کردہ کتابوں کو اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے بلکہ ایسی قلمی کتابیں جن کا دنیا میں ایک ہی نسخہ تھا اُس کا نام اور ابتداء کا دیباچہ بدل کر لوح کتاب پر اپنا نام القاب فاخرہ کے ساتھ درج کر دیتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب مرحوم کے متعلق اس قسم کی باتیں ہندوستانی مولویوں میں بھی مشہور رہیں۔ اور غالبًا کسی ہندی مولوی ہی سے مصر کے اس عیسائی عالم کو اس کا سُراغ ملا لیکن خود نواب کے ملنے والوں سے جہاں تک میں نے سُنا ہی عقیدتًا وشغلًا ان کی حالت جیسی کچھ ہو، لیکن علم کی سب تعریف کرتے ہیں۔"

مختصر معانی[1]، تا آخر عبادات شرح وقایہ[2]، معاملات ہدایہ[3]، اوائل توضیح[4] وتلویح[5] اصول فقہ میں، سلّم[6] مع ملا حسن[7]، و حمد اللہ[8] و قاضی[9] مبارک منطق میں، میبذی[10] تمام و قدیمے شمس[11] بازغہ و صدرا[12] مایعم الاجسام تک، میر زاہد[13]، ملا جلال تا بحث ولالت میر زاہد[14] شرح مواقف تا بحث وجود، میر زاہد رسالہ[15] تا مذہب منصور، صحیح بخاری[16] کے تین جز سماعًا اول[17] تفسیر بیضاوی قراءۃً، دیوان متنبی[18] نصف اول، بعض[19] دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ[20] مقالۂ اول اقلیدس[21]، قطبی[22] مع میر شرح[23] عقائد نسفی تمام، حاشیہ[24] بحر العلوم بر میر زاہد، مقامات[25] حریری و ہندی چند مقالات شرح مطالع[26] سماعًا، ص ۲۴۶ -

ایک سال آٹھ مہینے کی مدت خیال کیجیے، اور چھبیس[26] کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجیے آج کوئی باور کر سکتا ہے، کہ نصاب نظامیہ کی یہ اعلیٰ سخت دشوار کتابیں ایک شخص نے ڈیڑھ سال دو مہینے میں پوری کر لیں، بلا شبہ جماعت کی پابندیوں کے ساتھ اس کا تصور دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے، لیکن جس قسم کی آزادی مفتی صاحب نے نواب صاحب کو عطا کی تھی اور خدا نے جیسی طبیعت ان کو ارزانی فرمائی تھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو بات سوچی نہیں جا سکتی ہے وہ وقوع پذیر ہوتی تھی۔ حضرت قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی کی زبانی بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ "ہم نے مختلف علوم و فنون کی انتہائی کتابیں قریبًا پونے تین سال میں تمام کی تمام پڑھ لی تھیں[1]"

کسی موقعہ پر مولانا انوار اللہ خاں نواب فضیلت جنگ اُستاذ سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ، کی ایک روایت طریقۂ مطالعہ کی گذری ہے۔ مولانا نے آخر میں اس کی وجہ کہ کتابیں جلد کیوں ختم ہوتی تھیں یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ طریقۂ مطالعہ کی وجہ سے سبق کا زیادہ حصہ چونکہ طلبہ کے لیے سمجھا سمجھایا رہتا تھا بجز چند شکوک و شبہات کے ازالہ کے، اُستاذ کو کچھ کہنا نہ پڑتا تھا، اس لیے سبق کی مقدار زیادہ ہوتی، روزانہ صفحات کے صفحات ہو جاتے تھے۔

ایک ہی کتاب کا متعدد مقامات سے پڑھنا

جماعت کی قید و بند سے جس زمانہ میں علم و تعلیم آزاد تھا طلبہ کو اس کا بھی موقع دیا جاتا تھا کہ چاہیں تو ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیں مولانا آزاد

[1] صفحہ ۳۳ تذکرۂ رحمانیہ۔

ہی نے اپنی تحصیل کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر طفیل محمد سے وہ اور ان کے خالہ زاد بھائی ساتھ پڑھا کرتے۔

طریق تحصیل چنیں بود کہ پیوستہ (مسلسل) دو کتاب یا کتاب بے واحد را از دو مقام بہ سماعت و قرات یک دگر می خواندم"

گویا کل دو آدمی ایک جماعت میں تھے، باری باری سے سبق ایک دن ایک پڑھتا اور دوسرا سنتا، دوسرے دن پڑھنے والا سنتا اور سننے والا پڑھتا، یوں استاد کو پورا موقع ان کی خواندگی کی اصلاح کا ملتا تھا خصوصاً عربی زبان میں تو اس کی شدید ضرورت اعراب اور حرکات کی وجہ سے ہے مگر ظاہر ہے کہ اتنی توجہ سے اُستاد چند ہی طالب العلموں کو پڑھا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کا یہ فرمانا کہ ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے شروع کر دیتے تھے، اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے واقعہ یہ ہے کہ کتابوں یا علوم کی دو قسمیں ہیں، بعض علوم تو ایسے ہیں کہ جب تک ان کے اول کو نہ پڑھا جائے آخر سمجھ میں نہیں آسکتا مثلاً اقلیدس کا جو حال ہے، مگر علم کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ اوّل کو آخر کے بغیر اور آخر کو اول کے بغیر پڑھ سکتے ہیں، مثلاً فقہ کے ابواب کا جو حال ہے آپ معاملات کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، خواہ نماز اور صلوٰۃ کے مسائل آپ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں، یہی حال نماز یا روزہ کے مسائل کا ہے کہ کسی کو مساقاۃ یا مضاربت کے مسائل نہ معلوم ہوں، تو اس سے نماز و روزہ کے مسائل کے سمجھنے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے، میرے نزدیک تو اس طریقہ سے کامل ایک کتاب کا پڑھانا ان چند کتابوں کے پڑھانے سے بہتر ہے، جن کی تھوڑی مقدار تا نصاب پڑھا کر چھوڑ دی جاتی ہیں، اور اس کا اچھا طریقہ یہی ہے کہ بجائے دو کتابوں کے ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھایا جائے لیکن یہ ساری آزادیاں آزاد درس ہی میں برتی جاسکتی ہیں، جماعت بندی کی گھسیٹ میں نہ تو یہ ممکن ہے نہ وہ بلکہ جو چل رہا ہے وہی ٹھیک ہے۔

قلیل عرصہ میں زیادہ پڑھنے کا موقع ذہین طالب العلموں کو ایک تو اسی لیے مل جاتا تھا کہ ان کو اونٹ کے گلے میں لٹکا نہیں دیا جاتا تھا، ہرن کو اپنی چال سے اونٹ کو اپنی چال

سے چلنے کی آزادی تھی، ممکن ہے کہ کچھ اس کو بھی دخل ہو جو مولانا آزاد کے بیان سے ثابت ہوتا ہے یعنی ایک ہی کتاب کو دو جگہ سے پڑھنا، اور سب سے بڑی قیمتی بات وہ نسبت تھی

اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلقات

جو اس زمانہ میں اساتذہ اور طلبہ میں قائم ہو جاتی تھی ایسے اساتذہ جو بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا کرتے تھے، ان کی طرف سے طلبہ کے قلوب میں ممنونیت کے جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن معاوضہ والے استادوں کی بھی شفقت و مہربانی طلبہ کے حال پر جتنی رہتی تھی دکھ درد میں جس طرح کام آتے تھے، بتدریج یہی چیزیں تعلقات کو بڑھاتے ہوئے ایک ایسی حد پر پہنچا دیتی تھیں کہ شاگردوں کا تعلق استادوں سے کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ شاید ماں باپ کے ساتھ بچوں کو اتنا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اب آپ خود ہی خیال کیجیے استاد کا جب یہ حال ہو، مثلاً اکبری عہد کے ایک عالم جو طبیب بھی تھے اس لیے حکیم الملک گیلانی کے نام سے مشہور تھے، اصلی نام شمس الدین تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے، کہ ملازم تو دربار کے تھے، اکبر کے خصوصی معالجوں میں یہ بھی داخل تھے لیکن

"پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نخوردے" (ص ۱۰۱، تذکرہ علماء ہند)

تنخواہ بصیغۂ طبابت مل رہی ہے، ایک حرف بھی نہ پڑھاتے تو ان کی تنخواہ میں پیسے کی کمی نہیں ہو سکتی تھی، نہ پڑھانے سے اضافہ لیکن تعلیم کے لیے معاوضہ کی ضرورت اس زمانہ کا سوال ہی نہ تھا، اور اسی کے ساتھ طلبہ کو اپنے گھر سے کھانا بھی دینا، ان کا اتنا خیال کہ جب تک سب طالب العلم جمع نہیں ہو لیتے، خود بھی وہ کھانا نہیں کھاتے، سوچا جا سکتا ہے کہ ایسے استادوں کا قدرتاً تلامذہ کے قلوب پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خود ہمارے استاد مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کا قریب قریب یہی معاملہ تھا، وہ بھی تنخواہ طبابت کی راہ سے پاتے تھے لیکن عمر بھر پڑھاتے رہے، اور دس بیس طالب العلموں کو کھانا دے کر پڑھاتے رہے، اس راہ میں وقت کی، مال کی، دل کی، دماغ کی جو قربانیاں حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کرنی پڑیں ان سے وہ یا ان کا خدا ہی واقف ہے۔ لیکن

اس کا اثر کیا تھا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی طالبِ علم حضرت سے رخصت ہوا ہو اور بچوں کی طرح بلبلا کر رو نہ پڑا ہو، دوسروں کا حال کیا بیان کروں خود راقم الحروف کا حال بھی یہی تھا، اور اب بھی حضرت والا کی پدرانہ شفقتوں کا جب خیال آتا ہی دل تڑپ اُٹھتا ہی۔ بیتے ہوئے دن زندگی کے سامنے آجاتے ہیں[1]۔

کوئی یقین کر سکتا ہی، اس قصہ کا جس کے راوی مولانا آزاد بلگرامی ہیں، استاذ و شاگرد کے تعلقات کہاں تک پہنچے ہوئے تھے، ملّا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے پہلے بھی گذر چکا ہی، ان کے حالات میں مولانا رقمطراز ہیں کہ ملّا محمود کی وفات بالکل جوانی میں ہوئی، ان کے استاد مولانا محمد افضل جنہیں شاہ جہاں کے دربار سے استاذ الملک کا خطاب تھا، اُس وقت زندہ تھے سُنئے اُستاذ کو خبر ملتی ہی کہ شاگرد مرگیا۔

"تا چہل روز استاذ را کسے بہ تبسم ندید و بعد چہل روز استاد بہ شاگرد ملحق شد شخصے این مصرعہ تاریخ یافت : زمحمود و افضل بگو آہ آہ!"

اور یہ تو خیر دو ڈھائی سو سال کی بات ہی، تیرہویں صدی کے ایک عالم مولانا احمد الدین صاحب بگوی المولود ۱۲۱۷ھ لاہور میں درس دیتے تھے، حضرت شاہ اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے، صاحب حدائق حنفیہ نے لکھا ہی کہ مولانا احمد الدین اور اُن کے بھائی[2] سے

---

[1] بے ساختہ یہاں اس واقعہ کے ذکر پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، حضرت حکیم صاحب بعض خاص پیچیدگیوں کی وجہ سے چند دنوں مالی دشواریوں میں مبتلا ہوگئے، لیکن ایک اندرونی واقعہ تھا جس کی دوسروں کو خبر نہ تھی مصارف اپنے حال پر جاری تھے، طلبہ کی جتنی تعداد پہلے کھانا کھاتی تھی اندر سے اُن کے لیے ہمیشہ کھانا آتا رہا۔ ایک دن حضرت کی اہلیہ محترمہ کو بالآخر ان ہی طلبہ کے لیے یہ کرنا پڑا کہ سونے کے کنگن اُنہوں نے اپنے ایک معتمد طالب العلم کے حوالہ کیے، بازار سے بیچ کر یا گرو رکھ کر ان کے روپے سے گیہوں اور گھی خرید کر لادے کہ طالب العلموں کے کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا کنگن فروخت کیے گئے۔ اور ان طالب العلموں کو کھلا دیے گئے، جن کی طرف سے دنیا میں حکیم صاحب یا ان کے اہل خانداں کو ایک حبہ کا نفع نہ اس وقت پہنچتا تھا اور نہ اب پہنچ رہا ہی۔ اب قربانیوں کی ان مثالوں کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہی، لیکن انشاء اللہ یہی نیکیاں حضرت والا کو اب کام آ رہی ہونگی، اور خدا سے اُمید ہی کہ ان کے پوتوں کے لیے آبا ؤ کا یہ صلاح باعث فلاح بن جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ [2] (بر صفحہ ۱۰)

جس قدر انتشار علم منقول و معقول پنجاب میں ان ہر دو بھائیوں سے ہوا کسی دوسرے سے نہیں ہوا[1] ہزارہا آدمی صرف بھائی سے لے کر ان سے فارغ التحصیل ہوئے گویا پنجاب میں کوئی صاحب علم ان کی شاگردی سے بے بہرہ نہ ہوگا، کوئی بالذات کوئی بالواسطہ ان کے تلامذہ میں منتسب ہوگا (ہم)

بہر حال مولانا احمد الدین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

حالت صحت و بیماری میں طالب العلموں کو سبق پڑھاتے رہتے تھے، طالب العلموں میں اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے دیتے" (حدائق ص ۴۸۷)

ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنے ایک ہم وطن عالم اُستاد مولانا عبداللہ بداؤنی کے متعلق یہ لکھ کر

"سالہا در بداؤں درس و افادہ فرمودہ خیلے از دانش مندان نامی کہ بہ مرتبہ اشتہار رسیدہ اند، از دامن او برخاستند و مردم اکناف و اطراف، از اقصی ولایات بہ ملازمت تشریفش رسیدہ بہ سعادت جاودانی می رسیدند"

خود ملا عبدالقادر صاحب نے بھی شرح صحائف اور تحقیق در اصول ان ہی سے پڑھی تھی ملا صاحب نے اپنا تجربہ ان کے علم کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ

جمعے از مسترشدان فیاض و متعلمان صافی قریحہ شریک بودند و اشکالات دقیق می آوردند ہرگز ندیدم او را کہ در افادہ و افاضہ و حل آں ابحاث شریفہ و نکات غامضہ احتیاج بہ مطالعہ افتادہ باشد (ص ۵۶ ج ۳)

جس سے اس زمانہ کے طریقہ درس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ درس کے اس طریقہ سے ایک طرف طلبہ کی استعداد کا امتحان ہوتا رہتا تھا، اور دوسری طرف اُستادوں کی قابلیت کا بھی پتہ چلتا تھا، جسے عصری طریقہ تعلیم نے بالکل اندھیرے میں ڈال دیا ہے، اس

(حاشیہ صفحہ ۶) [1] ان کا نام مولانا غلام محیی الدین بگوی تھا، "بگا" پنجاب کے کسی گاؤں کا نام ہے۔ یہ بھی شاہ اسحٰق ہی کے فیض یافتوں میں ہیں لکھا ہے کہ لاہور میں لال کی مسجد میں تیس سال تک درس دیتے رہے۔ آخر میں فالج کا جب اثر ہوا تو بگا اپنے گاؤں چلے گئے جہاں تیرہ چودہ سال تک اسی بیماری کی حالت میں درس دیتے رہے شاہی مسجد لاہور کے مشہور مدرس، مولانا غلام محمد (جو بیک واسطہ خاکسار کے بھی استاذ ہیں، یعنی میرے اُستاذ مولانا محمد اشرف مٹانی جن سے ادب و ریاضی کی کتابیں فقیر نے پڑھی ہیں) ان ہی کے شاگرد تھے۔ فالحمد للہ۔

گونگے درس میں عالم و جاہل ہر قسم کے اُستادوں کی کھپت بآسانی ہو رہی ہے، لیکن جس زمانہ میں اُستادوں سے طلبہ کو "اشکالات دقیق" اور "ابحاث شریفہ" و "نکات غامضہ" کے دریافت کرنے اور ان پر اُستادوں سے بحث کرنے کا حق حاصل تھا، ناکاروں کی گنجائش حلقۂ تدریس میں ناممکن تھی۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی اس کے متعلق کافی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اس وقت مجھے انہی میاں عبداللہ بداؤنی کے متعلق ملّا عبدالقادر کی یہ شہادت پیش کرنی ہے کہ میاں صاحب کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

ازپے ابتیاع متاع خانہ خواہ قلیل باشد یا خواہ	اپنے گھر کے لیے سودا خواہ زیادہ ہو یا کم اور تمام دوسری[1]
کثیر وسائر مصالح ضروری مایحتاج الیہ پیادہ	ضرورت کی چیزیں میاں صاحب پیادہ پا دکان
بدکان و بازار تشریف می برد و برداشتہ بمنزل	اور بازار سے جاکر لاتے اور خود اپنے اوپر لاد کر
می آورد۔[1]	ان کو گھر پہنچاتے۔

ملّا صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

درمیان راہ جماعۂ طلبہ راسبق نیز می فرمود و ہر چند می گویند کہ حاجت تصدیع مخدومی نیست ما ایں خدمت را بجا می آریم، قبول ندارد" (ص ۵٦ ج ۳)

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی حضرت استاذ مفتی عزیزالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو خاکسار نے دیکھا تھا، ان کا بھی یہی حال تھا، حالانکہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسہ کے سب سے بڑے مفتی تھے اور اسی لیے اخباروں میں عموماً ان کے زمانہ میں لوگ ان کو مفتی اعظم کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن آخر عمر تک ان کو اسی حال میں دیکھا گیا کہ عصر کی نماز کے بعد نہ صرف اپنے گھر کا سودا سلف بلکہ محلے ٹولے کی بوڑھی بیوہ عورتوں کی فرمائشوں کو بازار سے خرید کر ان کے گھر پہنچانا ایک ضروری کام کی حیثیت سے انجام دیتے تھے۔ ملّا عبدالقادر نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میاں عبداللہ کا یہ طریقہ نیا نہ تھا بلکہ یہ "روش سلف و خلف" کی یہ پیروی تھی، خدا کا شکر ہے کہ ان آنکھوں نے بھی خلف میں ایسی ہستیوں کو دیکھا تھا۔ ریاست ٹونک میں اسلامی ریاست کی ایک شان اب تک یہ باقی ہے کہ شریعت کا محکمہ وہاں قائم ہے جس میں ناظم محکمہ شریعت کے سوا چند مفتی بھی ریاست سے مقرر ہیں، ان مفتیوں میں ایک بزرگ مولانا نورالحق قدس سرہ بھی تھے، خاکسار نے چند رفقاء کے ساتھ ان سے مشکوٰۃ اور جلالین کے چند اجزاء پڑھے تھے، مولانا نورالحق باوجود مفتی شریعت ہونے کے بازار سے بھاجی دال گھی الغرض خانگی سودا گھر کا خود خرید کر لاتے ساری زندگی اسی طریقہ سے گذاری ۱۲

اور یہ تھا طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا تعلق، طلبہ اصرار کر رہے ہیں کہ مجھے دیجیے ان چیزوں کو گھر تک پہنچا آتا ہوں، لیکن پیٹھ پر گٹھری لدی ہوئی ہے، سبق ہو رہا ہے، اور طلبہ کو تکلیف دینا نہیں چاہتے۔

اِس سلسلہ کا ایک دلچسپ عبرت آموز واقعہ حضرت جناب مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کا ذکر ابھی گذرا ہے، قاری صاحب کے سعادتمند حفید رشید جناب قاری عبدالحلیم صاحب معلم حالی ہائی اسکول پانی پت نے قاری صاحب کی جو سوانح عمری تذکرہ رحمانیہ کے نام سے مرتب کی ہے اسی میں اس قصہ کو شیخ محمد ابراہیم حسن صاحب کی ایک کتاب منظوم "دُرۂ مرتشی" سے بایں الفاظ درج فرمایا ہے:-

"میں (یعنی شیخ محمد ابراہیم) حضرت کے پاس بیٹھا تھا، آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادم خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوایا جائے کسی مستفید شاگرد نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا "لائیے یہ خط میں ڈال آؤں" اور بیحد اصرار کیا حضرت نے فرمایا، میں تم سے یہ کام لینا نہیں چاہتا، کیوں کہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے، میرا حق اُستادی سمجھ کر یہ خط ڈاک میں ڈالوگے، میرے نزدیک یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے، اس کے بعد لوجہ اللہ تعلیم کا خلوص باقی نہ رہیگا، لہذا میں تم سے یہ معمولی کام لے کر اپنا ثواب کیوں ضائع کروں" ص ۱۹۹

یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے، قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور مدرسین میں تھا، حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی استاذ الکل کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ علماء کا ایک طبقہ آپ کے حلقہ درس سے اٹھا، مولانا حالی صاحب کا ذکر تو گذر ہی چکا، صحاح ستہ کی کل کتابیں مولانا حالی نے قاری صاحب ہی سے پڑھی تھیں، ان کا ایک مستقل معرکۃ الآراء مقالہ بھی قاری صاحب کے خصوصیات وحالات پر چھپ چکا ہے، ان کے سوا پیر جماعت علی شاہ، مولانا گل حسن مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی اور بیسیوں علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی، بلکہ جن لوگوں نے قاری صاحب سے استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن ؒ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی جیسے اکابر ملت کے اسماء گرامی

بھی ہیں، سوچنے کی بات ہو کہ جس کی ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری، اس نے اپنے اس التزام کو کہ کسی شاگرد سے کسی قسم کا کوئی ذاتی کام اپنا نہ لونگا، اور اس کو آخر وقت تک نباہ دینا کیا عزم و ارادہ کی معمولی قوت کی دلیل ہو؟

شاگردوں سے کام لینے کو بھی رشوت قرار دیتے کا غالباً مطلب وہی ہو جس کا پتہ ان ہی کے ایک دوسرے طرز عمل سے چلتا ہو اسی کتاب میں قاری عبد الحلیم صاحب نے حضرت کا ایک اور قصہ نقل کیا ہو، خلاصہ یہ ہو کہ آپ سے ایک شیعی عالم کسی خاص فن کی کتاب پڑھا کرتے تھے، مضمون سے ان کو چونکہ زیادہ دلچسپی تھی اس لیے چاہا کہ وقت ذرا زیادہ دیا جائے لیکن حضرت قاری صاحب عدم گنجائش کی وجہ سے راضی نہ ہوئے، ان شیعہ صاحب کو خیال ہوا کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے غالباً یہ بے اعتنائی برتی گئی، یہی خیال کر کے انھوں نے عرض کیا کہ "اگر میں شیعیت ترک کر دوں اور سنّی ہو جاؤں تو پھر تو آپ پوری توجہ کے ساتھ وقت دینگے" حضرت نے ان کی زبان سے یہ سُن کر فرمایا "تم مذہب تبدیل کرو یا نہ کرو میری توجہ علم کے لیے ویسی ہی رہیگی اس میں بال برابر فرق نہیں آسکتا" (تذکرۂ رحمانیہ ص ۱۹۲)

گویا تبدیل مذہب کی رشوت دے کر قاری صاحب کی توجہ کو ذرا زیادتی کے ساتھ اپنی طرف وہ مائل کرانا چاہتے تھے، خدمت لینے میں ان کو غالباً یہی خیال ہوتا ہوگا کہ خدمت کی رشوت دے کر بہ نسبت دوسرے طالب العلموں کے بعض لوگ استاد کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں، اور وہ شاگردوں میں اس فرق کو روا نہ رکھتے تھے۔

مذکورہ واقعہ سے اس تعلیمی بے تعصبی کا بھی آپ کو اندازہ ہوا ہوگا، جو ان بزرگوں میں عموماً پایا جاتا تھا، شاگردوں کا مقام اساتذہ کے قلوب میں کہاں پر تھا، تذکرہ غوثیہ جو حضرت شاہ غوث علی بہاری وطناً و پانی پتی نزیلاً کے حالات میں ایک دل چسپ کتاب ہو اس میں ایک قصہ مولانا فضل امام خیر آبادی کا درج ہو، غالباً شاہ غوث علی صاحب کے سامنے کا واقعہ ہو خلاصہ یہ ہو کہ مولانا فضل حق خیر آبادی جو مولانا فضل امام کے صاحبزادے ہیں، جوان تھے، اور

اپنے والد کے ساتھ خود بھی دلّی میں درس دیتے تھے، جہاں مولانا فضل امام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے، ایک طالب العلم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا، اُنہوں نے مولوی فضلِ حق صاحب کے پاس اُس کو بھیج دیا کہ مجھے فرصت نہیں ہے تم ہی پڑھا دیا کرو۔ یہ طالب العلم بیچارا کچھ غبی تھا، مولوی فضل حق صاحب کی جوانی کا زمانہ چند اسباق کے بعد ان کا جی اُکتا گیا۔ ایک دن پڑھاتے ہوئے کتاب پھینک دی اور بُرا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ طالب العلم مولانا فضل امام کے پاس پہنچا، اور حال بیان کیا۔ یہی سُننے کی بات ہے، مولانا فضل امام آپے سے باہر ہو گئے۔ مولوی فضل حق کو اسی وقت طلب کیا۔ طلبی کا فقرہ تھا "بلاؤ اس خبیث کو" جوان عالم بیٹا ہے لیکن ایک طالب العلم کی تحقیر کی ہے۔ مولوی فضلِ حق سامنے آتے ہیں، لکھا ہے کہ بے تحاشا ایک تھپڑ مولوی فضل امام نے رسید کیا، پگڑی دور جا پڑی، اور فرماتے جاتے تھے، تو طلبہ کی قدر کیا جانے بسم اللہ کے گنبد میں پلا ہے، خبردار! میرے طالب العلموں کو اگر کبھی کچھ کہا۔

بہر حال میں تو اساتذہ اور تلامذہ کے باہمی تعلقات کی مثالیں پیش کر رہا تھا، ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، شیخ منصور لاہوری اکبری دربار کے امراء میں تھے ایک زمانہ تک مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے، پھر پنجاب کے علاقہ بجواڑہ اور حدود دامن کوہ کے ضبط و ربط کی خدمت ان ہی کے سپرد ہوئی، یوں ہی وہ مختلف عہدوں اور مناصب پر سرفراز ہوتے رہے، بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ علاوہ امیر کبیر ہونے کے علم میں بھی ان کا پایہ غیر معمولی تھا، ملا عبد القادر نے لکھا ہے۔

"در ہمہ علوم عقلی کہ در ہندستان متعارف ست مستحضر و خوش طبع و سلیم الفہم و منصرف و با امراء و ملوک صحبت بسیار داشت"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری خدمات کی مشغولیت کی وجہ سے درس تدریس میں زیادہ حصہ نہ لے سکے، مگر ان کے صاحبزادے ملا علاء الدین کا رنگ دوسرا تھا، ملا عبد القادر ہی نے لکھا ہے کہ اکبر نے "ہر چند کہ تکلیف سپاہی گری نمودند قبول نہ کردہ بدرس و افادہ مشغول شد"

چاہتے تو کوئی ہزاری منصب فوج رکھنے کے صلے میں ان کو بھی مل جاتا، لیکن جو موروثی جاگیر والد سے ملی تھی، اُسی پر قناعت کر کے ساری عمر پڑھنے پڑھانے ہی میں گذار دی، طلبہ کے ساتھ ان کا جو سلوک تھا، اور اسی کو مجھے پیش کرنا ہے، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے "وہرچہ از جاگیر حاصل می شد ہمہ صرف طلبہ بود" (ص ۱۵۶)

اگرچہ اس زمانہ کا یہ عام دستور تھا کہ ارباب ثروت و دولت میں، جو بھی درس تدریس کا کام کرتا تھا، اپنی، اپنی حیثیت کے مطابق علاوہ پڑھانے کے طلبہ کی خدمت طعاماً وقیاماً اپنی اپنی استطاعت کی حد تک کیا کرتا تھا، لیکن ملا علاء الدین کا دسترخوان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں غیر معمولی وسیع تھا، ملّا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

از جملہ فلایاں در ہند بعد از پیر محمد خاں[1] چوں او (ملا علاء الدین) و ملّا نور محمد ترخان ہیچکس دیگر ببذل و کرم و نثار و ایثار ضرب المثل نہ شد"

بانی مدرسہ نظامیہ ملا نظام الدین فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف رشید مولانا عبدالعلی المخاطب بہ بحر العلوم کے متعلق لکھا ہے کہ

"منشی صدر الدین بہاری و برا برائے تدریس مدرسہ خود کہ در بہار[2] بنا کردہ بود خرج معتد بہ فرستادہ طلبید" جس وقت مولانا کو طلب کیا گیا ہے، اُس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھے، منشی صدر الدین نے چار سو

---

[1] افسوس ہے کہ پیر محمد اور ملّا نور محمد ترخاں کے تفصیلی حالات نہ مل سکے ملا عبدالقادر کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر یعنی ملا پیر محمد شیروانی الاصل تھے ابتداءً بیرم خاں کے متوسلوں میں تھے۔ بعد کو ناصر الملک کا خطاب شاہی دربار سے ملا، نربدا میں ڈوب کر مر گئے، دینی حالت ان کی کچھ اچھی نہ تھی، ملا نور محمد کے متعلق بھی اتنا لکھا ہے کہ "جامع اقسام علوم حکمت و کلام بود" ہمایوں کے مقبرہ کے آخر میں متولی تھے شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۲

[2] یہ عبارت میں نے تذکرۂ علماء ہند سے نقل کی ہے لیکن مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "ہندوستان کے اسلامی مدارس" میں بجائے بہار کے بردوان لکھا ہے۔ واللہ اعلم کیا واقعہ ہے، میں نے خود واقعہ کی تحقیق نہیں کی ہے، ممکن ہے کہ بردوان کو بہار کے قرب کی وجہ سے بہار میں داخل کر لیا گیا ہو، ورنہ اب اس وقت تو وہ صوبہ بنگال کے مغربی حصہ کا ایک ضلع ہے۔

ماہوار تنخواہ آپ کی اور آپ کے ایک فرنگی محلی عزیز مولوی ازہار الحق کی تنخواہ مقرر کی تھی، لیکن مولانا نے لکھ بھیجا کہ میرے ساتھ طلبہ بھی ہونگے، جن کی تعداد سو سے کم نہ ہو گی اگر ان کے قیام و طعام کا نظم کر سکتے ہو تو میں آسکتا ہوں" اعضان اربعہ" جو فرنگی محل کے علماء کی تاریخ ہے اس میں لکھا ہے کہ منشی صدرالدین نے جب تک باضابطہ معاہدہ کی شکل میں ان طلبہ کے مصارف کی ذمہ داری اپنے سر نہ لی، مولانا اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں، حالانکہ ان دنوں سخت معاشی دشواریوں میں مبتلا تھے۔

اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان تعلقات کی یہ نوعیت روایات موروثی کی شکل میں منتقل ہوتی ہوئی اس وقت تک آئی تھی، آخری آدمی جس کا حال اس باب میں مجھے معلوم ہوا وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار مرحوم تھے، ایک زمانہ تک ان کا قیام الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں رہا بعض واقعات پیش آئے کہ الہ آباد سے منتقل ہو کر آپ اپنے وطن صوبہ بہار چلے آئے، اور گیا کو مستقر قرار دیا۔ طلبہ کا بھی ایک بڑا مجمع آپ کے ساتھ مدرسہ سبحانیہ چھوڑ کر گیا پہنچ گیا۔ بے سروسامانی کے حال میں آئے تھے، کوئی انتظام معقول شروع میں نہ ہو سکا، مولانا عبدالصمد رحمانی جو ان ہی طالب العلموں میں تھے ان کی سوانح عمری میں اپنی عینی شہادت یہ نقل کرتے ہیں۔

"یہاں (گیا) پہنچ کر سب سے اہم مسئلہ طعام کا تھا جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا، سب ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا، اس کو سرخ مرچ کے بھرتے کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اس میں نمک ملا لیا جاتا تھا، مولانا ایک دسترخوان پر بلا تکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا کھا لیتے تھے، اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی۔" (حیات سجاد)

حالانکہ ذاتی طور پر مولانا کی ایسی گئی گذری حالت نہ تھی، جائداد و زمین کے مالک تھے، اپنی ذات کی حد تک چاہتے تو خواہ مخواہ اس قسم کے کھانے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پاتے لیکن اتنی حیثیت بھی

نہ تھی کہ روزانہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع کو اپنی جیب سے کھلا سکتے ہوں، محض طلبہ کی خاطر سے جب تک یہ حال رہا سب کے ساتھ مولانا کی بھی یہی غذا رہی[1]۔

اب ایک طرف اساتذہ کے ان عجیب و غریب تعلقات کو پیشِ نظر رکھیے، جو اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے ساتھ رکھتے تھے، اور دوسری طرف اس بے پناہ جذبۂ شوق و جستجو کو سامنے رکھیے جو نسلاً بعد نسلٍ بطور موروثی روایات کے اسلامی خاندانوں میں طلبِ علم کے متعلق منتقل ہوتا چلا آتا تھا، کہ آج ان قصوں کو افسانہ سے شاید زیادہ وقعت نہ دی جائے، لیکن کیا کیجیے کہ واقعات یہی تھے، مولانا غلام علی آزاد نے بعض واقعات اس سلسلہ میں نقل کیے ہیں مثلاً مولانا سید محمود اصغر کے حالات میں لکھتے ہیں۔

بہ ارادہ تحصیل علم قنوج رفت و نزد علما، آنجا کتب درسی گذرانید و کمال استعداد بہم رساند

---

[1] طلبہ اور اساتذہ میں کس قسم کے انبساطی تعلقات تھے اس کی ایک مثال وہ بات بھی ہو سکتی ہے جو ملا عبد النبی احمد نگری نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ میرا دستور تھا۔ "در ایام تعطیل با طلبائے یک دل و یک رو بہ جہت شکار ماہی دراں باغ اتفاق سیر و تفرج می شد ص۲۶" اس باغ سے اشارہ احمد نظام شاہ بحری کے ایک باغ کی طرف ہے جس کا نام فیض بخش تھا، باغ کے بیچ میں ایک عظیم ساگر بنایا گیا تھا، اور اسی ساگر کے بیچوں بیچ میں عمارت پختہ دو منزلہ بادشاہ نے بنوائی تھی، چاروں طرف پانی اور بیچ میں اس شاہی قصر کا ہونا جو دل کشی پیدا کر سکتا ہے ظاہر ہے۔ ملا عبد النبی اسی تالاب میں طلبہ کے ساتھ شکار ماہی کے لیے آتے تھے۔ اسی قسم کی ایک نظیر استاذ السلطان نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کی سوانح عمری میں درج ہے، لکھا ہے کہ مولانا کو مدرسہ نظامیہ (جو ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا خدا کے فضل سے اب تک موجود ہے اسی مدرسہ نظامیہ) کے طلبہ سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ سال میں دو تین مرتبہ تمام طلبہ کو کسی باغ یا تفریح گاہ میں لے جاتے، دو تین روز قیام فرماتے وہاں ان سے تقریریں، مناظرے بیت بازی کے مقابلے کراتے، طلبہ جب اس سے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ان کو کھیلنے کی اجازت دیتے (ص۸۵) یہاں اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ طلبہ کے ساتھ مولانا مرحوم کے انبساطی تعلقات کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب مولانا مرحوم نواب فضیلت جنگ کے خطاب شاہی کے ساتھ حکومت آصفیہ کے وزیر مذہب یعنی صدر المہام امور مذہبی تھے۔ بلکہ اپنے ذاتی اثر و اقتدار کے لحاظ سے تو کہا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم وقت سے بھی ان کا درجہ بلند و رفیع تھا، لیکن عز و جاہ کے ان مدارج عالیہ پر پہنچ جانے کے بعد بھی علم کی جو عظمت قلبِ مبارک میں تھی اُس نے طلبۂ علم سے زندگی بھر ان کو باندھے رکھا حتیٰ کہ ان ہی طالب العلموں کے درمیان مدرسہ نظامیہ ہی کے صحن میں مدفون ہیں۔ طاب ثراہ ۱۲

گر کس طریقہ سے، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مسافت مابین بلگرام وقنوج پنج کروہ است" کروہ دو میل کے قریب قریب ہوتا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بلگرام اور قنوج میں بمشکل دس میل کا فاصلہ ہوگا، لیکن کوئی باور کر سکتا ہے اس قرب مسافت کے باوجود مولانا محمود اختر نے قنوج میں طالب العلمی کے یہ دن کس طریقے سے گذارے، مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ "در ایام تحصیل باوجود قرب مسافت میل بہ وطن نہ کرد" خدا ہی جانتا ہے کہ تحصیل کی یہ مدت کتنے زمانہ میں پوری ہوئی، سال دو سال تو قطعاً نہ ہوگی مگر دھن کے پکوں کے عزم کی پختگی ملاحظہ فرمائیے کہ جب "تصحیح نسخہ ظاہر و باطن بکمال رساند آں گاہ بہ جانب وطن عطف عناں نمود ص۵۵"

اور دوسروں کو جانے دیجیے، خود مولانا آزاد کی عشق علم کی وہ داستان کیا کچھ کم عجیب ہے، کہ میں نے مختلف موقعوں پر ظاہر کیا ہے کہ مولانا ایک امیر گھرانے کے آدمی تھے، ان کے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی عالمگیری امرا میں تھے، مختلف جلیل مناصب کا تعلق ان سے فرخ سیر کے زمانہ تک رہا، مولانا آزاد نے علاوہ مولوی طفیل محمد صاحب کے خود اپنے نانا مرحوم سے بھی پڑھا تھا، خود فرماتے ہیں "لغت و حدیث و سیر نبوی در خدمت قدسی منزلت جدنا واستاذنا علامہ مرحوم مرقوم بسند رسانیدم" اور بھی مختلف لوگوں سے مختلف علوم وفنون کے سیکھنے سکھانے کے مواقع حالانکہ ہندوستان ہی میں میسر آچکے تھے، عمر بھی چونتیس سال کی ہو چکی تھی، بہ ظاہر جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا، غیر متاہل رہنا مشکل تھا، مگر ایک "جنون" تھا جس کی آگ اندر اندر سلگتی رہتی تھی، آخر ایک دن جیسا کہ خود ہی لکھتے ہیں: پیادہ پا تنہا از بلگرام رخت سفر بربستم" کیسی تنہائی؟

اجار واقربا را طورے غافل ساختم کہ اگر ایں ماجرا سراغ می یافتند سد راہ مقصود می شدند"

یہ تنہا کس لیے نکلے تھے، حدیث کا شوق تھا حجاز جانا چاہتے تھے، اندیشہ تھا کہ لوگوں پر اس قصد کو اگر ظاہر کرونگا، تو مانع ہونگے، چپ چاپ یکہ و تنہا وہی شخص آج تک جو ایک میل بھی کبھی پیدل نہ چلا تھا، گھر سے نکل پڑا، گھر میں لوگوں کو خیال گذرا کہ شائد قریب کے کسی گاؤں میں کسی سے ملنے جلنے چلے گئے ہیں، لیکن جب تین دن گزر گئے، اور کسی طرف سے کوئی خبر نہ ملی تب

لوگ چونکے۔ "اہلِ بیت ایں فقیر بعد سہ روز آگاہ شدند و انگشت تحیر بدندان گزیدند" مگر تین دن کے نکلے ہوئے مسافر کو پکڑنا آسان نہ تھا، خصوصاً "راہے کہ غیر متعارف بود پیش گرفتم"

بلگرام اودھ کا قصبہ ہی، اور جو ایک میل بھی کبھی پیادہ پا نہ چلا تھا، جانتے ہو روا روی کرتا ہوا کہاں دم لیتا ہی، مالوہ میں ایک مشہور قصبہ سرونج[1] بھوپال کے پاس ہی، یہاں پہنچ جاتے ہیں راہ میں کیا گذری اور تو کچھ نہیں لکھا ہی، البتہ اتنا قلم سے نکل گیا، قدم گاہے بہ پیادہ گردی آشنا نہ بود آبلہا یا را خوشۂ تاک ساخت" پاؤں کیا تھا آبلوں سے انگور کا خوشہ بن گیا تھا اور انہی دانوں میں وہ کیف و مستی بھری ہوئی تھی جو مولانا کو آگے بڑھائے لیے چلی جاتی تھی۔ سرونج میں خبر ملی کہ بانی سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ کی بارگاہ فلک پناہ دکن جا رہی ہی، قریب ہی نہیں کہیں فروکش ہیں، مولانا آزاد کسی طرح گرتے پڑتے، عساکر آصفیہ تک پہنچ کر فوجیوں میں گھل مل گئے، پیشانی سے شرافت و نجابت، علم و تقوی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، آصف جاہی فوج کا ایک امیر آپ پر مہربان ہوگیا، اور مولانا کو اُس نے اپنا مہمان بنا لیا، ایک مستقل خیمہ اور سفر کے لیے ایک رتھ کا نظم مولانا کے لیے اس امیر نے کر دیا، اب عساکر آصفی کے ساتھ منزل بمنزل کوچ کرتے ہوئے بھوپال پہنچے، بھوپال میں آصف جاہی فوجوں کی مُٹ بھیڑ مرہٹوں سے ہوگئی، رمضان کا مہینہ تھا، لکھتے ہیں کہ

"تمام رمضان در سواد بھوپال آتش حرب اشتعال داشت و زلزلۂ ساعت قائم بود"

کیا زمانہ تھا، امیر خاندان کے صاحبزادے ہیں، ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گذری ہی لیکن اچانک میدان جنگ میں گھر جاتے ہیں، پھر کیا وہ صرف تماش بینوں میں تھے ایک نظم میں اپنے اس حال کو بیان کیا ہی:۔

فوج اسلام و کفر صف آراست — طرفہ شورے قیامتے برپاست
کرۂ آتشیں توپ و تفنگ — کرۂ نار ساخت عرصۂ جنگ

اور جس کے ہاتھ میں اب تک قلم تھا وہی۔

[1] سرونج بھوپال سے ۶۵ میل شمال میں اور گوالیار سے ۱۵۰ میل دور جنوب میں واقع ہے۔ اس لئے قربت بھوپال

من ہم آں روز در صفِ اسلام — بایکے ذوالفقار خوں آشام

قدم پردلانہ افشردم — حملہ ہا بر مخالفاں بردم

مرہٹوں کو ہزیمت ہوئی، آصف جاہی فوج آگے بڑھی، غالباً اسی امیر نے جس کے آپ مہمان تھے آپ کو ایک دن حضرت آصف جاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ ۔

"باوصف موزونی طبع مدت العمر زبان بمدح امراء و اغنیاء نکشودیم"

لیکن آج ضرورت پیش آگئی تھی جس مقصد کو سامنے رکھ کر گھر سے نکلے تھے دیکھا کہ اُس میں کامیابی کی یہی صورت ہے، یہ رباعی فارسی میں لکھ کر حضرت آصف جاہ کی خدمت میں پیش کی

لسے حامیٔ دیں، محیطِ جود احساں — حق داد ترا خطاب آصف شایاں

او تخت بدرگاہ سلیماں آورد — تو آلِ نبی را بہ درِ کعبہ رساں

حضرت آصف جاہ خود موزوں طبیعت رکھتے تھے، رباعی پسند آئی، اور فرمان ہوگیا کہ حجاز کی طرف روانگی کا سامان مولانا کے لیے کردیا جائے، یوں خدا نے ان کو سورت پہنچایا سورت میں جہاز پر سوار ہوکر مکہ معظمہ اور مکہ کے بعد مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حج و زیارت کے سوا ان پاک شہروں کے علماء سے استفادہ کا جو شوق تھا وہ پورا ہوا، مدینہ میں مولانا کا جو شغلہ تھا ان الفاظ میں اس کا اظہار فرماتے ہیں۔

"شبہا مابین بیت و منبرِ (الا زروضۃ الجنۃ) نشستم و مطالعہ صحیح بخاری می پرداختم"

بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا، خود ہی ان الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے:

"من فدائے جلوۂ احمدی و صید بستہ فتراک محمدی در صغر سن خوابے دیدم کہ در مسجد مکہ معظمہ زادہا اللہ تعظیماً حاضرم و جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم در محرابے از مسجد قائم اند، فقیر شرف ملازمت اقدس دریافتم حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التفات فراواں نمودند لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند"

آج کسی کے سامنے بیٹھ کر صحیح بخاری کے ذریعہ سے وہی "لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند" کی تعبیر پوری کر رہے تھے، مولانا حیات سندھی جو اس زمانہ میں مدینہ منورہ کے سرخیلِ حلقہ محدثین تھے

ان سے "صحیح بخاری را ... سندکردم واجازت صحاح ستہ وسائر مرویات مولانا برگرفتم" زیادہ وقت مدینہ میں گذار کرجب حج کا موسم قریب آگیا، مکہ معظمہ پہنچے، مناسک حج سے فارغ ہوئے اور شیخ الحرم علامہ عبدالوہاب طنطاوی سے جیساکہ فرماتے ہیں: "فوائدفن حدیث درگرفتم"

اور یہ کوئی ایک مثال ہی، علم کے دیوانوں کو فتنہ وفساد کے ان ہی دنوں میں اس ملک سے، اُس ملک میں اس علاقہ سے، اس علاقہ کی طرف سرگرداں دیکھنا چاہتے ہوں تو ان بزرگوں کے حالات اُٹھاکر پڑھیے، کتنوں کے تذکرے مختلف حیثیتوں سے خود اسی مضمون میں گذر چکے ہیں۔ کتاب منبع الانساب کے حوالہ سے صاحب نزہۃ الخواطر نے ایک سندھی عالم شیخ علی بن محمد جھونسوی کی سراسیمگیوں کا عجب حال نقل کیا ہی، لکھا ہی کہ پیدا ہوے بھکر (سندھ) میں، وہی ذوق علم بھکر سے ملتان لے گیا، ملتان میں شیخ شمس الدین الحسینی العریضی اور مولانا ابوالفتح رکن الدین کی صحبتوں میں ایک مدت گذاری، لیکن دل کو قرار نہ تھا، ملتان سے بھی اُڑے اور

سافر الی بہار ولازم الشیخ منہاج الدین الحسن البہاری اثنتی عشرۃ سنۃ	بہار کا سفر اختیار کیا اور شیخ منہاج حسن بہاری کی خدمت میں بارہ سال مقیم رہے۔

شیخ منہاج حسن نے ان کو پہلے۔

ارسل الی شیخپورہ فلبث ہنا سنتین ثم ارسل الی پراگ (الہ آباد) فسکن بصحراء ماوراء النہر	شیخ پورہ[1] بھیجا جہاں وہ دوسال رہے شیخپورہ سے پراگ (الہ آباد) بھیجے گئے جمنا گنگا کے سنگم کے پاس

---

[1] واللہ اعلم اس شیخپورہ سے کون سا شیخپورہ مراد ہی، صوبہ بہار میں بہار نامی ایک قصبہ بھی ہی جو اسلامی عہد میں بہار کا عاصمہ (پایہ تخت) تھا، اور اب ایک معمولی سب ڈویژن کی حیثیت رکھتا ہی، اسی سے دس کوس کے فاصلہ پر بسمت مشرق شیخپورہ نامی ایک اور قصبہ آباد ہی جس کے اطراف میں زیدی سادات کے بارہ گاؤں وندھیاچل کے سلسلہ کی ایک پہاڑی کے نیچے مسلسل ایک دوسرے سے ملے جلے آباد ہیں اور یہ شیخپورہ انہی گاؤں کا مرکزی قصبہ ہی۔ ایک بزرگ شیخ شعیب رحمۃ اللہ علیہ کا وہاں مزار ہی۔ کہتے ہیں کہ قصبہ ان ہی کے نام کی طرف منسوب ہی۔ شیخ شعیب آٹھویں صدی کے اکابر میں ہیں ایک کتاب "تذکرۃ الاصفیاء" آپ کی مشہور بھی ہی۔۱۲

جنگل میں ایک گاؤں ہڑ لونگ پور کے پاس قیام کیا حیث یلتقی ما جون و گنگ قریبًا من قریۃ

بکثرت لوگ آپ کے ذریعہ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہر بونگ پور فاسلم علی یدہ خلق کثیر (ص ۹۲)

علم اور دین کے وارفتوں کو دیکھ رہے ہیں، زمان و مکان دونوں کے فاصلے گویا ان کی نگاہوں میں صفر کا درجہ رکھتے تھے، جہاں جی چاہا چلے گئے، جب تک جی چاہا ٹھہرے رہے، آخر آخر وقت تک روایات کا اثر خاندانوں میں باقی تھا، خود فقیر کے جدامجد مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ علیہ جن کے مدرسہ کا تذکرہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب سے گذر چکا ہے، حالانکہ یہ اس زمانہ کے آدمی ہیں جب برٹش راج کا تسلط ملک میں قائم ہو چکا ہے۔ مولانا کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر ممتاز تھے، بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بچوں میں کوئی لڑکا عالم ہوتا، مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ مولانا محمد احسن کی شادی ہو چکی تھی، بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے۔ اس عمر اور ان حالات میں تحصیل علم کا سودا سر پر سوار ہوا، بیوی بچے گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلان سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ ۱۴ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گذری خط و کتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ آئے۔ مختلف علوم کے اہل کمال جس جس شہر میں تھے ان کی خدمتوں میں پہنچے علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھی، ریاضی، ہیئت، حساب مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند حضرت مولانا عالم علی نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہما سے حاصل کی۔ اسی زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کیے جن میں وجود رابطی اور نشاۃ بالتکریر والا رسالہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ شرح سلم بحر العلوم پر معرکۃ الآرا حاشیہ لکھا اقلیدس کا مقالہ اولیٰ عربی جو

عام مدارس کے نصاب میں شریک ہے، پہلی دفعہ تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ آپ ہی نے لکھنؤ سے شائع کرایا اسی نسخہ کی نقل آج تک مطابع میں چھپ رہی ہے اور بھی بیسیوں کام اس عرصہ میں کرتے رہے، جب کامل اطمینان ہوگیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی اُسی برگد کے درخت کے نیچے گذار دی جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل نہیں کیا ہے کہ اس سے اپنے کسی خاندانی امتیاز کا اظہار مقصود ہے، کیونکہ اس زمانہ کے لحاظ سے اس واقعہ میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ پرانے علمی گھرانوں میں بزرگوں کے متعلق آپ کو ہند کے طول و عرض میں اس قسم کی داستانوں کا ایک سلسلہ مل سکتا ہے، افسوس کہ اب اس کی یاد مٹتی جاتی ہے۔ کاش! جمع کرنے والے ان ولولہ انگیز نمونوں کو پچھلوں کے سامنے پیش کردیتے۔ شاید اپنے اگلوں کے ان حالات سے ان پر اپنی حقیقت واضح ہو۔

رجسٹر حاضری اور ناغہ | اور اس وقت تو غرض یہ تھی کہ قدیم نظام تعلیم کی وہ عجیب و غریب خصوصیت یعنی بالکلیہ درس کا یہ نظام حاضری اور حاضری کے رجسٹروں سے ہمیشہ بے نیاز رہا، لیکن اس پر بھی یہ واقعہ تھا کہ ۵، فیصدی نہیں تین چار فیصدی غیر حاضری یا ناغہ[1] بھی ناممکن تھا، خود خاکسار کو مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ کا تجربہ ہے، سات آٹھ سال کے اس عرصہ میں بجز کسی شدید ارضی و سماوی آفت یا حادثہ کے میں نہیں جانتا، کہ کسی درس میں ایک دن کے لیے بھی کوئی غیر حاضر رہا ہو۔ بعض بعض اسباق ٹھیک مئی اور جون کے مہینوں میں بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوتے تھے، گرمی اور تپش راجپوتانہ کی تھی،

[1] فوائد الفواد میں سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس ناغہ کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات نقل کی ہے حضرت اپنے استاذ شمس الملک مستوفی الممالک جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے ان کے درسی خصوصیات کا تذکرہ فرماتے ہوئے یہ بھی بیان کرتے تھے کہ جو ان سے پڑھنا چاہتا اس سے منجملہ دیگر چند معاہدوں کے ایک معاہدہ اس کا بھی لیتے تھے کہ "ناغہ" نہ کروگے۔ حضرت سلطان جی فرماتے ہیں۔ اتفاقاً کسی وجہ سے کسی دن ناغہ

بعض[1] طلبہ کی قیامگاہیں کافی فاصلہ پر تھیں، لیکن وقت پر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی نہ آیا ہو، شیخ محدث نے خود اپنا حال لکھا ہے کہ

"باوجود غلبہ برودت ہوائے زمستان و شدت حرارت تابستان دوبار بمدرسہ دہلی کہ شائد از منزل ما دو میل داشتہ میل می کردم"

مدرسہ دو میل ہے، گرمی ہو، یا سردی دن میں دو دفعہ آرہے ہیں جارہے ہیں، صرف اسی قدر نہیں بلکہ "مدتے پیش تراز صبح بمدرسہ می رسیدیم و درسایۂ چراغ جزومی کشیدم" (اخبار الاخیار ص ۳۱۳)
رات رہتے اندھیرے مُنہ گھر سے نکل جاتے اور مدرسہ پہنچ کر چراغ کی روشنی میں ایک ایک جزء لکھ ڈالتے، گویا رات کافی باقی رہتی ہوگی، دو میل چلنا اور پھر ایک جزء کا چراغ ہی کی روشنی میں نقل کرنا معمولی قلیل وقت میں ممکن نہیں،

ادھر طلبہ میں علم کے طلب کا یہ بے پناہ شوق اور دوسری طرف اساتذہ کا ان کے ساتھ تعلق کچھ اس نوعیت کا ہو جاتا تھا کہ ان کی معمولی ناراضی کے خیال کو بھی طلبہ برداشت نہیں کرسکتے تھے، جانتے تھے کہ اساتذہ کے لیے سب سے زیادہ گراں بات طالب العلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) کوئی طالب العلم درس میں حاضر نہ ہوسکا، تو شمس الملک کا قاعدہ تھا کہ اس سے کہتے "چہ کردہ ایم کہ نمی آئی" یعنی میں نے آپ کا کیا گناہ کیا تھا جو تشریف نہ لائے، خود اپنے متعلق بھی فرماتے کہ "اگر مرا ناغہ شدے یا بعد از دیر رفتے در خاطر گذشتے مارا ہم چیزے خواہد گفت" بس یہی خیال کہ اُستاذ پوچھینگے۔ ناغہ سے طالب العلموں کو روکتا تھا، آج بھی بدیر آنے والے طلبہ سے عصری جامعات میں بازپرس کی جاتی ہے لیکن کس انداز میں "پندرہ منٹ ہو چکے کلاس سے باہر ہو جاؤ" ایک طرف بازپرس کا یہ حال ہے اور دوسری طرف سُنیے سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ان کے استاذ بازپرس بھی کرتے تو کن الفاظ میں، فرماتے ہیں "این گفتے" یعنی یہ شعر پڑھتے ؎ آخر کم از انکہ گاہ گاہے ۞ آئی و بما کنی نگاہے۔ (فوائد الفواد ص ۶۸) شاگرد کی گردن شرم سے جھک جاتی، محبت کے اسی برتاؤ کا یہ اثر تھا کہ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ سلطان جی اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد "چشم پُرآب کرد" کہاں اساتذہ و تلامذہ کے یہ تعلقات مودت و لطف اور کہاں مدرسہ کو پولیس کا محکمہ بنا دینا، اساتذہ گویا تھانہ دار کا گروہ ہے اور تلامذہ مجرموں کی جماعت۔ وشتان بینہما ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ان ہی بعض میں کچھ دنوں نے کے لیے ایک دیوانہ بھی شریک تھا، اللہ اللہ راجپوتانہ کی وہ لو اور بارہ کے بعد قیامگاہ کی واپسی، خس خانہ و برفاب کی تلافی تاریک حجرے میں ایک موٹے لحاف کے اندر گھس کر کی جاتی تھی، پسینہ سے گو سارا جسم شرابور ہو جاتا تھا، لیکن لو کی شدت سے بچنے کے لیے تاریک حجرہ اور لحاف اس وقت ایک بہترین پناہ گاہ تھے۔ ۱۲۔

کا وقت پر نہ آنا تھا جس سے اُس کا استغنا ثابت ہوتا تھا، اور کوئی استاد اپنے شاگرد کے متعلق اس رویہ کو برداشت نہیں کرسکتا کہ وہ اس سے پڑھنا بھی چاہتا ہو اور طریقۂ عمل سے یہ بھی ظاہر کرتا ہو کہ اپنے اُستاد کا وہ اس علم میں چنداں محتاج نہیں ہے۔

بہرحال اب اسباب کچھ ہی ہوں، موروثی روایات کا اثر ہو، یا کوئی بات ہو، واقعہ یہی تھا کہ حاضری کے رجسٹروں کے فقدان کے باوجود طالب العلم کا سبق سے غیر حاضر ہونا اس زمانہ میں اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ قدرت ہی نے غیر حاضری پر اسے مجبور نہ کر دیا ہو۔ بلکہ بسا اوقات ان بزرگوں کے شوق بے پروانے قدرتی موانع کی بھی پروانہ کی۔ محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں یہ واقعہ درج ہے کہ جن دنوں قاری صاحب شاہ اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے۔ ایک دن موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہوا، اور قاری صاحب قیام گاہ کی دوری کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے جو طلبہ حاضر تھے اُنھوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اس بارش میں قاری صاحب کا اتنے طول طویل فاصلہ سے آنا ناممکن ہے اس لیے سبق شروع کرا دیا جائے، شاہ صاحب نے فرمایا "ابھی ٹھہرو وہ ضرور آئینگے" یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اس برستے ہوئے پانی میں دیکھا جاتا ہے کہ پائنچے چڑھائے اور کتاب ایک گھڑے میں بہ حفاظت بند کیئے قاری صاحب آرہے ہیں، شاہ صاحب نے طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا لو دیکھو میں نے کیا کہا تھا، وہ قاری صاحب آگئے، آؤ اب سبق پڑھو" (تذکرہ رحمانیہ ص ۴۱)

بہرحال تعلیم میں اس کی وجہ سے جو تسلسل باقی رہتا تھا، نیز بجز جمعہ[1] اور غالباً رمضان

[1] بعض بعض علمی خانوادوں میں علاوہ جمعہ کے منگل کے دن بھی درس نہ ہوتا تھا، ہمارے خیرآبادی خاندان میں بھی یہی دستور تھا منگل کا دن صرف اساتذہ کے لیے تصنیف و تالیف کا تھا اور طلبہ کے لیے کتابوں کی نقل کا۔ محدث پانی پتی قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ منگل کے روز طلبہ کو سبق نہیں پڑھایا کرتے تھے، قاری صاحب چونکہ لفظاً و معناً ولی اللٰہی خاندان کے اتباع میں مشہور تھے اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ یہ طریقہ اُنھوں نے شاہ صاحب کے خاندان ہی سے حاصل کیا تھا۔ ۱۲

کے ایک مہینہ کے سوا درس چونکہ سال بھر تک مسلسل جاری رہتا تھا، اور اساتذہ کی کثرت کی وجہ سے جماعت کی پابندیوں سے لوگ آزاد تھے، دوسروں کی وجہ سے آہستہ چلنے پر چونکہ کوئی مجبور نہ تھا، کچھ تو قدیم طریقۂ تعلیم کے ان خصوصیات اور سب سے بڑی وجہ یعنی وہی بات کہ تعلیم کا مقصد معلومات کی گرداوری نہیں بلکہ مالم یعلم (جو آدمی نہیں جانتا) اس کے یعلم (جاننے اُس کو) کی صلاحیتوں کا اُبھارنا، سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا تھا۔

ان ساری باتوں کا نتیجہ وہی تھا کہ عموماً لوگ بہت تھوڑی عمر میں سند فراغ حاصل کر لیتے تھے، اتنی تھوڑی عمر کہ آج اگر اس کا تذکرہ کیا جائے تو شاید افسانہ سے زیادہ اُسے وقعت نہ دی جائے۔

ایسی ایسی ہستیاں جن کی عظمت و جلالت کے آوازے سے آج تک علم کا ایوان گونج رہا ہے، علم کے مختلف کنگروں پر ان کے جھنڈے لہرا رہے ہیں، ان بزرگوں کی سوانح عمریاں اُٹھا کر پڑھیے، حیرت ہوتی ہے کہ آج جس عمر میں لوگ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکتے اسی عمر میں یہ حضرات فارغ التحصیل عالم قرار پا چکے تھے، فیضی جیسا ہمہ داں

امروز نہ شاعر و حکیم — دانندہ حادث و قدیم

کا نعرہ لگانے والا،

ایں کالبدم ز خاک ہندست ولیک — در ہر بُنِ مو ہزار یوناں دارم

لیکن "ہزار یونان جس کے ہر بن مو" میں پوشیدہ تھا، سنتے ہیں: فنون را نزد پدر در چہار دہ سالگی بانجام رسانید۔ (ماثر الکرام ص ۱۹۸)

مولانا فضل حق خیر آبادی صاحب "ہدیہ سعیدیہ"

شاگرد پدر خود مولوی فضل امام ست حدیث از مولانا عبدالقادر دہلوی اخذ کردہ ...... و فراغ علمی بعمر سیزدہ سالگی حاصل نمودہ۔ (تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۴)

یہ وہی مولانا فضل حق خیر آبادی ہیں، جو افق المبین کا سبق شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھایا کرتے

تھے، علومِ رسمیہ خصوصاً معقولات اور حدیث یہ سارا قصہ کل تیرہ سال کی عمر میں ختم ہوگیا۔

مولانا عبدالحیی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں۔

لما وصلت الی خمس سنین اشتغلت بحفظ القرآن المجید
وحصلت فی اثنائہ بعض الکتب الفارسیہ وتعلمت
الخط وفرغت من الحفظ حین کان عمری عشر سنین
ومن بدء السنۃ الحادیۃ عشر شرعت فی تحصیل العلوم
ففرغت من الکتب الدرسیۃ فی الفنون الرسمیۃ
الصرف والنحو والمعانی والبیان والمنطق والحکمۃ
والطب والفقہ واصول الفقہ وعلم الکلام والحدیث
والتفسیر وغیر ذلک حین کان عمری سبع عشرۃ سنۃ۔ ۱۱۲ھ

جب عمر کے پانچویں سال میں میں پہنچا، تب حفظ
قرآن میں مشغول ہوا حفظ کے زمانہ میں بعض فارسی
کتابیں پڑھتا رہا اور خط نویسی بھی، جب دس سال
کی عمر ہوئی تو حفظ قرآن سے فارغ ہوگیا اور گیارہویں
سال سے تحصیل علوم میں مشغول ہوا، رسمی فنون
کی درسی کتابوں یعنی نحو صرف معانی بیان منطق
حکمت (فلسفہ) طب فقہ واصول فقہ علم کلام حدیث
تفسیر وغیرہ علوم سے سترہویں سال کی عمر میں فارغ ہوگیا۔

سترہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی مدت بھی داخل ہے، بلکہ اسی میں بقول مولانا

مع فترات وقعت فی اثناء التحصیل وطفرات وقعت
فی اوان التکمیل

اس میں بعض وقفے بھی تحصیل علوم میں پیش آئے
اور تکمیل کے اس زمانہ میں بعض رکاوٹیں بھی ہوئیں۔

میں نے قصداً مولانا کی عبارت اسی لیے نقل کی تاکہ معلوم ہو کہ اس قلیل مدت میں
ان لوگوں کو کیا کیا پڑھایا جاتا تھا: اور یہ چیزیں تو وہ ہیں جو اپنے والد سے انھوں نے پڑھی تھیں
ان کے سوا جب لکھنؤ آنا ہوتا تھا تو مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے جیسا کہ خود لکھتے ہیں

قرأت علیہ فی ثمان ثمانین شرح الجغمینی مع مواضع
من حواشی البرجندی و امام الدین الریاضی ورسالۃ
الاصطرلاب للطوسی و قدراً کثیراً من شرح التذکرہ
للسید وشرحہا للخضری وشرحہا للبرجندی و زیج
الغ بیگ، مع شرح البرجندی ورسائل الاکر و

۱۲۸۸ھ میں مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے شرح
چغمینی برجندی اور امام الدین ریاضی کے حواشی
کے ساتھ میں نے پڑھی اور طوسی کے اسطرلاب کا رسالہ
نیز تذکرہ کی شرح کا بھی ایک حصہ حضری و برجندی
کی شرح کے ساتھ الغ بیگ کی زیج برجندی کی شرح

التسطیح وغیر ذلک کے ساتھ اکر کا رسالہ اور تسطیح کا رسالہ یہ ساری کتابیں بھی مولانا سے پڑھیں

سترہ سال کی عمر اور اس میں علوم و فنون کے ان ہفت خوانوں کو طے کرنا، اور کس طرح طے کرنا، کہ ان ہی علوم کو پڑھانے بیٹھے تو ملک کے کناروں تک اپنے جلیل تلامذہ کی ایک فوج پھیلا دی، خود مولانا مرحوم کی پوری عمر ہی کیا ہوئی، چالیس کے قریب میں انتقال ہو گیا، لیکن اس عرصہ میں ستر سے اوپر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، جن میں بعض کافی ضخیم ہیں، بعض ہندوستان کے سوا مصر میں بھی طبع ہوئیں، اس وقت تک بیسیوں کتابیں نظامی نصاب میں، آپ ہی کی تحشیہ کی داخل ہیں، اسی کے ساتھ فتاویٰ کے مجلدات ہیں، علم کی یہ پختگی اور اس کے حصول میں وقت کی یہ نوعیت کیسی عجیب بات ہے۔

خود حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا کیا حال ہے، انفاس میں رقم طراز ہیں:۔

بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم ایں دیار در پانزدہم فراغ حاصل شد" ص ۱۹۷۔

صاحب شمس بازغہ علامہ محمود جونپوری کے ترجمہ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

نزد استاد الملک شیخ محمد افضل جونپوری تلمذ نمود و در عرض ہفدہ سالگی فاتحہ فراغ خواند ص ۲۰۲

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم کے متعلق بھی صاحب کتاب حدائق حنفیہ نے لکھا ہے

"سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر فائق اقران اور افاضل اماثل ہو گئے۔" ص ۴۶۷

اور کس کس کا نام گناؤں، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اسی کتاب حدائق الحنفیہ میں، ہندستان کے مشہور فاضل جلیل قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو عوام میں تو اپنی کتاب "مالا بد منہ" کی وجہ سے مشہور ہیں، لیکن اہل علم قاضی صاحب کی علمی بلند پائگی کو ان کی تفسیر مظہری سے پہچانتے ہیں، جس کا شاید میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے، قاضی صاحب کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم ظاہری سے فراغت پا کر علم طریقت کا شیخ محمد عابد سے اخذ کیا ص ۴۶۵

اور صرف یہی نہیں اٹھارہ سال کی اسی مدت طالب العلمی میں ایک طرف تو قاضی صاحب نے تمام علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی اور دوسری طرف حیرت انگیز بات یہ کہ

ایام تحصیل علم میں علاوہ کتب تحصیلیہ کے ساڑھے تین سو کتابیں مطالعہ کیں مئ۲۲۶

کس قسم کی کتابیں ان کے مطالعہ سے گذری ہونگی، اس کا اندازہ ان کے اس خاص علمی رجحان سے ہوسکتا ہے جو ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے[۱] خصوصاً ہم جب اس پر غور کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمی زندگی زیادہ تر شاہ ولی اللہ جیسے بلند علمی مذاق رکھنے والے اُستاد کی شاگردی میں گذری۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کی جس شاخ کے اہل کمال کو آپ اس ملک میں پائینگے، فراغت کی عمر بھی تیرہ چودہ سال سے بیس بائیس سال کی عمر سے زیادہ نظر نہ آئیگی، مولانا غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں تقریباً سو ڈیڑھ سو سے اوپر علماء کا تذکرہ درج کیا ہے، اوسط عمر تحصیل کی قریب قریب یہی ہے۔

آج ہندوستان میں عصری جامعات جن لوگوں کو گریجویٹ بنا بنا کر نکال رہی ہیں، یوں کہنے کو تو ان طیلسانیوں کو سب ہی کچھ سکھایا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہر علم کی نمک چشی کے ساتھ زیادہ زور انگریزی دانی اور حساب و کتاب پر دیا جاتا ہے، لیکن اس پر بھی حال یہ ہے کہ ایک طرف اگر کذب بیانی[۱] کو اسکولی اور کالجی عمر کے اندراج میں جائز نہ ٹھیرالیا جاتا، اور اسی کے ساتھ خضاب آہنی کی چلتی ہوئی ترکیب پردہ دار نہ بن جاتی، تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بی۔اے

۱؎ قاضی صاحب کی جو وسعت نظر علم حدیث اور فقہ و اصول فقہ و تصوف میں، حاصل تھی حقیقت یہ ہے کہ ان کی تفسیر کے دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اس جامعیت کے علماء ہندوستان میں کم ہی گذرے ہیں اور ہندوستان ہی میں اگر مبالغہ نہ خیال کیا جائے تو قاضی صاحب کو بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ان کو بیہقی وقت بلاوجہ نہیں کہتے تھے۔ حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ سے قاضی صاحب نے اگرچہ ارشاد اپنے پیر شیخ محمد عابد کے حکم سے حاصل کیا تھا لیکن خود میرزا صاحب قاضی صاحب کو علم الہدیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے، تفسیر کے سوا قاضی صاحب نے ایک بڑی معرکۃ الآراء مبسوط کتاب فقہ میں لکھی ہے جو فقہ جامع کی ایک بہترین استدلالی کتاب ہے۔ اس میں ہر باب میں ائمہ اربعہ کے مسائل دلائل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اسی کتاب سے الگ کرکے آپ نے ماخذ الاقوی کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جس میں آپ نے ان مسائل کو جمع کیا ہے جو دلیل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک قوی تر تھے۔ افسوس کہ ملک کی قدردانی نے اب تک ان کتابوں کی اشاعت کا موقعہ بھی بہم نہ پہنچایا۔ تفسیر مظہری متعدد بار چھپنی شروع ہوئی لیکن آج تک مکمل نہ ہوسکی۔ حکومت آصفیہ سے ایک صاحب نے روپیہ بھی وصول کرایا لیکن تفسیر چھاپ کر نہ دی۔

۵ (بر صفحہ ۳۷)

اور ایم اے کی ڈگریاں لینے والے طلبہ کتنی لمبی لمبی ڈاڑھیوں کو لے کر تعلیم گاہوں سے باہر نکلتے۔

بہر حال ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں تحصیل علم کی اوسط مدت جو تھی وہ آپ دیکھ چکے لیکن نتیجے کے لحاظ سے اسی مختصر مدت تعلیم میں ہندوستان کو شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ مولانا عبد الحیی، ملا محمود، ملا فیضی، مولانا بحر العلوم مولانا فضل حق وغیرہم جیسی لازوال شہرتوں کی مالک ہستیاں مسلسل مل رہی تھیں۔

لیکن باوجود اس کے اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تعلیم کی اس زمانہ میں بھی کوئی مدت مقرر کر دی گئی تھی جس کے دل میں جس وقت بھی علم کا ولولہ سر اٹھاتا آزاد تھا جس اُستاد کے پاس چاہتا حاضر ہو جاتا تھا، عمر کی زیادتی کبھی حصول علم کی راہ میں مانع نہ آئی، خود مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم (جد امجد فقیر) کا قصہ گذر چکا کہ متاہل ہونے کے بعد گھر سے پڑھنے کے لیے نکلے اور پڑھ ہی کر واپس ہوئے۔ مولانا آزاد نے میر درگاہی کے تذکرہ میں ان ہی کا بیان نقل کیا ہے۔ "بعد از انے کہ پابند تاہل شدیم بہ کسب علم ترغیب نمودند" اشارہ میر عبد الجلیل آزاد مرحوم کے نانا کی طرف ہے کہ اُنھوں نے کسب علم کی طرف متوجہ کیا، اسی سے پہلے یہ فقرہ ہے

"باعث تحصیل علم علامہ میر عبد الجلیل شدند"

چاہا جائے تو اس کے نظائر و امثال بھی پیش کیے جا سکتے ہیں خصوصاً پڑھنے پڑھانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) ۔ حکومت نے یہ قانون بنا کر کہ سولہ سال کی عمر سے پہلے کوئی میٹرک پاس نہیں کر سکتا تھا اور چوبیس سال کی عمر کے بعد کسی کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جا سکتا، اس عجیب و غریب قانون نے لوگوں کو جھوٹ بولنے اور بلوانے پر آج مجبور کر دیا ہے، حالانکہ ان عجیب و غریب قیود کا مطلب آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہے، ایک لڑکے میں اگر میٹرک پاس کرنے کی صلاحیت سولہ سال سے پہلے پیدا ہو گئی ہے تو آپ اس کو زبردستی اس امتحان میں کامیاب ہونے سے کیوں روک رہے ہیں ...... ممکن ہے یورپ کے سرد ملک میں لوگ دیر میں ہوش و حواس سنبھالتے ہوں لیکن ہندوستان کی تاریخ آپ کو بتا رہی ہے کہ میٹرک تو علم کا ابتدائی درجہ ہے، یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر میں لوگ فارغ التحصیل ہو کر فیضی اور بحر العلوم بنتے تھے۔ یہی حال ملازمت کا ہے۔ کارکردگی کی صلاحیت جس میں پائی جاتی ہو، وہ ملازمت کا مستحق ہو سکتا ہے خواہ اُس کی عمر کچھ بھی ہو آج بھی یہی ہو رہا ہے لیکن جھوٹ کے پردے میں حقیقت کو چھپا کر بلا وجہ ایک اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونے پر لوگوں کو مجبور کرنا اس زمانہ کا عجیب مذاق ہے۔

کے بعد کسی جدید زبان[1] یا علم کے سیکھنے کی ضرورت اگر کسی کو پیش آگئی ہو تو پیرانہ سری بھی اس ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی تھی، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا تذکرہ علماء ہند میں ہے۔

"بشوق آموختن زبانِ عبرانی بکلکتہ رفتہ در آنجا سالے چند پابند اقامت گشتہ از احبار (ہاخام) زبان عبرانی را بجمیع الوجوہ آموخت" (ص ۱۵۲)

جبرو (عبرانی) زبان میں مولانا کو جو دستگاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب "بشریٰ" اور اس رسالہ سے ہو سکتا ہے، جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہ السلام کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب "خطبات احمدیہ" کا جز، بنا کر اُسے شائع کیا ہے۔

علامہ تفضل حسین خاں کا ذکر پہلے کہیں گذرا ہے، یہ بھی اُن ہی لوگوں میں ہیں جنہوں نے تحصیل علوم رسمیہ کے بعد "انگریزی و رومی ... آں را لاتینی نیز گویند ... یونانی را نیکو گفتہ وخواندے و نوشتے" (نجوم السماء ص ۳۲۴)

چریا کوٹ ہی کے ایک اور بزرگ قاضی غلام مخدوم چریا کوٹی ہیں، صاحب تذکرہ علماءِ ہند نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

بعد تکمیل علوم متداولہ شوق تعلم زبانِ سنسکرت در دلش پدید آمد تا اینکہ در تحصیل زبان مذکور حظے وافی برگرفت و بمقام بنارس کہ معدن مہرہ زبان مرقوم ست میاں ماہرانِ ایں فن امتیازے کافی یافت ص۱۵۷

---

[1] مختلف زبانوں کے سیکھنے کا مسلمانوں میں جو مذاق تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں آٹھویں صدی کے ایک بغدادی عالم زین الدین العابر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ تاتاری نو مسلم بادشاہ غازان خاں جب آپ کے مدرسہ میں آیا اور آپ سے ملا تو بالغ فی الدعاء (یعنی اس نو مسلم بادشاہ کو شیخ نے بہت دعائیں دیں)، یہ دعائیں کن کن زبانوں میں کی گئیں، حافظ لکھتے ہیں بالمغلی ثم بالترکی ثم بالفارسی ثم بالرومی ثم بالعربی۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ زبانوں پر ان کو قدرت تھی، ہفت زبان کا لفظ مسلمانوں میں مروج بھی تھا۔ دیکھو ج۲ ص۳۲

مولوی نصرت علی خاں دہلوی تخلص قیصر کے متعلق بھی اسی کتاب میں ہے۔

"علوم رسمی باستعداد حاصل نمود ماہر زبان فارسی و عربی و ترکی و انگریزی و ہندی ست" ص ۲۳۷

ان ہی مولوی نصرت علی کے والد مولوی ناصرالدین جو عیسائیوں کے ساتھ اپنے زمانہ میں چونکہ سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے، اس لیے لوگوں میں "امامِ فن مناظرہ" کے لقب سے مشہور تھے، کنیت ابوالمنصور تھی، ان کے متعلق بھی لکھا ہے "اکتساب علوم از والد ماجد و جد امجد خود نمودہ" جب عیسائیوں سے مناظرہ کی مہم سامنے آئی تو "تورات و انجیل بالتفسیر عبرانی و یونانی از علماء اہل کتاب خواندہ" ص ۲۳۲

مولوی نجف علی جھجھر کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خاں کے دربار کے مولوی تھے لکھا ہے کہ "پنجاہ رسائل بالسنہ خمسہ کہ دری و پاژندی و عربی و فارسی دارد و عبارت از آنست" تذکرۂ علماء ہند۔ ص ۲۳۶) جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی اُردو کے سوا دری اور پاژندی زبانوں کو بھی اُنہوں نے تحصیل علم کے بعد غالباً کسی پارسی عالم سے سیکھا تھا، حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ "شرح مقامات حریری بہ زبان عربی بصنعت اہمال تصنیف کرد" پوری حریری کی شرح غیر منقوط الفاظ میں کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب "دساتیر" کی ایک شرح "ویمزا" نامی پاژندی زبان میں اور "زبان سفرنگ" دری زبان میں لکھی تھی۔

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہِ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے سُنی تھی۔ اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے، اُنہوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کیے، اُس نے ملنے

کی خواہش ظاہر کی، وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں، مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا۔ وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کوشن کروہ کچھ مبہوت سا ہوگیا، اور مولانا کے ساتھ اُس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اُس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھونگا، کیونکہ مولانا کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہِ راست گفتگو کرنے سے پڑسکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمّٰی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی۔ کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جارہا ہے، ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی ۔ حضرت مولانا قاسم کے نقطۂ نظر کو تو آپ سُن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سربرآوردہ ہستی مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامت مدظلہ العالی کی ہے، النور میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہوتے رہتے ہیں ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حضرت والا کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے۔

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میر زاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں"

خیال کرنے کی بات ہے، کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امور عامہ میرزاہد کی لیکن حکیم الامۃ کا خیال یہی ہے، اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "کیونکہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہو اور اس کا بھی" یعنی وہی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ والی بات ہے، جامع ملفوظ نے اس ملفوظ کو

لہ صدحیف کہ شریعت و طریقت کا یہ آفتاب درخشاں ۱۹ - ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب میں غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ "یہ بات بڑی قوت سے فرمائی"

کیا دیوبند کے جن اکابر کا یہ نقطۂ نظر ہو، اگر بجائے امورِ عامہ اور صدرا و شمس بازغہ کے تمرینی اغراض کے لیے جدید علوم و فنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے اختیار کیا جائے ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعث اجر نہ ہوگا، جیسے بخاری کا پڑھنا باعث اجر ہے، بلکہ اس زمانہ میں علوم جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چونکہ اسلام کی خدمت کا موقع امورِ عامہ کے پڑھنے سے زیادہ مل سکتا ہے، اس لیے یقیناً اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا،

اور واقعہ یہ ہے کہ "استاذ اساتذۃ الہند، مسند الدیار الہندیہ فی الحدیث خصوصاً جماعت دیوبندیہ کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ۔ کے متعلق جب ان کے ملفوظات طیبہ میں خود ان ہی کی زبانی یہ روایت درج کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبری (حبرو) زبان کا جاننے والا کوئی فاضل شاہ صاحب کے زمانہ میں دلی آگیا تھا، حالانکہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ اور خود مرجع انام بنے ہوئے تھے۔ لیکن باوجود اس کے حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ

فاضلے از اکابر علماء آمدہ از و تحقیق توریت بلسان عبری می کردم" ملفوظات عزیزیہ[۲۲]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے براہِ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اس فاضل سے پڑھی تھی، جامع ملفوظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "چنانچہ چند آیات او (توریت) مع ترجمہ ارشاد فرمود[۲۲]" اس آیت کو بھی عربی خط میں جامع نے نقل کیا ہے لیکن کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ امید نہیں الفاظ صحیح ادا ہوئے ہوں۔

بہرحال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے عبری زبان سیکھی تھی، پھر جن کے پیشواؤں نے عبری سیکھی تھی اگر ان ہی کے پس روؤں نے انگریزی سیکھنے کا عزم بالجزم حج سے واپسی کے بعد باوجود معمر ہونے کے اگر کر لیا ہو، تو کیا تعجب ہے؟ واقعات تو یہ ہیں

لیکن اب ان کو کیا کہیے جنہوں نے ان ہی مولویوں کی طرف انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کے فتوے کو اس طرح منسوب کیا کہ گویا وہ کوئی واقعہ ہے۔ خیر ایک ضمنی بات کا تذکرہ چھڑ گیا، میں اسلامی عہد کے اس دستور کا ذکر کر رہا تھا کہ عمر کی کوئی قید تحصیل علم کے لیے نہ تھی، ابوالفضل جیسے سربھرے آدمی کے متعلق ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ شیخ حسن علی موصلی جو شاہ فتح اللہ کے شاگرد تھے ان سے "چند گاہ شیخ ابوالفضل نیز خفیہ از تعلیم فنِ ریاضی و طبعی و سائر اقسام حکمت گرفت، و دقائق خوامض علوم را از و کسب کرد" (ص ۳۶۷ ج ۳) خفیہ غالباً اس لیے پڑھائی ہوتی ہوگی کہ اکبر کو تو ابوالفضل نے یہ باور کرایا تھا کہ ان کے والد جامع معقول و منقول نے سب کچھ گھول کر اس کو پلا دیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور ریاضی میں یا تو خود ملا مبارک زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے یا ابوالفضل کو ان سے پڑھنے کا موقعہ نہ ملا تھا، خود ملا عبدالقادر نے اپنے متعلق بھی لکھا ہے کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے بھتیجے میر تقی سے "فقیر پارہ از بست باب اسطرلاب پیش او گزرانید۔ ص ۲۹۲ ج ۳) حقیقت یہ ہے کہ اطلبوا العلم من المہد الی اللحد پر مسلمانوں کا عمل زبانی حد تک نہیں تھا، اور جب قوموں کے اقبال و عروج کا زمانہ ہوتا ہے تو ان میں یہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے خود ان انگریزوں کا کیا حال تھا جو شروع شروع ہندوستان آئے، ان میں کتنے تھے جو عربی و فارسی سنسکرت ہندوستان کے مولویوں اور پنڈتوں سے سیکھتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں پڑھ لکھ لینے یا فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اب کچھ نہیں سیکھا جا سکتا، جو کچھ پڑھنا تھا پڑھ چکے بلکہ ایک طبقہ ہمیشہ ایسے لوگوں کا نظر آتا ہے، جس نے ضرورت کے وقت نہ عمر کا خیال کیا، اور نہ وقت کا، دھن بندھی اور کام میں لگ گئے، حیدرآباد میں ایک اہل حدیث مولوی زین العابدین[1] نامی رہتے تھے

---

[1] پندرہ سولہ سال ہوئے وظیفہ حسن خدمت لے کر آرہ اپنے وطن گئے اور چند سال بعد انتقال کر گئے، عجب مزاج کے آدمی تھے جو دھن بندھ گئی کر گذرتے تھے، خط پاکیزہ تھا جار دل کی کتابیں نقل کر کے کتب خانہ آصفیہ میں داخل کیں تہذیب التہذیب ابن حجر کی بارہ جلدیں میں مولانا کے ہاتھ کی کتب خانہ میں موجود ہے۔

وطن آرہ شاہ آباد (بہار) تھا، اسکول میں عربی کے معلم تھے، اپنا قصہ مجھ سے خود بیان فرماتے تھے کہ علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد طب پڑھ کر چھپرہ میں میں نے مطب شروع کیا، کسی مریض کے پاس گیا ہوا تھا، ایک ڈاکٹر بھی اس عرصہ میں بلایا گیا، مجھے دیکھ کر میرے منہ پر اس نے تیمارداروں سے کہا کہ اس نے مرض کی کیا تشخیص کی ہے، جو میری تشخیص تھی میں نے بیان کی جس پر ہنسا اور میری ناواقفیت کا اُس نے مضحکہ اُڑایا۔ مجھے اس کی یہ حرکت اتنی ناگوار گذری کہ مریض کے گھر سے مطب آیا، اسی وقت مطب کو بند کر کے میں نے کلکتہ کا ٹکٹ لیا، وہاں انگریزی شروع کی، انٹرنس پاس کیا، مقصود یہ تھا کہ اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اس ڈاکٹر کو جواب دونگا، اب یہ محفوظ نہ رہا کہ ڈاکٹری بھی انھوں نے پڑھی یا نہیں، لیکن اسی جھونک میں انٹرنس تک انگریزی تو پڑھ ڈالی

سب سے عجیب چیز جو ہندُستانی علماء کی بلند ہمتیوں کے سلسلہ میں مجھے نظر آتی ہے وہ قرآن مجید کے حفظ کے ساتھ ان کا تعلق ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو بچپن میں قرآن کے یاد کرنے کا موقع نہ مل سکا، اور آخر عمر میں خیال آیا کہ قرآن یاد کرنا چاہیے، ایک نہیں آپ کو بیسیوں مثالیں اس کی ملینگی کہ کمر کس کر بیٹھ گئے، اور حافظ بن کر اُٹھے، مولانا آزاد نے میر محب اللہ بلگرامی کے ترجمہ میں لکھا ہے:۔

"در عنفوان جوانی ذوق حفظ کلام ربانی بہم رسانید بر بالاخانہ خود نشستہ در عرصہ شش ماہ قرآن را یاد کرد" (ص ۱۲۸)

مشہور مدرس و محشی مولانا معین الدین کڑوی کے متعلق تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے:

"با واسط عمر خود باوجود کثرت درس حفظ قرآن مجید کردہ" (ص ۲۲۹)

انبیٹھی (اودھ) کے ایک بزرگ شیخ احمدی فیاض[1] تھے، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

---

[1] مولانا احمدی فیاض بھی ہندوستان کے اُن علماء میں ہیں جن کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے "تفسیر و حدیث و سیر و تاریخ خوب می دانست و اکثر کتب متداولہ را از بر داشت"

"بسیار ضعیف و مسن شدہ چنانچہ قوت رفتن و گشتن نداشت" اسی حال میں "آن کبیر سن بر بستر بیماری ع عب افتاد و قرآن مجید را در یک سال حفظ گرفتہ" (ص ۸۳)

وہی مولانا فضل حق خیرآبادی جنہیں شطرنج کھیلتے ہوئے مولوی رحمان علی نے دیکھا تھا جب شاہ دھومن (دہلوی) سے مرید ہو کر تائب ہوئے تو ان کے تذکرہ میں لکھا ہے "قرآنِ مجید در چہار ماہ یاد گرفت" (ص ۱۶۴)

اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ لاہور کے مولوی روح اللہ صاحب جو "در صرف و نحو منطق و معانی و حدیث و تفسیر ثانی نظیر نداشت" جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو "بسی [۳۰] روز بماہ رمضان شریف قرآنِ مجید حفظ کرد" ص ۶۶ انتہا اس ذوق کی یہ ہے کہ اورنگ جہاں بانی پر جلوہ افروز ہونے

یہ رواج ہندوستان میں اتنا چلا ہوا نظر آتا ہے کہ صرف اسی پر ایک مستقل مقالہ لکھنے والے چاہیں تو تیار کر سکتے ہیں، ہمارے عہد میں بھی جامعہ عثمانیہ کے سابق پروفیسر مولانا عبدالحیی مرحوم نبیرۂ مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جو شاہزادگان آصفی کے اُستاد بھی تھے پچاس سال کی عمر کے بعد حفظ قرآن میں مشغول ہوئے، اور تراویح سنا کر بلکہ دوسرے سال تراویح پڑھتے ہوئے طاعون میں مبتلا ہو کر مولانا نے درجہ شہادت حاصل کیا، حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی سے ارادت و خلافت کا تعلق رکھتے تھے، حضرت الاستاذ مولینا مولانا شبیر احمد عثمانی (صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے بھی قریب قریب پورا قرآن حال ہی میں یاد فرمایا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی سن کہولت ہی میں قرآن کو محفوظ فرمایا ہے، جیل خانوں کی زندگی میں حضرت والا کا سب سے بڑا مشغلہ یہی اشتغال بالقرآن رہتا ہے، اور پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے اکابر اساتذہ سے ہی غالباً یہ بات میرے کانوں میں پہنچی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا

[۱] بعد کو تذکرہ رحمانیہ یعنی قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں بحمداللہ یہ الفاظ بھی مل گئے "ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم، حج بیت اللہ کو تشریف لیجا رہے تھے۔ جہاز میں ماہ رمضان المبارک آگیا مولانا ممدوح نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا، اور وہیں مقتدا تراویح یاد کر کے رات کو سنا دیتے تھے" (ص ۱۲۲)

محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اس وقت یاد کیا، جب حج کے ارادہ سے آپ جہاز
پر سوار ہوئے۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ جہاز ہی پر رمضان کا چاند دکھائی دیا، تراویح کا مطالبہ
ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو اسی جہاز میں مولانا کے ہم سفر تھے، اتفاقاً ان میں کوئی حافظ نہ تھا،
آخر مولانا ہی تیار ہو گئے روزانہ ایک پارہ یاد کر کے رات کو تراویح میں سُنا دیا کرتے تھے، اور
یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، حدائق حنفیہ میں مولوی غلام محیی الدین گوی جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے
ان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے والد نے تراویح سُننے کی ان سے خواہش کی انہوں
نے کہا کہ روزانہ ایک پارہ کا دور سن لیں تو سُنا سکتا ہوں، آخر یہی ہوا کہ روز ایک پارہ کا دور
جو صرف چاشت کے وقت کرتے تھے اور رات کو وہی پارہ سنا دیتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ معمر ہونے کے بعد قرآن کو یاد کرنے کا دستور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان
میں شروع سے جاری رہا ہے، اور سچ پوچھیے تو حفظ قرآن کے مسئلہ میں شاید سنت یہی عمل قرار
پا سکتا ہے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر ہے کہ چالیس کے بعد ہی قرآن یاد فرمایا صحابہ
میں بھی جو لوگ حافظ تھے کھلی ہوئی بات ہے کہ اس کا موقعہ معمر ہونے کے بعد ہی ان کو ملا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی ہندوستانی مسلمانوں کا حفظ قرآن کے ساتھ جو تعلق رہا ہے
اور اسی جذبہ کے زیر اثر بچپن میں قرآن یاد کر لینے کا جو ذوق شوق ہندی مسلمانوں کے ہر طبقہ
میں پایا جاتا ہے، اس کے لیے تو کسی تاریخی شہادت کی بھی حاجت نہیں، شاید ہی مسلمانوں
کی کوئی معقول آبادی ہو گی جس میں آپ کو ایک دو آدمی پورے قرآن کے حافظ نہ مل جائیں
پنجاب سے بنگال تک اور نیپال کی ترائی سے راس کماری تک جہاں کہیں مسلمان آباد
ہیں ان شاء اللہ آپ کو یہ کیفیت نظر آئیگی، امیر و غریب متوسط حال، ہر طبقہ میں یہ حالت
عام ہے۔ دلی جب مسلمانوں کی دلی تھی اُس وقت اس کا کیا حال ہو گا اس کا اندازہ حضرت شاہ
عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے ان کے ملفوظات میں ہے "شبے در
جامع مسجد شمار کردہ بودم سی و پنج (۳۵) جا تراویح مع الجماعت حفاظ می خواندند" ظاہر ہے کہ یہ اُس وقت

کا واقعہ ہے جب لال قلعہ کے باہر مسلمانوں کے بادشاہ کی بادشاہی باقی نہ تھی۔

خود اسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے صدر اعظم عالیجناب نواب سر حافظ احمد سعید خاں بالقابہ حفظ قرآن کی دولت سرمدی سے سرفراز ہیں۔ التزاماً ہر سال تراویح بھی سناتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جن دنوں آپ برطانوی حکومت کی طرف سے صوبجات متحدہ کے گورنر (حاکم اعلیٰ) تھے اُس زمانہ میں بھی گورنر ہاؤس (دار الحکومت) میں تراویح کے سلسلہ کو آپ نے برابر جاری رکھا، صرف یہی نہیں کہ سلطنت آصفیہ کے باب حکومت کے آپ صدر ہیں بلکہ بحمد اللہ چھتاری کی ریاست کے کابراً عن کابر اباً عن جد آپ کا خاندان والی چلا آرہا ہے اور اس وقت اس ریاست کے مالک آپ ہی ہیں!

اسی طرح ریاست ٹونک کے فرمانروائے حال نواب سعادت علی خاں اور ان کے پدر بزرگوار حافظ ابراہیم علی خاں خلیل مرحوم کو بھی حفظ قرآن کا شرف حاصل تھا اس فہرست کو اپنی معلومات کے لحاظ سے اگر بڑھاؤں تو غالباً چند اوراق نذر کرنے پڑینگے، وہی تاریخی مثال کیا کم ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ جیسا باجبروت وجلال بادشاہ جو گجرات، کاٹھیاواڑ، کوکن، خاندیس اور دکن کے ایک بڑے علاقہ کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ تاریخ گجرات میں اسی بادشاہ کے متعلق یہ واقعہ درج ہے کہ

"ایک روز رمضان میں حافظ قرآن کی بہت تعریف ہو رہی تھی خود (محمود بیگڑہ سلطان گجرات) کہنے لگا افسوس ہماری اولاد میں کوئی حافظ ہوتا تو ہم کو بھی جنت ملتی۔ شاہزادہ خلیل نے سُنا، یہ صاحب علم تھا، دل میں چوٹ لگی اُسی روز سے خفیہ طور پر حفظ شروع کیا آئندہ سال پہلی رمضان کو باپ سے کہا حکم ہو تو میں نماز تراویح میں تمام قرآن مجید سناؤں، سلطان بہت خوش ہوا اور معقول انعام دیا۔" (مرآۃ محمدی ص ۹۱)

ہندوستان کے نظام تعلیم کے متعلق جن اساسی امور کا تذکرہ مقصود تھا تقریباً وہ ختم ہو چکے ہیں لیکن چند ضمنی امور اور ایک اہم باب اس سلسلہ میں باقی ہے۔ اب میں اس کے متعلق

گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ان شاء اللہ اسی سے، وہ راز بھی منکشف ہوگا کہ ہندی مسلمانوں کا قرآن سے غیر معمولی والہانہ تعلق کیوں پیدا ہوگیا، کن تاریخی عوامل و موثرات کے تحت یہ چیز ہم میں پیدا ہوئی

علم کے ایک خطرناک پہلو کا قرآنی علاج

بات یہ ہے کہ عام حیوانات کے مقابلہ میں "الانسان" ایک تعلیمی حقیقت ہے، یعنی جن چیزوں کے علم سے خالی اور جاہل ہو کر پیدا ہوتا ہے، تعلیم کے ذریعہ سے ان کے جاننے کی صلاحیت آدمی ہی میں ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی پہلی نازل شدہ آیتوں میں قرأت (خواند) تعلیم بالقلم (نوشت) کا ذکر کرنے کے بعد

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ — سکھائی انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا

کی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اسی کے بعد ارشاد ہے :۔

کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی — خبردار! بلاشبہ انسان سرکش ہو جاتا ہے۔

"الانسان تعلیمی حقیقت ہے" پھر ایک تنبیہی کلمہ "کَلَّا" کے بعد فرمانا کہ "الانسان سرکش ہوجاتا ہے" ظاہر ہے کہ محض کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ جو مشاہدہ ہے اسی کا اظہار ہے، یعنی جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی جوں جوں آدمی میں صلاحیت بڑھتی جاتی ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اسی نسبت سے اس میں طغیان اور سرکشی کی لہریں بھی اُٹھنے لگتی ہیں، وساوس و شکوک، تنقید و اعتراض یہ قصے ظاہر ہے کہ جاہلوں اور کند دماغوں میں نہیں پیدا ہوتے، بلکہ یہ سارے عوارض علم کے ہیں، شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ دماغوں پر جتنا اچھا اثر جس تعلیم سے زیادہ پڑتا ہے اسی قدر اس تعلیم سے سرکشی اور طغیان کی تولید بھی زیادہ ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ علم کا بھی وہ خطرناک پہلو ہے کہ اس پہلو کی جانب سے معمولی غفلت ہمیشہ خطرناک نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے، تعلیم اور ایجوکیشن کے خلاف بعض لوگوں میں جو مخالفت پائی جاتی ہے، دراصل علم کے ان ہی طغیانی نتائج پر ان کی مخالفت مبنی ہے، خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

بہر حال مسلمانوں کو پہلی نازل شدہ سورت میں تعلیم کے اس خطرناک پہلو پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا، مجھے اس وقت دوسرے ممالک سے بحث نہیں لیکن ہندوستان کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ جس زمانہ سے اس ملک میں اسلامی تعلیم کا نظام قائم کیا گیا، اسی زمانہ سے آخر وقت تک جب تک زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیمی شعبہ بھی مسلمانوں کا برباد نہ ہوا تھا، یہ قرآنی نکتہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دماغی تربیت و اصلاح کے ساتھ ساتھ لزومی طور پر قلبی اصلاح کی طرف توجہ تعلیم کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشاندہی کر سکتے ہیں جس نے مدرسہ سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو، خود قرآن میں علم کے اس طغیانی پہلو پر چونکانے کے بعد

ان راہ استغنی (اس لیے آدمی سرکش ہو جاتا ہے) وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے

کے الفاظ سے اس سبب کو ظاہر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اہل علم میں یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے، گویا پڑھ لکھ لینے کے بعد آدمی یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اب میں خود سوچ سکتا ہوں، دوسروں سے مشورہ لینے کی مجھے کوئی حاجت نہیں، حق و باطل میں امتیاز میرا دماغ خود پیدا کر سکتا ہے، علم کا یہی استغنا، انسانیت کی موت ہوتی ہے، الغرض مرض (طغیان)، سبب مرض (استغنا کے بعد

ان الی ربك الرجعی (علاج اس طغیانی کا یہ ہے) کہ تیرے رب کی طرف واپسی ہو

کو اس طغیان کا واحد علاج بتایا گیا ہے، اسی قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل تھی کہ جن کے پاس ان کا رب تھا ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اپنی صحبت اپنی تربیت میں رکھ کر رجوع کرنے والے کو بھی اس کے رب کی طرف وہ پھیر دیتے تھے، اسی کا اصطلاحی نام پیری مریدی یا بیعت وصحبت تھا، قرآن کے بینات بتا رہے تھے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کی شکل اس عہد طی،

زندگی میں بنی آدم کے لیے یہی ہو کہ خداوالوں کی طرف پلٹا جائے ۔

فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون ۔ اور میرے راہنماؤں کی جس نے پیروی کی نہ اس کو اندیشہ ہو اور نہ وہ کڑھیگا ۔

کی وصیت اس وقت بھی کی گئی تھی جب آدم کو اس ہبوطی زندگی گذارنے کے لیے بھیجا گیا تھا، اور یہی اس وقت بھی کہا گیا جب آخری پیغام لانے والے نے پیغام سناتے ہوئے کہا ۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو ۔

اور قیامت تک کے لیے یہ منادی کردی گئی

واتبع سبیل من اناب الی اور پیچھے پیچھے چلو ان لوگوں کی راہ پر جو میری طرف جھک پڑے ہیں

جس زمانہ میں جس کی انابت رب کی طرف زیادہ ہوگی، اسی حد تک وہی اس کا زیادہ مستحق سمجھا جائیگا، کہ لوگ اس کی راہ پر چلیں، اسی کا رنگ اسی کا ڈھنگ اختیار کریں، ہمارے تعلیمی نظام کا آخری اختتامی جزء یہی چیز تھی، مدرسوں میں دماغوں کو بنایا جاتا تھا، اور خانقاہوں میں دلوں کو سلجھایا جاتا تھا اور تب جا کر وہ نتائج پیدا ہوتے تھے جن کی لفظی تعبیریں جو آج کتابوں میں پائی جاتی ہیں کچھ شاعرانہ رسمی باتوں سے زیادہ نگاہوں میں نہیں جچتیں، مثلاً ہندی علماء کے عام تذکروں میں مولانا آزاد ہی کے قلم سے بے ساختہ اس قسم کے الفاظ نکلتے چلے جاتے ہیں

خدادوست، دنیادشمن، دل بریاں، دیدۂ گریاں، زبانے لطیفہ، بیانے تحریر، بادجمع لطافت ونزاکت، باتمکین دوقار ورزانت، ظرافت طبع، القدس ذات جلائل صفات، یگانۂ روزگار، ہموارہ بیاد سلطان حقیقی، وغیرہ وغیرہ ۔

جس تذکرہ کو اٹھا کر دیکھیے عموماً ان میں کچھ اسی قسم کے ترشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے فقرے آپ کو ملتے چلے جائیں گے۔ پڑھنے والے ان الفاظ کو پڑھتے ہیں، چونکہ اب آنکھوں کے سامنے

سے وہ تماشا غائب ہو چکا ہے، اس لیے مجبور ہیں، کہ پرانے زمانہ کی انشاء کا اسے ایک اسلوب خاص قرار دے کر آگے نکل جائیں۔

مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ دماغ کے ساتھ جب کبھی "دل" کی تربیت کا سامان کسی نظامِ تعلیم میں کیا گیا ہے، تو مذکورۂ بالا الفاظ کے سوا ان کے نتائج کے اظہار کی کوئی دوسری صورت ہی نہیں ہے، بلکہ اصل حقیقت جیسی کہ چاہیے پھر بھی سامنے نہیں آتی

بہرحال انابت الی اللہ اور ہر طرف سے ٹوٹ کر خدا ہی کے قدموں پر جھک جانے والوں کا اصطلاحی نام "صوفیہ"[1] اور ان کے علمی و عملی نظام کا نام "تصوّف" تھا، دستور تھا کہ رسمی علوم سے فارغ ہونے کے بعد لوگ اسلام کے اسی طبقہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، اور اپنی اپنی مناسبتوں کے لحاظ سے ان بزرگوں میں سے کسی کو نمونہ بنا کر ان کی صحبت اور ان کی نگرانی میں زندگی گذارتے تھے، علمی شکوک اور ذہنی شبہات کے گرد و غبار سے دماغ جو بھر جاتے تھے اس کی شست و شوان ہی ہستیوں کی رفاقت اور تجیت میں میسر آتی تھی، یقین و ایمان کی برفانی سلوں سے جن کے سینے معمور تھے وہ اپنی خنکیوں کو دوسروں تک منتقل کرتے تھے کردار کی استواری سیرت کا استحکام، دین کا وقار و جلال خود بخود ان مثالی نمونوں کو دیکھ کر لوگوں میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق پیدا ہو جاتا تھا اور اس وقت ملت کی صحیح رہنمائی کا استحقاق اہل علم کو حاصل ہوتا تھا۔

---

[1] اس قسم کی فضول بے معنی بحثیں کہ "صوفی" کا مادۂ اشتقاق کیا ہے؟ وہ مادہ عربی ہے کہ یونانی، میرے نزدیک غیر ضروری ہیں، الفاظ کچھ ہی ہوں نظر معنی اور مصداق پر رکھنی چاہیے۔ مسلمانوں نے، تو روزہ اور نماز جیسی عبادتوں کا ترجمہ عجمی الفاظ میں کر لیا ہے، کیا یہ دلیل ہوگی کہ یہ عبادتیں ایران سے حاصل کی گئی ہیں، کیونکہ یہ الفاظ عربی نہیں ہیں علماء رسوم کو عموماً ملّا یا منلا مختلف اسلامی ملکوں میں کہا جاتا ہے، اس لفظ کی اصل کیا ہے، کیا بودھ مذہب کے مذہبی پیشواؤں کو جو لامہ کہتے تھے اسی کی یہ معکوس شکل ہے؟ بالفرض اگر یہ ہو بھی تو کیا ہمارے علماء کے علوم بدھ مذہب کی کتابوں سے ماخوذ سمجھے جائینگے؟

ہندی تصوف اور ہندوستانی صوفیا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اس ملک میں تصوف اور صوفیا کی نمائندگی جو طبقہ کر رہا ہے، اُن کو دیکھ کر اسلاف کے متعلق رائے قائم کرنے والوں کو اگر کچھ مغالطہ ہو، تو یہ مغالطہ بے بنیاد نہیں ہے۔ لیکن جو حالات سے واقف ہیں ان کے نزدیک یہ اسی قسم کا مغالطہ ہے، جیسے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھ کر کوئی حقیقی اسلام یا پیغمبر اسلام علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کرام رضؓ کے متعلق غلط فیصلہ کر بیٹھے۔ مگر کیا کیجیے کہ آج یہی کیا جا رہا ہے، اسی کا نام ریسرچ اور تحقیقات رکھا گیا ہے، خصوصاً تصوف اور صوفیہ کے ساتھ تحقیقاتی بازی گروں کی ذہنی بازیچوں کا عجب حال ہے صوفیہ اور تصوف کی اہمیت کو گھٹانے کا جو فیصلہ کر چکے ہیں وہ اپنے اس طے شدہ فیصلہ کی تائید میں ایسی باتیں جمع کرتے ہیں جن سے ثابت ہو جائے کہ ہندو جوگیوں اور فلسفہ ویدانت کے زیر اثر ایک خاص قسم کی راہبانہ زندگی بعض مسلمانوں نے جو اختیار کی، اسی کا نام تصوف ہے ورنہ اسلام کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا اگرچہ اس کا بھی کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اس ملک میں آکر ہندی اور بھاشا میں شاعری کی، بعضوں نے سنسکرت سیکھی بعضوں نے یہاں کی موسیقی اور موسیقی کے لوازم سیکھے، اسی طرح یہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے ہندوؤں کے یوگا کو بھی سیکھا ہو، جس کی یوں تو بہت کچھ تعریف کی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے انسان میں غیر معمولی روحانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے، لیکن اگر پھلوں کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کی کوشش کی جائے تو ہم مذہبی اور دینی حیثیت سے تو ہندوستان کے اس یوگا، جوگ گیان دھیان اور خدا جانے کیا کیا کا نتیجہ یہی دیکھتے ہیں کہ ننانوے فیصدی مخلوق اس ملک کی انتہائی مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہے، اور پتّے پتّے اندر باہر اس ملک کے عوام ہی کیا، اکثر و بیشتر خواص کے نزدیک بھی سارا ہندوستان اور اس کی فضا صرف بھوتوں اور

پرستیوں سے بھری ہوئی ہے، ٹوٹکے، فال، بدشگونی، جنتر منتر، جوتش ان ہی چیزوں پر یہاں کے عام باشندوں کی زندگی کا دارومدار ہے، توحید خالص کا وہ نظریہ جس کا انتساب ویدانت والوں کی طرف کیا جاتا ہے، اس کا کوئی اثر اس ملک کے رہنے والوں پر نظر نہیں آتا، پھر وہ کیا خاک روحانیت ہوئی، جو لوگوں کو درختوں اور پتھروں، سانپوں، بچھوؤں کے آگے جھکنے سے بھی روک نہ سکی، روحانی طاقت کا سب سے بڑا استعمال اگر ہو سکتا تھا، تو ان ہی بے بنیاد اوہام کی صفائی ہو سکتا تھا، اس میں جس حد تک یہ ملک ناکام ہے سو ظاہر ہے؛ یہ نہ ہو سکتا تھا، تو جن روحانی قوتوں کی لن ترانیاں ان کے مداحوں کی طرف سے سننے میں آتی ہیں، کاش! اس کا یہی اثر ہوتا کہ اپنی ان روحانی قوتوں سے باہر سے آنے والی مادی قوتوں ہی کا مقابلہ کیا جاتا۔ سو اس کا حال بھی ظاہر ہے کہ باوجود رشیوں منیوں، گیانیوں اور دھیانیوں کے یہ مسکین ملک ہمیشہ بیرونی قوموں کی چراگاہ کا کام دیتا رہا، مسلمانوں سے پہلے بھی مسلمانوں کے زمانہ میں بھی، مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل جانے کے بعد بھی اسی حال میں اب تک گرفتار ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان مجاہدات و ریاضات کا آخر حاصل کیا ہوا۔ اگر مداریوں کے چند تماشوں کے دکھانے کی قدرت ان سے پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بیچارے مداریوں اور نٹوں کو کیوں ذلیل سمجھا جاتا ہے؟

بہرحال مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ اس قسم کے اعمال و اشغال ہندوؤں اور ان کے جوگیوں میں ضرور پائے جاتے ہیں جن سے کچھ نادرہ نمائیوں کی قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے۔

لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ ہندوستان کے اسلامی صوفیا کی طرف جو یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جوگیوں سے چیزیں سیکھی تھیں آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ ہمارے بزرگوں کے حالات سوانح عمریاں موجود ہیں، کم از کم صوفیائے ہند کے مشاہیر اکابر کی زندگی تو سب کے سامنے ہے کیا کوئی ایک دو فقرے ہی نکال کر بتا سکتا ہے جن سے اس دعوے

کے کسی پہلو پر کوئی روشنی پڑسکتی ہو، ہندوستانی صوفیوں میں سب سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز طبقہ اصحاب چشت کا ہی چشتی سلسلہ کے بزرگوں میں خواجہ بزرگ اجمیریؒ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فرید الحق والدین شکر گنجؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الاولیاؒ وغیرہم حضرات ہیں، ان میں سے بتایا جائے کہ کس بزرگ کو جوگیوں کی صحبت حاصل ہوئی ہو

اور بزرگوں کی تو کوئی معتبر کتاب نہیں پائی جاتی ہی لیکن فوائد الفواد کے متعلق تو کوئی شک نہیں کرسکتا کہ حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات اور ان کی نظر سے گذری ہوئی کتاب ہی، افسوس ہو کہ لوگ اس زمانہ میں اس قسم کی کتابیں پڑھتے نہیں، یا پڑھتے ہیں تو سوچتے نہیں، ورنہ اسی کتاب سے لوگوں کو اندازہ ہوسکتا تھا کہ ان بزرگوں کا ہندستان کے جوگیوں سے کس قسم کا تعلق تھا، اور اس طبقہ کا ذکر وہ کن الفاظ میں فرماتے تھے، جامع ملفوظات نے لکھا ہو کہ سلطان المشائخ ایک دن شیخ صفی الدین گازرونی کا ذکر فرما رہے تھے کہ ان کی خدمت میں ایک جوگی آیا اور بڑے بڑے دعوے کرنے لگا، شیخ گازرونی کو مخاطب کرکے بولا "بیا قدم بنما" آؤ اپنا مقام یا اپنی کرامت دکھاؤ، شیخ گازرونی نے جواب میں فرمایا کہ "دعوی تو می کنی تو قدم بنما" جوگی قدم نمائی کا اظہار "از زمین بر ہوا برآمد" سے کرنے لگا، یعنی زمین سے معلق ہوکر "ہوا میں تھرتھرانے لگا" اور چند منٹ کے بعد زمین پر اتر کر شیخ گازرونی سے بھی اسی تماشے کا مطالبہ کرنے لگا، اب یہی مقام سوچنے کا ہو اگر اسلامی صوفیا کو بھی اسی قسم کی کوئی مشق ہوتی تو ظاہر ہو کہ وہ بھی بازوؤں کو پھڑپھڑا کر ہوا میں اڑنے لگتے، لیکن شیخ گازرونی نے اس تماشے کو دیکھ کر کیا کیا ؟ سلطان المشائخ فرماتے ہیں،

"شیخ صفی الدین گازرونی روئے سوئے آسمان کرد وگفت خداوندا! بیگانہ را ایں قدم دادہ مرا ہم ایں معنی کرامت کن"

یعنی عین وقت پر اب ان کو کرامت کی تلاش ہوتی ہو، اپنے مالک سے التجا کرتے ہیں کہ ہم نے تو یہ ورزش کبھی کی نہیں اب ایک بیگانہ آپ سے ناآشنا برسر جدل آمادہ ہو آپ ہی اپنے بندے کی مدد کیجئے

بہرحال کہا جاتا ہی کہ شیخ کو بھی حق تعالیٰ نے قوت طیران عطا فرمائی، اور ایسی قوت کہ جوگی بھی دیکھ کر حیران ہوگیا، کیونکہ جوگی کو لے دے کر بس اتنی ہی مشق تھی کہ سیدھے ہوا میں جائے اور پھر اسی خط مستقیم پر واپس آجائے، ادھر اُدھر نہیں جا سکتا تھا، لیکن شیخ گازرونی کا طیران مشق کا نتیجہ تو تھا نہیں وہ تو

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیوٰة الدنیا ویوم یقوم الاشھاد (مومن) ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا والی زندگی میں اور جب گواہ پیش ہونگے۔

کے وعدے کا ایفا اپنے اس مالک سے چاہتے تھے جس پر وہ ایمان لائے تھے اور اس کی نصرت جس بندہ کو حاصل ہو جائے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، ہوا یہ کہ

بعد ازاں شیخ (گازرونی) از جائے برآمد جانب قبلہ طیران نمود، از انجا بجانب شمال شد، باز طرف جنوب، باز بہ مقام خود نشست" (ص ۵۰ فوائد الفواد)

یہ الگ بحث ہی کہ ایمان والوں کے ساتھ اس "الحیوٰة الدنیا" میں حق تعالیٰ کی نصرت کا ظہور اس شکل میں ہو سکتا ہی یا نہیں، اس سے قطع نظر کیجیے بلکہ یہ دیکھیے کہ اس قصہ کے بیان کرنے والے کے متعلق کیا ادنیٰ شبہ بھی ہو سکتا ہی کہ وہ جوگیانہ کرتبوں سے واقف تھا، یا اس کی نگاہ میں ان جوگیانہ اعمال و افعال کی کچھ وقعت تھی، ایک سیدھا سادہ مسلمان ان جوگیانہ اعمال کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا خیال رکھ سکتا ہی، جو اس قصہ میں ظاہر کیا گیا ہی، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہی کہ جن ہندی صوفیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہی کہ جوگیوں سے انہوں نے یوگا، اور جوگ کا فن سیکھا تھا، وہ کون لوگ ہیں، سلطان المشائخ کا شمار اگر ہندی صوفیوں میں نہیں ہی تو کن کا ہی۔

کس قدر بات الٹی بیان کیجاتی ہی، جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہی، واقعہ یہ ہی کہ خود ان اسلامی بزرگوں کے روحانی تقدس وجلال کو دیکھ کر پہلے بھی اور اب بھی جوگیوں میں سے بعض لوگ اسلامی بزرگوں کی خدمت میں "درشن" ہی کی نیت سے سہی مگر آمد و رفت رکھتے

تھے، اور بسا اوقات اپنے دوسرے دیوتاؤں میں اس بزرگ کو بھی دیوتا بنا کر شریک کر لیتے تھے یہ اس قوم کی پرانی عادت ہی، ہندوؤں میں جو لوگ "انگریزی قومیت" کے زہریلے اثر سے پاک ہیں، وہ اسلامی بزرگوں کا اب بھی احترام کرتے ہیں، حضرت سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہی کہ شیخ کبیر بابا شکر گنج کی خدمت میں جب وہ تشریف رکھتے تھے تو کبھی کبھی باباصاحب کی مجلس میں "رمنے جوگی" بھی وہی "درشن" یا تبرک حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے، سلطان جی نے حضرت کے دربار کی یہ خصوصیت بیان کی ہو۔

بخدمت[1] شیخ الاسلام فریدالدینؒ از ہر جنس درویش وغیراں برسیدے" (فوائد ص ۵۱)

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا، کبھی کبھی ان جوگیوں سے آپ باتیں بھی کر لیا کرتے تھے، لیکن کس قسم کی باتیں، ایک دو نمونے ان کے بھی سن لیجیے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ جن بزرگوں کا نام "ہندوستانی صوفیا" ہی ان کا تعلق ان بیچارے جوگیوں سے کیا تھا، سلطان المشائخ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

"وقتے بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین بودم قدس اللہ سرہ العزیز آنجا جوگیے حاضر بود"

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی مجلس میں اس کا ذکر چھڑا کہ بعض بچے فطرۃً نالائق اور ناہموار، بے ذوق پیدا ہوتے ہیں، اس پر جوگی نے اپنے جوگیانہ علم کا اظہار کیا کہ اس کی وجہ یہ ہی "مردمان وقتِ مباشرت نمی دانند" اور اس کے بعد کہنے لگا کہ دراصل بعض مہینے تیس دن کے ہوتے ہیں اور بعض مہینے انتیس دن کے۔

"و ہر روز را خاصیتے ست مثلاً اگر روز اول مباشرت کنند فرزند چنیں آید اگر روز دوم کنند چنیں باشد، الغرض ہر روز را حکم بیان می کرد"

سلطان المشائخ کی جوانی کا زمانہ تھا، جوگی کی یہ عجیب بات انہیں پسند آئی، اور آپ نے جوگی

---

[1] اس کا ذکر آپ نے آزاد قلندروں کے سلسلہ میں کیا ہی کہ حضرت زکریا ملتانی کے یہاں اس قسم کے بے قید فقیروں کو راہ نہیں ملتی مگر بابا فرید کے یہاں سب ہی طرح کے فقرا، "وغیراں" سے جوگی وغیرہ مراد لیے جاتے رہتے تھے۔

کی بتائی ہوئی تاریخوں اور ہر تاریخ کی جو خاصیت اُس نے بیان کی تھی، اُس کو دُہرا کر جوگی سے پوچھا کہ تم نے یہی بتایا تھا؛ حضرت بابا صاحب جوگی اور سلطان المشائخ کی باتیں سُن رہے تھے جب دیکھا کہ سلطان المشائخ ان تاریخوں کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو بولے۔

"تو ازیں چیزہا چہ می پرسی ترا ہرگز بکار نخواہد آمد" (ص ۲۴۶)

ایک کشفی اشارہ تھا کہ آپ کی زندگی مجردانہ گذریگی، سو گذری۔ مجھے یہ کہنا ہی کہ ان جوگیوں سے اس زمانہ میں جو باتیں ہوتی بھی تھیں تو اسی قسم کی، ایک اور قصہ اسی فوائد الفواد میں سلطان المشائخ ہی کی زبانی مروی ہی، نصیر نامی ایک طالب العلم کا قصہ آپ نے بیان کیا کہ وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں بیعت کے بعد سر کے بال بڑھا رہا تھا، گویا کاکل بنانے کا ارادہ تھا۔ اتفاق سے ایک جوگی پھر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ "آں متعلم (نصیر) ازاں جوگی پرسیدن گرفت کہ موئے سر از چہ دراز شود" سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھے اس طالب العلم کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری، گویا اس ذریعہ سے بال بڑھا کر وہ زور پھیلانا چاہتا تھا، میں نے اس قصہ کو اس لیے نقل کیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں مسلمان عموماً ان جوگیوں سے اگر پوچھتے بھی تھے تو اسی قسم کی باتیں، کہ سر کے بال کن دواؤں سے بڑھتے ہیں، ہم بستری کی اچھی تاریخیں جن میں اچھے بچے پیدا ہو سکتے ہوں کیا ہیں۔ اور خدا جانے ان باتوں کا بھی علم ان جوگیوں کو ہوتا ہی یا نہیں لیکن بہرحال اپنے آپ کو وہ ان ہی چیزوں کا جاننے والا پہلے بھی مشہور کرتے تھے اور اب بھی سنیاسی جوگی وغیرہ کا یہی کام ہی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہی کہ ان جوگیوں سے اگر کسی بزرگ نے کوئی بات پوچھی بھی ہی تو اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ اب آپ ہی خیال کیجیے کہ فوائد الفواد جو متوسط تقطیع پر ڈھائی سو صفحات کی کتاب ہی، اور اس میں تقریباً آپ کی سیکڑوں مجلسوں کی پوری گفتگو من وعن درج ہی، بمشکل ان سارے ملفوظات میں یہی چند مقامات ہیں جہاں جوگی کا ذکر آیا ہی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی گفتگو کا تعلق بھی ان امور سے ہی جن کا اہتمام ان بزرگوں کے سر اس زمانہ میں تھوپا

جارہا ہے، صرف ایک مقام اور ہے جس میں اجودھن ہی کا ایک اور واقعہ جوگی کے متعلق حضرت سلطان المشائخ نے بیان فرمایا ہے، اور وہ یہ ہے آپ نے فرمایا کہ "من وقتے بخدمت شیخ کبیر در اجودھن بودم جوگیے بود بیآمد" اور اس سے میرے اس دعوے کی توثیق ہو رہی ہے کہ خود یہ جوگی ان بزرگوں کی خدمت میں کبھی کبھی استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے[1]۔

بہرحال حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ "من از وے پرسیدم کہ شما کدام راہ می روید و اصل کار در میانِ شما چیست" آپ دیکھ رہے ہیں کہ سوال کا لہجہ کیا وہی نہیں ہے جو آج بھی جب کبھی ملنے جلنے والے پوچھیڑی ہندو یا سادھو سے کسی مسلمان کی ادھر اُدھر ریل پر یا کسی مقام پر ملاقات ہو جاتی ہے، تو عموماً تفنن طبع کے لیے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی! تم لوگ کیا کرتے ہو، جوگی نے جواب دیا، سلطان المشائخ نے اسے بھی فرمایا ہے۔

او (جوگی) گفت در علم ما ہمچنیں آمدہ است کہ در نفس آدمی دو عالم است یکے عالم علوی و دوم عالم سفلی از تارک (چندیا) تا ناف عالم علوی ست، و از ناف تا قدم عالم سفلی است'

یہ انسانی نفس کی تقسیم ہوئی، آگے اُس نے کہا کہ

سبیل کار آن ست کہ در عالم علوی ہمہ صدق و صفا و اخلاق خوب و حسن معاملہ باشد، و در عالم سفلی نگہداشت و پاکی و پارسائی۔

مطلب جوگی کا یہ تھا کہ ناف کے اوپر جتنے اعضا ہیں، مثلاً دل ہے، آنکھیں ہیں، زبان ہے، دماغ ہے، کان ہیں، زیادہ تر اخلاقی اعمال کا ان ہی سے تعلق ہے، اور ناف کے نیچے جو اعضا ہیں عفت و پارسائی، پاکی وغیرہ کا ان ہی سے تعلق ہے، ایک اچھی تقسیم تھی جو جوگی نے بیان کی

[1] اسلامی صوفیۂ ہند کے پاس جوگیوں کی آمد و رفت استفادہ کے لیے ہوتی تھی چاہا جائے تو اس کے متعلق ایک الگ مضمون تیار کیا جا سکتا ہے بخوف طوالت میں نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ورنہ دلچسپ باتیں سُننے میں آتیں کم از کم ثمرۃ الفوائد نامی کتاب جو حضرت شاہ بھیک قدس سرہ کے حالات میں ہے مطالعہ کیجیے۔ بیسیوں واقعات اس سلسلہ کے آپ کو ملینگے ۱۲۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں۔ "مرا این سخن او خوش آمد"

آپ خیال کرسکتے ہیں کہ جن بزرگوں کا سارا سرمایہ جوگ ہی سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے، کیا وہ اس ندرت کے ساتھ جوگی کی ایک اچھی شاعری کا داد کے ساتھ تذکرہ کرسکتے ہیں۔

کبھی مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان جوگیوں، سادھوؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد ہی میں منقول ہے، امیر حسن علا فرماتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کی تنخواہ (مواجب) جس کی وجہ انھوں نے نہیں لکھی ہے رک گئی تھی۔ توقف مواجب دلتنگی بود" مجلس مبارک میں حاضر ہوا، کسی بزرگ کے حوالہ سے حضرت نے یہ قصہ بیان کیا کہ کسی شہر میں" برہمنے بود مال بسیار داشت" شہر کا والی کسی وجہ سے برہمن سے بگڑ گیا، اور جو کچھ اس کے پاس تھا سب کی ضبطی ہوگئی، غریب برہمن ولنے والے کو محتاج ہوگیا۔ ایک دن جارہا تھا، راستہ میں کسی دوست سے ملاقات ہوئی اُس نے حال پوچھا برہمن نے کہا" نیکو وخوش می گذرد" یعنی خوب گذر رہی ہے، دوست نے کہا ہر چیز تو تمہاری چھن گئی" خوشی ترا از کجا ست" جواب میں برہمن کا یہ فقرہ زنار من با من ست" میرا جنیو تو میرے ساتھ ہے، امیر حسن کہتے ہیں کہ اس فقرہ نے میرے دل کو ہلکا کردیا۔ خیال یہی ہوا کہ از توقف مواجب نایافت اسباب دنیا ہیچ غم نمی باید خورد اگر ہمہ جہاں برود بارے نیست محبت حق می باید کہ برقرار باشد بندہ تقریب آں تقریر ہمیں تصور کرد (ص ۵۶)

عبرت دلانے کے لئے اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات میں بھی ہے حضرت فرماتے ہیں کہ ایک تارک الدنیا سادھو در راجگیر رسیدہ بود" راجگیر اس مقام کا نام ہے جہاں حضرت والا ریاضت و مجاہدہ میں ایک مدت تک مشغول رہے تھے۔ چند پہاڑیاں ہیں جن سے گرم اور سرد چشمے تا یادگار زمانہ سے اُبلتے رہتے ہیں، ایک گرم چشمہ اس وقت تک مخدوم کنڈ کے نام سے حضرت والا کی طرف منسوب ہے موجودہ قصبہ بہار سے بجانب مغرب جنوب راجگیر کی یہ پہاڑیاں ہیں، بہرحال حضرت فرماتے ہیں کہ سادھو" بتے از سنگ

تراشیدہ از دست چپ گرفتہ استادہ ناخنہا چناں بزرگ شدہ کہ گرد بہ گرد دست پیچیدہ" الغرض اس بت کو مٹھی میں دبائے یہ جوگی سالہا سال سے یونہی کھڑا ہوا تھا "استنجا بہ پا می کرد" ناگاہ ایک دن مٹھی کھل گئی، بت گر گیا، حضرت کا چشم دید واقعہ ہے کہ سادھو "بہ نشست،" کھڑا تھا بیٹھ گیا و آغاز کرد کہ "من چندیں سال ترا پیش نظر می دارم و از عشق و محبت تو ہمہ را ترک دادہ ام اکنوں اگر تو مرا دوست داشتی از من جدا نمی شدی پس ہرگاہ مرا دوست نمی داری مرا زیستن نہ شاید در حال کاردے بستد ہمانجا حلق خود را بہ برید" اور مر گیا، مخدوم نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا "ہندوے در محبت سنگ پر کالہ ایں چنیں می کند مومن در دین حق اگر ایں چنیں کند چہ عجب" (ص ۲۷۵ معدن المعانی) خلاصہ یہ ہے کہ ان جوگیوں کا ذکر جن کی مجلسوں میں اس حیثیت سے آتا ہو، خیال کرنے کی بات ہے کہ ان ہی کے مسلک و مشرب کے کیا وہی لوگ پیرو ہو سکتے ہیں؟

واقعہ تو یہ ہے کہ بول چال کی عام زبانوں کے سوا جس کا مرکز ابوالفضل آئین اکبری میں دلی کو بتاتا ہے[1]، صوفیاء ہند کے اساطین و اکابر کا عموماً ہندوؤں کی کسی علمی زبان سے بھی واقفیت

[1] ابوالفضل نے آئین اکبری میں ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی اچھی تقسیم پیش کی ہے اس نے لکھا ہے کہ اس ملک کے لوگ "بغراواں زباں می سرائند" لیکن ان زبانوں میں جو اختلافات ہیں اُن کی نوعیت دو قسم کی ہے، اختلافات کی ایک شکل تو وہ ہے کہ باوجود اختلاف کے یہ اختلاف باہمی افہام و تفہیم میں مانع نہیں ہوتا یعنی ہر ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "آن اختلاف کہ از فہمیدگی یک دیگر باز ندارد از شمارہ بیروں" اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافات کا اگر خیال کیا جائے تو جیسا کہ تجربہ کاروں سے سننے میں آتا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، لیکن باوجود اس اختلاف کے جب باہم ایک دوسرے کی سمجھ لیتے ہیں تو ایک ہی زبان سمجھی جائیگی۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اختلاف کی وجہ سے ان مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے، اسی کا نام اس نے "اینچہ نیاز زند دریافت" رکھا ہے، اختلاف کی آخری قسم کو پیش نظر رکھ کر اکبر کے زمانہ میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کی تقسیم ان کے مختلف مقامی مرکزوں کے اعتبار سے بایں الفاظ کرتا ہے۔

دہلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹہ، کرناٹک، سند[9]، افغانستان، شال[11] (درمیان سند و کابل و قندہار است)، بلوچستان[12]، کشمیر[13]

جن زبانوں میں اس قسم کا اختلاف ہے کہ ان کے بولنے والے ایک دوسرے کی نہیں سمجھ سکتے، ابوالفضل کے حساب سے عہد اکبری میں ان کی تیرہ قسمیں تھیں، جن میں بارہ قسمیں ایک طرف، اور دلی کی زبان (باقی بر صفحہ ۶۰)

نہ تھی، ان پر یہ کتنا بڑا ظلم توڑا گیا ہے، کہ ان کی ساری زندگی کو ہندستان کے تصوف کا عکس قرار دیا جاتا ہے، میں تو اب تک یہی نہ سمجھ سکا کہ ہمارے بزرگوں کی طرف یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوؤں سے تصوف کا فن سیکھا تھا آخر اس کے ثبوت میں لوگ کہتے کیا ہیں؟ یا یونہی کسی نے بات ایک اڑا دی، اور بے سمجھے لوگوں نے اسے دہرانا شروع کیا، آخر کوئی بات تو مشترک پیدا کی جاتی، اتنا بھی یہ لوگ نہیں سوچتے کہ اُس زمانہ میں مسلمان اس ملک کے حاکم تھے، عام طور پر حاکم قوموں میں اپنی رفعت و بلندی کا جو شعور ہوتا ہے، وہ محکوم قوموں کی چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کب دیتا ہے، کسی چیز کی کس مپرسی کے لیے ہر زمانہ میں یہ بات کافی سمجھی گئی ہے کہ اس کا تعلق محکوم قوم سے ہے آج خود ہم مسلمانوں کا کیا حال ہے، ہماری محکومیت ہماری پوری زندگی کی تحقیر و توہین کے لیے کافی ہے، دوسروں میں نہیں خود اپنوں میں جب مسلمانوں کی وضع و قطع شکل و صورت آج جس نگاہ سے دیکھی جا رہی ہے اسی سے اندازہ کیجیے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کی کن چیزوں کی مسلمانوں کی نظر میں کیا قیمت ہوگی میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان صوفیہ نے سب کچھ ہندو سادھوؤں، اور سنیاسیوں سے اخذ کیا تھا، تو آخر جب اکبر نے اپنا رجحان ہندو مذہب کی جانب ظاہر کیا، تو اس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش وہی لوگ کیوں تھے، جن کا تعلق مسلمانوں میں طبقہ صوفیہ سے تھا۔

ملا عبد القادر ہوں، یا حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی، یہی لوگ تو اکبری دین کی مخالفت کے علمبرداروں میں ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں ہی صوفی المشرب ہیں، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر کچھ کہا بھی جا سکتا ہے، ملا عبد القادر کی تو پوری زندگی صوفیوں کی ہے، وہی مسلک وہی مشرب ہے، جو ہندستانی صوفی رکھتے تھے، لیکن اکبر کی مخالفت میں ان سے زیادہ بدنام کون ہے؛ اگر وہی خیال سچ ہوتا جیسے آج پھیلایا جا رہا ہے، تو ہندی صوفیوں کے تو دل کی بات تھی جسے اکبر بزور حکومت انجام دینا چاہتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ ص۵۹) ایک طرف جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بارہ علاقوں کے سوا ساری ہندوستان کی زبان اسی زمانہ سے ایک تھی، مقامی اختلافات سے اس زبان کی وحدت متاثر نہیں ہوتی تھی آج کل اسی کو ہم اردو کہتے ہیں جس کی صحیح تعبیر دراز فہمیدگی ایک

ہندوستان کے خواجگانِ چشت کا تصوف

بہرحال اب تک تو اس بے بنیاد، یا در ہوا بات کی تردید میں میں نے چند سلبی اور منفی قرائن کا ذکر کیا ہے، دراصل جس کا ذکر مقصود تھا، اب اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ یوں تو رفتہ رفتہ ان چھ سات صدیوں میں جب سے ہندُستان باضابطہ دارالاسلام بنایا گیا، مختلف زمانوں میں اسلامی تصوف کے مختلف سلاسل اور طرق کے اولیاء اللہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس سرزمین کو سرفراز فرماتے رہے، اور اب تو یہ واقعہ ہے کہ مشہور خانوادوں میں شاید ہی اب کوئی خانوادہ باقی ہوگا جس میں منسلک ہونے والے لوگ اس ملک میں نہ پائے جاتے ہوں، خصوصاً قادریہ اور نقشبندیہ اور اس کے بعد سہروردیہ سلسلوں نے اس ملک میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ پہلا قدم مبارک جس بزرگ کا ایک خاص شان آن بان سے اس ملک میں آیا وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے، آج ہی نہیں اسی صدی میں یہ اشعار تقریباً ہندی مسلمانوں کے گھر گھر میں پڑھے جاتے تھے۔

انجاکہ بود نعرۂ فریاد مشرکاں   اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر ست

سمجھا جاتا تھا کہ یہ خواجہ بزرگ کی قدموں ہی کی برکت کا نتیجہ ہے۔

پس میں اب بتانا چاہتا ہوں کہ صوفیہ کے جس طریقہ کا نام طریقۂ چشتیہ ہے اور جس کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جیسے نقشبندیہ کا مرکز بخارا اور ترکستان، شاذلیہ کا مغرب اور تیونس، سہروردیہ کا بغداد، بدویہ کا مصر ہے، اسی طرح چشتیہ طریقہ کو کچھ ہندُستان کے ساتھ خصوصیت ہے[1]۔

[1] میں نے قادریہ کا ذکر اس سلسلہ میں قصداً اس لیے نہیں کیا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، طریقہ قادریہ کو کسی اسلامی ملک سے کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں اسلام ہے قادریہ طریقہ بھی وہاں اس کے ساتھ پہنچا ہے یہ حضرت سیدنا شیخ جیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلالت قدر کا اثر ہے کہ وہ سارے اسلامی ممالک پر حاوی ہیں۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء [illegible]

اس زمانہ میں چشتی اور چشتیت کے مفہوم کو کچھ گانے بجانے، چنگ ونے، دف وچغانہ کے ساتھ کچھ اس طرح لازم کر دیا گیا ہے کہ لفظ چشتی کے بولنے کے ساتھ ہی گویا مخاطب کا ذہن رقص و سرود کے ان ہی ساز و سامانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ سماع کا تعلق چشتی طریقہ سے کیا ہے۔ اس کا ذکر تو ان شاء اللہ آخر میں کرونگا، لیکن اس زمانہ میں تحقیق و مطالعہ کے بغیر کسی معمولی مناسبت کو واسطہ بنا کر جو نتائج پیدا کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ استدلال کے اسی طرز جدید کا نتیجہ ہے کہ انسان اور بندروں میں صوری مشابہت جو پائی جاتی ہے محض اسی مشابہت کو واسطہ بنا کر مسئلۂ ارتقاء پر لائبریریاں تیار کر دی گئی ہیں، یہ عہد جدید کا خاص لطیفہ ہے۔

تصوف کو جوگیت قرار دینے والے تو خیر وہ لوگ تھے جنہیں صوفیا اور تصوف سے ہمدردی نہیں ہے لیکن اس غریب تصوف کے غم گساروں نے بھی غم گساری کا جو فرض ادا کیا ہے اس کی ایک مثال وہی توجیہ ہو سکتی ہے جو "طریقۂ چشتیہ" میں گانے بجانے کے رواج کو پا کر اس زمانہ میں بکثرت مختلف الفاظ میں مختلف دائروں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک خاص قسم کا ملک تھا یہاں کے عام باشندوں میں موسیقی سرود و نغمہ وغیرہ کا شدید میلان پایا جاتا تھا، باشندگان ملک میں رقاصی اور نغمہ نوازی کے اسی میلان کو دیکھ کر بزرگان چشت نے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ مناسب خیال کیا کہ ان کے اسی مذاق سے نفع اٹھایا جائے اور یوں چشتی طریقہ میں اسی مصلحت سے گانے بجانے کو مروج کیا گیا، نادان دوستوں کی ذہانت کی داد دینی چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اس ہمت کی کہ بنیاد ہو یا نہ ہو لیکن دماغ میں جو خیال آگیا اس کے آگے بڑھانے میں ان لوگوں کو کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

کچھ نہیں تو کم از کم ایک ہی واقعہ بھی ان لوگوں کو کہیں ایسا مل جاتا کہ ایک ہندو محض صوفیوں کی محفل کے گانے سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تو کہا جاسکتا تھا کہ اس زمانہ میں اس قسم کے جزئیات سے کلیات بنانے کا جب عام رواج ہی ہے تو کیا مضائقہ ہے کہ ایک جزئی واقعہ سے کلی توجیہ پیدا کر لی گئی، مگر میں جانتا ہوں اس سلسلہ میں ان کے پاس ایک واقعہ بھی تو نہیں ہے۔

اب اسے میں صرف شاعری نہ سمجھوں تو اور کیا سمجھوں، اور شاعری میں بھی بہر حال تشبیہ اور استعارہ کی وجہ شبہ ہوتی ہے، یہاں تو وہ بھی نہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ گانے بجانے کو ہندوستان کی فطرت کے ساتھ آخر کس بنیاد پر مخصوص سمجھا جا رہا ہے، دنیا کی کونسی قوم کونسا ملک ہے جہاں کے لوگوں میں اس کا ذوق نہیں، ہم تو سنتے ہیں کہ عرب کا اونٹ بھی گانے سے متاثر ہوتا اور اور تال دے پر ناچتا ہے، تھرکتا ہے۔ آپ جنگلی جزیروں میں چلے جائیے، بس مینوں اور صحرائیوں کو پائیگا کہ ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے ہندوستان کے عوام گلے میں ڈھول ڈالے ناچتے گاتے بجاتے اچھلتے پھاندتے پھرتے ہیں بجنسہ اسی شکل اسی صورت میں وہ بھی گاتے بجاتے اچھلتے کودتے ہیں۔ پھر اس ملک کی اس مسئلہ میں کوئی خاص خصوصیت کیا ہے سمجھ میں نہ آیا، یورپ با ایں ہمہ دعوئ تہذیب و شائستگی اب بھی ناچتا ہے، گاتا ہے، بجاتا ہے، بلکہ ہندوستان نے تو شاید گانے بجانے کے آلات کے ایجاد کرنے میں وہ کمالات بھی نہیں دکھائے ہیں، جو یورپ آج ہی نہیں ہمیشہ سے دکھلا رہا ہے، آپ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے تو نظر آئیگا کہ شروع شروع میں یورپ کے باشندے جو اس ملک میں آئے ہیں تو نچنیے، بجنیے، تماشا گروں کی ہی حیثیت سے آئے ہیں، تاجروں اور سوداگروں کا بھیس تو انہوں نے بعد کو بدلا ہے، ابتداءً میں ان کی طرف توجہ ہندی بادشاہوں کو ان کے خاص خاص باجوں ہی کی وجہ سے ہوئی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے، مجدد الف ثانی والے مقالے میں بعض چیزیں اس سلسلہ میں میں نے نقل بھی کی ہیں، رہا فنی حیثیت سے میوزک کا علم ہندوؤں میں ضرور تھا، لیکن اس سے پہلے مسلمانوں میں یہ چیز یونانیوں کی راہ سے آچکی تھی اور عباسی خلافت ہی کے زمانہ سے اس فن میں مسلمانوں کے عیاش امیروں نے اتنی سرپرستی کی تھی کہ اس میں بھی کوئی خاص فضیلت اس ملک کو باقی نہ رہی تھی، اور ہو بھی تو اس کا تعلق خواص سے تھا۔ اور یہاں تو کہا جاتا ہے کہ گلے میں ڈھول ڈال کر عام طور پر جو ہندوستان میں عوام ادھر ادھر ناچتے بجاتے پھرتے ہیں، ان کو مائل کرنا مقصود تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ "تبلیغ اسلام" کا مسئلہ نہ اتنا آسان تھا اور نہ ہے کہ صرف چند غزلوں کے الاپنے
سے اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہو، اور نہ ہندو اتنے بے وقوف تھے کہ وہ صرف گانے پر شیفتہ
ہو کر اپنے آبائی دین اور دھرم کو چھوڑ دیتے، گانا بجانا تو بڑی چیز ہے، آپ جن بزرگوں کو متہم فرما رہے
ہیں کہ انہوں نے تبلیغ اسلام کی راہ یہ نکالی تھی اس کی تائید میں تو کوئی چیز آپ پیش نہیں کر سکتے
لیکن میں آپ کی خدمت میں تجربہ کی وہ بات پیش کرتا ہوں جو ہندو قوم کے نفسیات کا مطالعہ
کرنے کے بعد "طریقہ چشتیہ" کے رکن اعظم حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا تھا، فوائد الفواد میں ہے ایک
غلام جو مسلمان تھا وہ حضرت کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا اور "یک ہندوے در برابر خود آورد وگفت
کہ ایں برادر من است" جب دونوں بیٹھ گئے تو جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ "خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر ازاں
غلام پرسید کہ ایں برادر تو ہیچ میلے بہ مسلمانی دارد" جواب میں اس مسلمان غلام نے عرض کیا کہ "ادر اتحت
اقدام بجہت ایں معنی آوردہ ام تا بہ برکت نظر مخدوم مسلمان شود" اس مسلمان غلام سے یہ سننا تھا کہ جامع
ملفوظات کہتے ہیں "خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چشم پر آب کرد" حضرت والا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، کیا
خیال آیا، ظاہر ہے کہ اس غریب ہندو بیچارے کے انجام کا خیال آیا اور اسی کے ساتھ اپنی بے بسی
کا، جس کا اظہار حضرت ہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں "فرمود کہ ایں قوم را چنداں بگفت کسے
دل نہ گردد" یعنی صرف باتوں سے کوئی چاہے کہ ہندو قوم کے دل کو ان کے دھرم سے پھیر دے یہ
مشکل ہے، یہ بھی پتہ کی وہ بات جو وہی کہہ سکتا ہے جسے اس راہ کا کچھ تجربہ ہو، اور کچھ دن اس مسئلہ
کو اس نے سوچا ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام اپنے خواص کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے
ہیں، ہر انقلابی اقدام میں ان کی نظر اُن ہی لوگوں پر رہتی ہے جن کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ
ہے میری مراد برہمنوں سے ہے، اور برہمنوں کا حال یہ ہے کہ ان کو کوئی گا بجا کر کیا مسلمان کر سکتا
ہے، ان کا تو کسی کی تقریر اور تحریر سے بھی متاثر ہونا آسان نہیں ہے۔ آپ ان کے سامنے مذہب
کو جس حد تک بھی فلسفہ بنا کر پیش کیجیے، وہ آپ کے سامنے اس سے زیادہ فلسفیانہ گفتگو شروع
کر دینگے۔ اس قسم کی مذہبی اور دینی تقریروں کی اس ملک میں کیا کمی ہے، ان برہمنوں کو ہزار ہا ہزار

سال اطمینان کے ساتھ روٹی کھانے کا موقع ملا ہی، ان پر نہ حکومتوں کے بدلنے کا اثر پڑتا تھا، نہ سلطنتوں کے، کیونکہ ایک راجہ کو مار کر دوسرا راجہ اگر گدی پر بیٹھتا تھا تو برہمن کی خدمت اس پر اسی طرح واجب ہوتی تھی جتنی پہلے پر، اسی کا یہ نتیجہ ہی کہ مذہب کو فلسفہ بنانے کا کام ہندوستان میں بڑے اطمینان سے انجام دیا گیا ہی، اپنشد جسے دیکھ دیکھ کر آج یورپ بھی حیران ہی، وہ کیا ہی! کیا واقعی خالص کوئی فلسفہ ہی؟ یقیناً مذہب ہی جسے فلسفہ بنا یا گیا ہی، وہ وہ لن ترانیاں ہیں، اور دور کی کوڑیوں کے لانے کی کوشش کی گئی ہی کہ آج ہندو فلسفہ کی کتابوں سے ہی اُس فلسفہ کا طلسم کھڑا کیا جاسکتا ہی، جو یونانیوں نے بلکہ آج میٹا فزکس (ما بعد الطبیعیات) کے مسائل میں یورپ نے پیدا کیا ہی۔ اسی طرح اگر آپ مذہب کو قصہ کہانی کی شکل میں جس میں خوارق اور عجائب کا ذکر ہو اگر ان کے سامنے پیش کرینگے تو وہ آپ کے آگے اس سے بھی عجیب تر چیزوں کو اپنے پرانوں اور مہابھارت، رامائن وغیرہ سے اخذ کر کے رکھ دینگے۔ اور عام طور پر غلط طریقہ سے مذہب کی تبلیغ کی جب کوشش کی گئی ہی تو عموماً یہی دو راہیں اختیار کی جاتی ہیں، مذہب کو فلسفہ بنایا جاتا ہی یا مذہب کو خیالی افسانوں، محیّر العقول خوارق اور اعجوبہ طرازیوں سے بھر کر پیش کیا جاتا ہی، ہندوؤں کا حال یہ ہی کہ ان میدانوں میں وہ آگے بڑھے ہوئے ہیں بلکہ اس ملک کے عام باشندے برہمنوں کے جن پنجوں میں ہزار ہا ہزار سال سے گرفتار ہیں اس کی وجہ یہی یہ ہی، یہی دو حربے ہیں جن میں اپنشد اسے تو سوچنے والے ارباب فکر کو گھیر لیا جاتا ہی، ان کے سامنے وہ آسمان و زمین کی باتیں سُنائی جاتی ہیں کہ بہرحال انہیں اپنی عقلی پرواز کی واماندگی کا اقرار کرنا پڑتا ہی، اور پرانوں کے عجیب و غریب قصّوں کا پھندا عوام کے گلوں میں پڑا ہوا ہی، بڑے سے بڑا معجزہ بڑی سے بڑی کرامت جو سوچی جاسکتی ہی وہ آپ کو ان کی کتابوں کے ورق ورق پر ملینگی۔ بھلا عامیوں کا جو گروہ ان کو سُنے ہوئے ہی اس پر واقعی معجزات اور کرامات کا کیا اثر پڑسکتا ہی، آپ تو واقعہ بیان کرینگے، اور وہاں یہ کیا گیا ہی کہ جس قسم کے مستحیلات و ناممکنات عقل سوچ سکتی ہی سب ہی کے متعلق لکھ دیا گیا ہی کہ ہمارے یہاں واقع ہوچکا ہی خیال کرنے کی بات ہی کہ جس قوم کی نفسیاتی

ل کچھ نہیں، تو مہابھارت ہی پڑھیے جا بجا کسی درخت کا اچانک آدمی ہو جانا، آدمی کا درخت ہو جانا۔ لڑکوں کا حیوان، حیوانوں کا لڑکوں کی صورت اختیار کرنا، لکڑی کا تلوار کی صورت، تلوار کا لکڑی بن جانا۔ غرض ہر ناممکن کو ممکن ہی نہیں بلکہ قدم قدم میں واقعے کی شکل اختیار کرتے ہوئے آپ اس کتاب میں پائینگے۔ اس کے اسوا

حالت یہ ہو، اس کے متعلق یہ کتنی پھسپھسی بودی بات ہوگی کہ چشتی فقراء گا بجا کر ان کو مسلمان کرنا چاہتے تھے، یا اس ذریعہ سے ان کو مسلمان کرنے میں وہ کامیاب ہوئے، مگر یہ تو آپ فرماتے ہیں یعنی جنہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اس ملک کے غریب ہندوؤں کے متعلق ہم پر کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے بھی یا نہیں۔

پر جس کا سینہ نسل آدم کی اتنی بڑی تعداد کی گمراہیوں کو دیکھ کر شق ہوا جاتا تھا، آپ نے دیکھا کہ ذکر کے ساتھ ہی وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا، اور اس قوم کے متعلق جو صحیح تشخیص ہو سکتی تھی، اس کا اظہار ان مختصر الفاظ میں کیا گیا، یعنی صرف باتوں سے ان کو مسلمان کرنا آسان نہیں ہے، باتوں کی تو ان کے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے، اور ہر طرح کی باتوں کی، یہ تو اس قوم کے متعلق منفی رائے ہوئی، رہی یہ بات کہ پھر اسلام سے روشناس کرانے کی آج کوئی تدبیر ہندوؤں کے لیے ہے بھی، یا نہیں، سلطان المشائخ نے اس کے بعد اس کا بھی جواب دیا ہے، اسی کے بعد ارشاد ہے:۔

"اما اگر صحبت صالحے بیابد امید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود" (ص ۱۸۲)

مقصد مبارک یہ ہے کہ بات کی حد تک تو ان کے یہاں کوئی خلا نہیں ہے، تو اس میں باہر سے کسی چیز کے بھرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک چیز کی ان کے یہاں کمی ہے یعنی باوجود سب کچھ ہونے کے چونکہ ہندوؤں کے پاس دین کا جو سرمایہ بھی ہے اس کی انتہا یقین پر نہیں ہوتی کیونکہ یقین، ایسا یقین جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ ہو، اس کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے پرانوں میں عجیب عجیب قصے ضرور ہیں، الف لیلہ سے بھی عجیب تر قصے؟ لیکن عوام کا خیال کچھ ہی ہو، ان کے خواص تو جانتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں مختلف برہمنوں نے یہ قصے، خود ہی

دیگر قصص و حکایات کا تقریباً ایک ایسا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے جس میں مذہبی رنگ کی شرکت ہے اور اس کو واقعیت کا درجہ مل چکا ہے۔

گڑھ لیے ہیں، اور یہی حال اپنشدوں کا ہی کہ وہ فلسفہ ہے اور فلسفہ جو صرف مطمئن دماغوں کے
مالیخولیا کا نام ہی، اس میں اور یقین میں تو آگ اور پانی کا تعلق ہی۔ وہ دوسروں میں ضرور یقین پیدا
کرنا چاہتا ہی لیکن خود یقین سے خالی ہوتا ہی۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے بے دیکھے کہتا ہی۔
بے جانے کہتا ہی، آنکھیں بند کیے باتوں سے باتیں پیدا کرتا جاتا ہی، خیالات کی تعبیر کی بھی قوت،
اگر کسی میں اس خیالی پرواز کے ساتھ ہوئی۔ بس یہی بنا بنایا فلسفہ ہی، ظاہر ہی کہ کہیں ان خیالی
باتوں سے آدمی اپنے اندر کسی قطعی اور یقینی پہلو کا لازوال اذعان اور نہ ٹلنے والا اٹل اعتقاد
پیدا کر سکتا ہی، دوسروں کے سامنے ممکن ہی اپنے الفاظ سے یہی باور کرانے کی کوشش کرے
لیکن اس کی مثال ٹھیک اُس اندھے کی ہوگی جس کی آنکھ آفتاب کو نہیں دیکھ رہی ہی لیکن
یوں ہی ایک خیال قائم کر کے کہ آفتاب نکل چکا ہوگا اعلان شروع کر دے کہ آفتاب کے نکلنے
کا مجھے قطعی یقین ہی، ممکن ہی کہ آفتاب واقع میں نکلا ہوا بھی، لیکن اندھا تو صرف ایک خیالی بات
کہہ رہا ہی، اور جس کیفیت کی تعبیر وہ قطعی یقین سے کر رہا ہی وہ واقع میں قطعی یقین نہیں ہی۔

یہی حال ہندوؤں کا ہی ان کے پاس فلسفہ بھی ہی اور ان کے پاس خوارق و نوادر
کے قصوں کا عظیم الشان ذخیرہ بھی، لیکن جس سے یقین کی واقعی اور حقیقی روشنی آدمی کے دل
میں پیدا ہوتی ہی، اس ذریعہ سے وہ محروم ہیں، اور جب تک خود اپنے مسلمات پر آدمی کو کامل
یقین نہ ہو، اس کی زندگی ان مسلّمات کے دباؤ کو جیسا کہ چاہیے محسوس نہیں کرتی، اسی لیے
مذہبی مسلمات کا جو نتیجہ ہی یعنی "صلاح و تقویٰ" حقیقی معنوں میں بہ ان میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا،
لمبی چوڑی باتوں کے باوجود فلسفیانہ عقائد رکھنے والوں کی خانگی زندگی کا جب جائزہ
آپ لینگے، اس کو ان کے عقائد کے مطابق بہت کم پائینگے۔

ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں کا صلاح و تقویٰ کے لحاظ سے کیا حال ہی اس کا تجربہ
بہ نسبت دوسروں کے خود ان کی قوم کے لوگوں کو زیادہ ہو سکتا ہی، کچھ نہیں تو ان کے گھر
کے بھیدی خود پنڈت دیانند جی سرسوتی مہاراج ہیں، آپ ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش ہی

اُٹھا کر پڑھ لیجیے، برہمنوں کی اندرونی زندگی کی ناگفتہ بہ مفصل رپورٹ اسی میں آپ کو مل سکتی ہے اور یقین کی محرومی کا قصہ کچھ بیچارے برہمنوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، آج دنیا میں جتنی بھی مذہبی قومیں ہیں مثلاً یہودی نصرانی، بودھسٹ، پارسی وغیرہ، سب ہی کا یہی حال ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہستی کا یہ معمہ ایک راز ہے جس پر پردہ پڑا ہوا ہے، ایسا پردہ؟ ؏

کہ کس نکشود نکشاید بحکمت ایں معمہ را

عقل کے ناخن اس گرہ کے کھولنے میں نہ پہلے کامیاب ہوئے نہ اب کامیاب ہیں نہ آئندہ ہو سکتے ہیں ایک گرہ کھلتی ہے کہ معاً ؏ گشت راز دگراں راز کہ افشا می کرد[1] نے دے کر صرف ایک ہی صورت ہے کہ خود معمہ بنانے والا اپنی مہربانی سے اس "اٹھائے نہ بنے والے" پردہ کو اُٹھا دے، اپنی پہیلی خود ہی سمجھا دے کہ اسی کے فیصلہ کے ساتھ خود ہم میں ہر شخص کے آغاز و انجام کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ زمین کے کرہ پر جب سے انسانیت کی نمائش ہوئی ہے خالق کردگار کی طرف سے اس مہربانی کا ظہور بھی ان لوگوں کے ذریعہ سے ہوتا رہا ہے جنہیں خدا اپنا علم دیتا ہے اور خدا کے اسی عطا کیے ہوئے جواب کو وہ عام انسانوں میں تقسیم کرتے ہیں، دنیا کی ساری قومیں اس کی شاہد ہیں کہ اس ذریعہ سے ان کے پاس بھی جواب آیا تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ خدا کا وہ بتایا ہوا جواب مختلف اسباب و وجوہ کے زیر اثر اپنی خالص حالت میں باقی نہیں ہے، اس تریاق میں زہر شریک ہو چکا ہے انسانوں نے مختلف زمانوں میں اپنے مختلف خیالات کی اس میں آمیزش کی ہے، ایسی آمیزش! کہ ایک کو دوسرے سے اب جُدا کرنا انسانی قوت کی حد پرواز سے خارج ہے[2]۔

---

[1] اس زمانہ میں، یورپ والوں نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میٹا فزکس (فلسفہ مابعد الطبیعات) یا حقیقت کون کے مسائل مبدأ و معاد کے متعلق اگناسٹک (ارتیابیت) کے فلسفہ کو انہوں نے خوب منقح کر کے رکھدیا ہے گو تشکیک دنیا کے پرانے فلسفی نظریات میں ایک قدیم نظریہ ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ پہلے اس پر اتنی توجہ کبھی نہیں کی گئی جتنی کہ یورپ میں کی گئی تشکیک دراصل انسانی جہل کا تحقق ہے، یہی جہل اس علم کی راہ درست کرتا ہے جس سے معمۂ کائنات حل ہو جاتا ہے

[2] تفصیل کے لیے تو دنیا کے تمام مذاہب کی آسمانی کتابوں کی تحقیقی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے (باقی بر صفحہ ۶۹)

پس گو خدا کا ماننا ہوا علم جسے ہر زمانہ میں ہر قوم کو بخشا گیا تھا کسی نہ کسی صورت سے سب کے پاس موجود ہی، لیکن یقین کی جو کیفیت اس علم سے پیدا ہوسکتی تھی اس کی جس چیز میں حقیقی ضمانت پوشیدہ ہی اس کے فقدان نے یعنی بیرونی آمیزشوں نے اس تاثیر کو باطل کر دیا ہی، آدمی لاکھ ان کے ساتھ اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہیگا لیکن مطمئن نہیں ہوسکتا، ہوسکتا ہی کہ اپنی اس بے اطمینانی کا اسے شعور بھی نہ ہو، لیکن یقین اور قطعیت سے جو اثر پیدا ہوسکتا ہی اس کی آفرینش اور تولید ہو ہی نہیں سکتی اور یہی ایک واحد چیز ہے، جو صرف مسلمانوں کے پاس ہی، جسے دوست ہی نہیں دشمن بھی جانتے ہیں ورنہ یہ واقعہ ہی کہ دنیا میں ایسا کونسا مذہب ہی جس کے پاس کوئی اخلاقی نظام نامہ نہیں ہی کس مذہب میں جھوٹ، چوری، زنا، دغابازی، فریب، کی اجازت دی گئی ہی اور راستبازی، دیانت، امانت، پارسائی، پاک دامنی کو حرام ٹھرایا گیا ہی حتیٰ کہ خالص عباداتی چیزیں الصلوٰۃ، الزکوٰۃ الصوم (روزہ) آپ کو قرآن ہی بتائیگا کہ قدیم سے قدیم دیانات وملل کے عناصر بھی یہی تھے، انتہا یہ ہی کہ الحج ماسوا اس کے کہ یہ ایک قدیم ابراہیمی نسک ہی یوں بھی جب اقوام کے قبیلے کسی زمانہ میں یعنی ان ہی دنوں میں جب ہر قوم کے لیے ان کا مخصوص قومی نبی ہوتا تھا قبیلے بھی قومی تھے تو اس کی تردید کیسے ہوسکتی ہی کہ عیسائی یا یہودی پلگرمس اگر بیت المقدس میں جاتے تھے یا دنیا کی قومیں مختلف تیرتھ گاہوں کو جاتی تھیں، ان کی کوئی اصل نہ تھی[1]۔ رہا خالق کائنات اور اس کی توحید کا مسئلہ سو قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہی کہ من خلق السمٰوٰت والارض (کس نے آسمان وزمین پیدا کیے) کا سوال جس کسی سے بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٨) خاکسار نے اپنی کتاب النبی الخاتم کے شروع میں کچھ اشارے اس طرف کیے ہیں حقیقت یہ ہی کہ اس مطالعہ کے بغیر "ذٰلك الكتٰب لا ريب فيه" کے قرآنی دعووں کی قیمت آدمی پر واضح ہی نہیں ہوسکتی کہ یہ عالم کی ساری لائبریریوں کے مقابلہ میں کھلا ہوا چیلنج ہی ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] میں نے اپنے دیو بندی اساتذہ جن کا نام صحیح طور پر اس وقت محفوظ نہ رہا یہ بھی سُنا ہی کہ دیوبند کے سابق صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یعنی حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاذ امام جو اپنے کشفی بیانات میں جماعت دیوبند میں خاص امتیاز رکھتے تھے، کبھی کبھی یہ فرماتے کہ ہر دوار (ہر بمعنی خدا دوار گھر، بیت یعنی بیت اللہ)

کیا جائیگا لیقولن اللّٰہ (وہ یہی کہینگے کہ اللہ) صرف خلق کی حد تک نہیں بلکہ تدبیر و تصرف کے کلی وجزئی اعمال بارش برسانا، روزی دینا ان ساری چیزوں کے متعلق بھی قرآن نے اعلان کیا ہے کہ یہ انسانی اعتقادات کے اجزاءِ عامہ ہیں یوں ہی مجازات و مکافات کا قانون جس شکل میں بھی ہو لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت (یعنی آدمی کو اپنے اچھے کاموں کا نفع بھی پہنچتا ہے اور بُرے کاموں کا ضرر بھی) ان ساری باتوں کا آپ ہی بتلایئے کہ دنیا کی کونسی قابلِ ذکر قوم منکر ہے جب سارے اخلاقی قوانین عباداتی عناصر عقائد کے اصول سارے جہان کی قوموں میں مشترک ہیں۔ تو آپ ہی غور کیجیے قوموں کے مقابلہ میں آپ اسلام کا کیا امتیاز پیش کر سکتے ہیں؟ جزئیات نہ سہی کلیات میں تو سب آپ کے ساجھی اور شریک ہیں اور اس کا مخبر علاوہ واقعات کے خود قرآن ہے۔ اس کا تو دعوٰی ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو وہی دین دیا جا رہا ہے جو نوحؑ کو ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو عیسیٰؑ کو سب ہی کو دیا گیا تھا۔ قرآن میں وہی ہے جو صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں تھا۔

اب آپ ہی بتلایئے کہ بجز ایک بات کے اگلوں کو جو کچھ خالق تعالیٰ اجل مجدہ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا، خالق کے ان علوم کے ساتھ مخلوقات کی دماغی آمیزشوں نے شریک ہو کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) میں ہر کی پیڑی کے نام سے جو مقام موسوم ہے مجھے اُس میں ایک لاہوتی نسبت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ شاید کچھ اور ہوں لیکن معنی یہی تھے اور اس سے اس بات کی توثیق کہ "لکل امۃ جعلنا نبیاً" کا جب زمانہ تھا تو اس وقت بالکل ممکن ہے کہ اقوام کے قبلے جیسے مختلف تھے جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان کے مناسک کے مقامات بھی مختلف ہوں ولکل امۃ جعلنا منسکا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ والقصۃ بطولہا ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎ گو اس کی کوئی تصریحی دلیل تو میرے پاس نہیں ہے لیکن تمام انبیاء میں صرف دو پیغمبروں کا یہاں انتخاب ایک اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خیال گزرتا ہے کہ مغربی ممالک عموماً مسیح علیہ السلام (جو موسوی دین ہی پر لوگوں کو قائم کرتے تھے) ان کو پیغمبر مانتے ہیں بلکہ ان کا عمل درآمد ان کی شریعت وہی موسیٰ کی شریعت ہے اور مشرقی اقوام ایرانی، ہندی وغیرہ کے متعلق تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ ایرانی اپنا وخشور (پیغمبر) اول مہ آبادی کو ٹھہراتے ہیں، ہندو وید کے متعلق مدعی ہیں کہ برہما کے منہ سے نکلا۔ اسی بنیاد پر وید والے اپنے کو برہمن کہتے ہیں۔ دونوں آرین زبانوں میں یائے نسبت کا قائم مقام ہے۔ گویا مغرب اور مشرق کے دیانات کی طرف یوں اس روایت میں ایما ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الانسان الکامل" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو قسم کے لوگ ہیں، عوام تو وثنیوں (بت پرستوں) کا گروہ ہے لیکن وہاں کے خواص براہمہ دین ابراہیمی کی یادگار ہیں۔ ۱۲

اس کو مشکوک اور قابلِ اعتماد باقی نہیں رکھا، ایسی کتاب جو خدا کے نام سے نسلِ آدم کو ان ہی صفات رکھنے والی ہستی کے ذریعہ سے سپرد کی گئی ہو جن صفات کی بنیاد پر قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو پیغمبروں کو دخشوروں کو، اوتاروں کو مانا ہو، روئے زمین پر بنی آدم کے سارے گھرانوں اور امتوں میں قرآن کے سوا قطعاً کوئی دوسری کتاب ایسی باقی نہیں رہی ہے جو بغیر کسی کمی بیشی اور سہو و تفاوت کے ٹھیک اسی حال میں موجود ہو جس حال میں دینے والے نے اسے دیا ہو۔ یہ ایسی کھلی ہوئی واضح مین حقیقت ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کا بھی اس پر اتفاق ہے۔

جرمنی عالم وان ہیم کا یہ مشہور فقرہ ہے :-

"ہم قرآن کو محمدؐ کا کلام ایسا ہی یقین کرتے ہیں جیسے مسلمان اس کو کلام الٰہی یقین کرتے ہیں"

(اعجاز التنزیل صنہ ۵)

کچھ عیسائیوں ہی کی یہ خصوصیت نہیں ہے جو بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ علی الاتصال عہدِ نبوت سے موجودہ انسانی نسلوں تک یہ کتاب اس شان کے ساتھ منتقل ہوتی چلی آئی ہے کہ درمیان میں سال دو سال تو کیا لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی کوئی ایسا وقفہ نہیں پیش آیا، جیسے یہودیوں یا عیسائیوں یا اسی قسم کی دوسری قوموں کی آسمانی کتابوں کو پیش آیا، یعنی متعدد صدیاں ان کتابوں پر ایسی گذری ہیں کہ ان کا دنیا میں نام و نشان نہ تھا، پھر کسی طریقہ سے ان کے نام و نشان کا پتہ چلایا گیا، خدانخواستہ قرآن کے ساتھ بھی اگر ایسا حادثہ پیش آتا کہ مسلمانوں سے (العیاذ باللہ) قرآن لمحہ دو لمحہ کے لیے بھی الگ ہو جاتا تو اس وقت شبہ کی گنجایش ہو سکتی تھی، لیکن سب جانتے ہیں کہ کم از کم مسلمان اس تاریخی حادثہ میں اب تک تو بحمد اللہ مبتلا نہیں ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ باایں ہمہ سرد مہریاں جو غیر اقوام کے سیاسی اور ذہنی دباؤ سے آہ! کہ اپنی کتاب کے متعلق مسلمانوں میں محسوس ہو رہی ہیں حفاظتِ قرآن کے ذمہ دار سے اُمید ہے کہ ان کو خدانخواستہ اس حال میں مبتلا نہ ہونے دیگا، بہرحال آئندہ سے نہیں،

گذشتہ اور حال کی جو نوعیت ہے، گفتگو اُس میں ہو رہی ہے، یہ ایسا بدیہی واضح ناقابل تردید واقعہ ہے کہ دوست و دشمن کسی کے لیے مجال انکار نہیں۔

اسی لیے میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کی ان ہی باتوں کو جو غیر اقوام میں مشکوک و مشتبہ ہوگئی ہیں، ان ہی کی تصحیح کرکے قرآن نے ان کو قطعی اور یقینی بنادیا ہے۔ آپ اسلام میں یہ کیا تلاش کرتے ہیں کہ وہ کیا نئی بات بتاتا ہے، وہ نئی بات کا مدعی ہی کب ہے بلکہ جو کچھ ڈھونڈھتا ہے دنیا کے تمام ارباب مذاہب کو ڈھونڈھنا ہے وہ یہی ہے کہ معمہ کائنات، اور راز حیات کے جن بنیادی سوالات کے جوابات بیرونی آمیزشوں سے مشکوک ہوگئے ہیں اور ایسے مشکوک کہ اب خدا کی بات کو آدمی کی بات سے آپ کسی طرح جدا نہیں کرسکتے، ناخن کو گوشت سے چھڑا نہیں سکتے، قرآن ان ہی بنیادی امور کا قطعی واضح غیر مشتبہ علم و یقین آپ کو عطا کریگا، گویا دوسرے لفظوں میں ہر مذہب اور دین والے قرآن میں کسی جدید دین کو نہیں بلکہ اپنے اپنے آبائی دین ہی کو بجائے مشکوک حالت کے یقینی شکل میں پانا چاہیں تو پاسکتے ہیں، یہودیوں کو حضرت موسیٰ کی عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی ابراہیمیوں کو حضرت ابراہیم کی نوحیوں کو حضرت نوح کی ازیں قبیل ہر پیغمبر کی اُمت اپنے پیغمبروں کی تعلیم قرآن سے پاسکتی ہے اور بچھڑنے کے بعد قرآن کے ذریعہ سے پھر اپنے اپنے پیغمبروں تک ہر امت واپس ہوسکتی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوموں کو ان کے پیشواؤں سے توڑنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آئے تھے، اور مُصدِق لما معکم اور "النبیین" کے خاتم کا حقیقی منصب ہی بھی یہی۔

انتہائی دیانتداری اور بغیر کسی پاس داری کے میں اس کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن سے ہٹ کر جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کے مسلمات اور تعلیمات کو مانتے ہیں، مانتے ضرور ہیں لیکن جسے واقعی یقین کہتے ہیں، اس یقین کے ساتھ جزئیات مذہب کے عام تفصیلات ہی نہیں، بلکہ بنیادی امور کا بھی ماننا ان کے لیے ناممکن ہے، انسان بہرحال ایک عقلی فطرت ہے۔ ضد، ہٹ دھرمی، آبائیت جس کی تعبیر اس زمانہ میں قومی روایات یا کلچر[لہ] وغیرہ کے

لہ (بر صفحہ ۷۳)

الفاظ سے کی جاتی ہی، ان جذبات کے زور سے لاکھ وہ باور کرانا چاہیں کہ جو چیزیں مشکوک ہیں ہمیں ان پر اسی قسم کا یقین ہی، جیسے واقعی یقینی ذرائع سے حاصل ہونے والے معلومات کو مانا جاتا ہی، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا جو آفتاب کو طلوع ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ کر مان رہا ہو اس کے یقین کی جو کیفیت ہوگی کیا اس کی برابری اس شخص کے ماننے کی کیفیت کر سکتی ہی جس نے یونہی بعض تخمینی قرائن سے باور کر لیا ہو، کہ اُفق سے آفتاب سر باہر نکال چکا ہی۔ مذہب کی بنیاد جن امور پر قائم ہی، جب ان ہی کے متعلق واقعی شک یا یقین نما شک ہو تو پھر ان بنیادوں پر جو تفریعات اور نتائج و آثار پیدا ہونگے ان کی گرفت میں بھی وہ قوت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی، جو بنیادی امور کے قطعی علم والوں میں پیدا ہو سکتی ہی، آپ قرآن میں پڑھیے یہی راز ہی کہ ان ہی چند بنیادی امور جس پر مذہب کا چکّر گھومتا ہی ان ہی کی یقین آفرینی کے لیے ان کو بار بار مختلف پیراؤں میں دہراتا ہی، مثلاً حق تعالیٰ کے صفات و کمالات، قانون مجازاۃ، اور ان دونوں سے بھی زیادہ ذریعہ علم یعنی رسول کی رسالت کی صداقت، چاہتا ہی کہ جس طرح ممکن ہو اس کا یقین انسانی فطرت میں محلول کر دیا جائے کہ سارا دار و مدار تو علم کے ذریعہ کی قوت اور وثاقت ہی پر ہی، سب کچھ ہو لیکن آنکھ نہ ہو تو ٹٹول ٹٹول کر آپ کن کن چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آنکھ روشن ہو چکی ہی، اب کیا ہی، جن چیزوں سے زندگی کا حقیقی تعلق ہی، ان کو آنکھوں سے دیکھ لینے اور اُن کے متعلق قطعی فیصلہ کن علم حاصل

ؔ یورپ نے انسانیت پر جہاں بیسیوں مظالم توڑے ہیں اُن میں ایک بڑا ظلم اس حدیث العہد لفظ "کلچر" میں بھی چھپا ہوا ہی۔ قرآن سے پہلے کسی چیز یا مسلک و طریقہ کی صداقت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی تھی کہ ما وجدنا علیہ اٰباءنا الاولین یعنی جس پر اپنے باپ داداؤں کو ہم نے پایا ہی۔ چونکہ یہ وہی ہی اس لیے سچ ہی۔ قرآن نے ڈانٹ ڈانٹ کر اس بیہودہ استدلال کی بنیاد کو مضمحل کیا، لوگ شرمانے لگے کہ صداقت کی دلیل میں باپ دادا کے طرزِ عمل کو پیش کریں، لیکن یورپ نے پھر کلچر کا لفافہ ایسا عطا کیا ہی کہ اس میں لپیٹ کر بیہودہ سے بیہودہ بات پر اصرار کرنا ہر قوم کا گویا جائز قومی حق ہو گیا ہی۔ حتیٰ کہ بھولے مسلمان بھی اب اسی کلچر کے نیچے اپنے دین کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ یا للعجب ۱۲

کر لینے کے بعد غیر اہم امور میں اگر تخمینہ اور قیاس سے بھی کام لیں تو ظن غالب بھی اس کے لیے کافی ہی، لیکن بنیادی امور کو بھی بجائے قطعی اور یقینی بنانے کے جو لوگ صرف شک یا زیادہ سے زیادہ غالب گمان کی راہوں سے پار رہے ہیں، بہ ظاہر اپنے آپ کو لاکھ پائے ہوؤں میں باور کرائیں لیکن یقین کیجیے کہ قطعیت اور لاریبیت کی خنکی سے وہ محروم ہیں، یہ انسانی فطرت کا اٹل قانون ہی۔ مذہب کے بنیادی امور اساسی حقائق کے قطعی لازوال یقین کی یہی دولت گرانمایہ ہی جس کا سرمایہ دار کرۂ زمین پر اسی خدا کی قسم جس نے قرآن نازل کیا ہی۔ قرآن اور صرف

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وہی کتاب ایسی ہی جس میں شک نہیں کہ جہانوں کے مالک کی طرف سے آئی ہی۔

یہی کتاب ماننے والوں میں اس متعدی یقین کو پیدا کرتی ہی، اور وہی پیدا کر سکتی ہی جو ماننے والوں سے نہ ماننے والوں میں منتقل ہو جاتا ہی۔ قرآنی یقین کے اسی آہنی لنگر سے صلاح و تقوی کی جو زندگی اور سیرت جکڑی رہتی ہی، اُسی میں اتنا زور ہوتا ہی کہ سارا فلسفہ، سارے خوارق بے زور ہو کر بازو ڈال دیتے ہیں، کہ بہر حال باہر میں کچھ بھی دعویٰ کیا جائے لیکن انسانی فطرت کی گہرائیوں میں نہ فلسفہ جڑیں جما سکتا ہی اور نہ عجائب و غرائب مافوق العادات قصّے اور افسانے یقین کی اس گرفت اور عدم گرفت کا لوگوں میں شعور ہو یا نہ ہو، لیکن انسانی فہم عامہ دونوں کے زور میں فطرتاً فرق محسوس کرتی ہی، مقابلہ کے وقت اس درخت کو سربسجود ہونا پڑتا ہی، جس کی شاخیں باہر میں چاہے جتنی بھی پھیلی ہوں لیکن اندر میں اس کی جڑیں جمی ہوئی نہیں ہیں، خواہ لوگوں کو ہم سے اختلاف ہو، لیکن میرے دماغ میں تو

این قوم (ہندو) را چنداں بگفت کسے دل نہ گردد اما اگر صحبت صالحے بیابد اُمید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود۔ ص۱۸۲

سلطان المشائخؒ کے قول سے یہی مطلب سمجھ میں آیا، بلکہ چنداں کے لفظ سے حضرتؒ نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ یوں بطور بحث و اتفاق کے "گفت" یعنی لیکچر، تقریر وغیرہ کی لفاظیوں سے بھی

کبھی کوئی متاثر ہو جائے، لیکن جن حالات میں یہ قوم مبتلا ہے اس کا مقابلہ واقعی قرآنی یقین (اور قرآنی یقین کے سوا یقین کی صورت ہی کیا ہے) سے پیدا ہونے والی سیرت صلاح و تقویٰ کی زندگی ہی کر سکتی ہے۔

تجربہ بھی اس کا شاہد ہے "گفت" کے ذریعہ سے جن لوگوں نے اس قوم میں کام کرنا چاہا اولاً تو ان کو کامیابی ہی نہیں ہوئی اور الشاذ کالمعدوم کے طور پر بعضوں کو کبھی کامیابی ہوئی مثلاً شاہجہاں نامہ میں ملا محب علی سندھی کے متعلق لکھا ہے جس کا ترجمہ تاریخ برہان پور سے نقل کر رہا ہوں

"ملا محب علی اہل اسلام کی حاجت روائی میں بہت سعی کرتے تھے اور کفار کو ترغیب دین اسلام کی بذریعہ **وعظ و نصائح** وغیرہ دلایا کرتے تھے اور بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نومسلموں کے عرض کر کے اجراء کراتے تھے"۔ ص۱۴۲

واللہ اعلم ملا صاحب کو "گفت" کے اس طریقہ سے کس حد تک کامیابی ہوتی تھی لیکن خود آگے کا فقرہ "بادشاہ سے واسطے تقرر معاش نومسلموں کے عرض کر کے اجراء کراتے تھے" خود دلالت کر رہا ہے کہ اسلام کی وہ تبلیغ جس سے اسلام لانے والوں کے لیے تقرر معاش کے اجراء کے واسطے بادشاہوں سے عرض کرنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ خود اسلام لانے والے

فان ابی ووالدتی وعرضی　　　لعرض محمد منکم وقاء (حسان بن ثابت صحابی رض)

میرے باپ میری ماں اور میری عزت آبرو، سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت پر تم لوگوں کے مقابلہ میں قربان کہتے ہوئے "اللہ و رسول" کے سوا اپنا سب کچھ اسلام کے لیے حاضر کرنے پر آمادہ ہو جائیں، یہ بات "گفت" والی تبلیغ میں حاصل نہیں ہو سکتی، اور ظاہر ہے کہ وہ تبلیغ ہی کیا ہوئی جس کی کامیابی کے لیے پہلے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے خزانوں کا انتظام کر لیا جائے[1]۔

---

[1] آج کل خصوصاً جب سے سرشماری پر حقوق کی بنیاد مغربی حکومت نے رکھ دی ہے تبلیغ اسلام کا لفظی ذوق مسلمانوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے، اور اسکیمیں وہی سوچی جاتی ہیں جو عموماً پادری اپنے (باقی بر صفحہ ۷۶)

خواجگانِ چشت کا محورِ عمل

اب دنیا مجھے خواہ بیجا خوش اعتقادی ہی کے ساتھ کیوں نہ متہم کرے، جہاں تک میرے حقیر تتبع و تلاش کا تعلق ہے خواجگانِ چشت کا جو سلسلہ ہندوستان کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا ان کے پاس تو کم از کم میں جس چیز کو سب سے بڑے کارگر حربہ کی حیثیت سے پاتا ہوں وہ حقیقی اور واقعی صلاح و تقویٰ پیدا کرنے والے یقین کی واحد ضامن "کتاب مبین" ہی کو پاتا ہوں۔ جو دی ہی گئی ہے اس لیے کہ

يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (مائدہ)

راہ دکھاتا ہے اس کے ذریعے سے اللہ ان لوگوں کو جو (واقعۃً یقین کی حقیقی روشنی میں) اللہ کی رضامندی کو ڈھونڈھتے ہیں (اور ان کتابوں سے اعتماد اُٹھا چکے ہیں جن میں خدا کے ساتھ غیر خدا کی رضامندی شریک ہو گئی ہے تاکہ وہ کتاب ان کو) سلامتی کی راہوں پر ڈال دے اور نکالے ان کو (شک) کی اندھیریوں سے (یقین) کی روشنی میں (اپنی عقلی تجویزوں سے نہیں بلکہ) فرمان سے اللہ ہی کے اور لے چلتی ہے وہ کتاب سیدھی راہ پر۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے مشائخ چشت قرآن کے سوا اور کچھ پڑھتے پڑھاتے ہی نہ تھے۔ ہندوستان کے تعلیمی نظام کے ذکر میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہاں کے تعلیمی میدان کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اسلامیات کے چند لازمی مضامین کے ساتھ ادب، لغت، فلسفہ، منطق، ریاضی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٥٧) مشن کے چلانے میں اختیار کرتے ہیں۔ لیکن بندگانِ خدا اتنا نہیں سوچتے کہ پادریوں کا تعلق یورپ و امریکہ کے جن ساہوکاروں دولتمندوں اور حکومتوں سے ہے۔ غریب محکوم مفلس مسلمان ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؛ آج وہ بیچارے مسلمان جو دانے دانے کے محتاج ہیں، اس پر بھی مسلمانوں کو جب پکارا جاتا ہے، مذہب کے نام سے پکارنے والے پکارتے ہیں تو ان کی اکثریت اپنی جیب جھاڑنے کو تیار رہتی ہے افسوس کہ اس کا بھی صحیح مصرف نہیں لیا جاتا ۱۲۔

ہندسہ حتیٰ کہ موسیقی، السنہ غیرہ وغیرہ سب ہی چیزیں شریک تھیں۔ اور یہ تو اسلامی عہد میں اس ملک میں مسلمانوں کے تعلیمی ماحول کا عام حال تھا، مشائخ چشت کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نرے غیر عالمانہ تصوف کی ان نگاہوں میں کوئی قیمت معلوم نہیں ہوتی، نہ بنگالہ کے شیخ الشیوخ شیخ سراج عثمان جن کا شاید پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ جب وہ اس راہ میں خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہوئے جو مشائخ چشت کا اس ملک میں کاروبار تھا، تو حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا" اول درجہ دریں کار علم ست" (سیر الاولیا ص۲۸۸) اور سلطان المشائخ کا یہ کوئی ذاتی خیال نہ تھا، ان کے شیخ حضرت فریدالدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی اسلامی تصوف اور درویشی کی بنیاد علم ہی پر قائم تھی، سلطان جی ہی ان سے ناقل ہیں کہ" درویش را قدرے علم باید ص۱۰۱" "قدرے علم" کا کیا مطلب تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ سلطان المشائخ ان کی خدمت میں مروجہ درسی علوم کے نصاب کو ختم کرکے گئے تھے، بلکہ فضل والے نصاب کو بھی اُنھوں نے تو پورا کرلیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی شیخ کبیر نے ان کو براہِ راست تمہید سالمی بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، عوارف بھی پڑھائی، اور اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ خود شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان المشائخ کو تجوید کی بھی تعلیم دی، حالانکہ گذر چکا کہ سلطان المشائخ نے بچپن میں قرآن جس اُستاد سے بداؤں میں پڑھا تھا وہ نومسلم مقری شادی نامی تھے، جو خود قرأت سبعہ کے عالم تھے، لیکن باوجود اس کے بھی شیخ کبیر نے ضرورت محسوس کی کہ سلطان المشائخ کو صحیح تلفظ اور لہجہ کے ساتھ قرآن پڑھنا سکھائیں اور ڈیڑھ ایک پارے نہیں، اس توجہ، انہماک، واہمیت کو ملاحظہ کیجیے کہ چھ پارے کامل تجوید کے ساتھ شیخ کبیر نے سلطان جی کو پڑھایا، اس کی تصریح تو مجھے ملی نہیں، کہ لفظی تجوید کے ساتھ قرآن کے معانی اور مطالب بھی بیان کرتے تھے یا نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ البتہ الفاظ کی تجوید و تصحیح جس طریقہ سے ہوتی تھی، اس کا تذکرہ ملتا ہے، سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ" چوں من خواندن آغاز کردم مرا فرمود کہ الحمد بخوان چوں بخواندم و در ولا الضالین

رسیدم فرمود، "ضاد" ہم چنیں بخواں کہ من می خوانم"

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ "ہر چند کہ می خواستم بیاید" یعنی ضاد کا جو خالص عربی تلفظ ہے، جیسے عربوں سے ٹ، ڑ وغیرہ حروف کے ادا کرنے کے لیے زبان کو جہاں جانا چاہیے وہاں عادت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاتی، اسی طرح ہندی نژاد کے لیے "ضاد" کے حرف کا ادا کرنا عموماً سخت دشوار ہوتا ہے، یہی حال سلطان جی فرماتے ہیں کہ ہمارا تھا، لیکن شیخ کبیر کی معلوم ہوتا ہے کہ مشق بہت پختہ تھی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صوفیوں کے جس طریقہ میں قرآن کے الفاظ اور حروف کی ادائگی کو اہمیت دی جاتی ہو، ان کا قرآن کے معانی سے کیا تعلق ہوگا، سلطان المشائخ بھی قرآن کی اس تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ کبیر کی مہارت کے متعلق فرماتے

ایں چہ فصاحت و بلاغت بود شیخ شیوخ العالم ضاد بہ نوعے خواند کہ ہیچ کس را میسر نشد (سیرالاولیا، وغیرہ ص ۷۱)

بہرحال جب درویشی کے "قدرے علم" میں قرآنی الفاظ کی تجوید و تصحیح بھی داخل تھی، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ عام علوم درسیہ کے متعلق چشتی طریقہ کے بزرگوں کا مطمح نظر کیا تھا، وہی شیخ بنگال عثمان سراج ہی کے قصہ میں دیکھیے کہ سلطان المشائخ اس راہ میں گام زن ہونے کی اجازت اس لیے نہیں دے رہے تھے "کہ از علم او چنداں نصیبے ندارد" اور جب تک مولانا فخر الدین زرادی نے حضرت والا کو یقین نہیں دلا دیا کہ عام علوم درسیہ دینیہ میں نے اُنھیں پڑھا دیا ہے اجازت نہ ملی۔ "علم" کی قدر و منزلت، اہمیت و ضرورت کا احساس سلطان المشائخ کو کس حد تک تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی مجلس مبارک میں سب سے آگے علماء کی نشست ہوتی تھی اور اس کے بعد دوسرے لوگ بیٹھتے تھے۔ حضرت والا کی طرف سے آدابِ مجلس کے سلسلہ میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا، سیرالاولیا میں، انھی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے کہ

"من نخواہم کہ ہیچ مجعدے[1] بالا تر متعممے بنشیند" ص ۲۰۲ -

اور یہ نقطۂ نظر کہ علم کے قدر ضروری کے متعلق تھا، باقی اس راہ میں جو لوگ دین کی خدمت کی نیت سے داخل ہوتے تھے ان کے لیے علمی مشاغل کا ایک درجہ وہ تھا جس میں اشتغال کی ممانعت تو نہیں تھی، لیکن عام طور پر ہمارے خواجگانِ چشت ان لوگوں کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہی جس کے راوی میر خورد ہیں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ کے حلقۂ ارادت میں اودھ کے علماء کا جو گروہ آکر شریک ہوا تھا ایک مدت سے علمی مباحث جن کے وہ عادی تھے خانقاہی زندگی میں ان سے کچھ بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے، آخر ایک دن سبھوں نے مل کر مشورہ کیا کہ اس باب میں حضرت والا سے استمزاج کیا جائے۔ میر خورد کا بیان ہی کہ

"وقتے یاراں اعلیٰ کہ از اودھ بودند اتفاق کردند کہ اجازتِ تعلّم وبحث کردن ز سلطان المشائخ بستانند"

یہاں "تعلم وبحث کردن" سے مُراد اصطلاحی تعلم نہ تھا بلکہ پیشہ ورانہ تحقیق و تدقیق مطالعہ و مباحثہ کا پُرانا ذوق ان کے دلوں میں جو گُدگدیاں لے رہا تھا اسی مُلّائی ذوق کی تشفی چاہتے تھے، میر خورد ہی نے لکھا ہی کہ

"اگرچہ ہر یکے ازیں یاراں عالمے متبحر بود لیکن ہوس ایں کار کہ عمر بداں مشغول بودند باعث می شد"

---

[1] مجعد جعد سے ماخوذ ہی ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانہ کے شوقین حضرات، کاکل بھی رکھتے تھے اور کاکلوں کو چوٹی بنا کر باہم گوندھ کر ادھر اُدھر لٹکا دیتے تھے، ایک اور عبارت سے جو اسی سیر الاولیاء میں ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ علوی سادات بجائے ایک ایک چوٹی کے دُو دُو چوٹیاں ادھر اُدھر لٹکاتے تھے، اور غیر سادات ایک ایک متعمم تو ظاہر ہی کہ عمامہ سے ماخوذ ہی. یعنی دستار والے یہ اس زمانہ میں علماء کی تعبیر تھی گویا عوام اور خواص میں یہی فرق تھا کہ خواص علماء دین متعمم ہوتے تھے اور عام لوگ مجعد فوائد الفواد کی ایک عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ نوجوانی میں سلطان المشائخ بھی کبھی مجعد رہتے تھے (فوائد الفواد ص ۲۸)

مگر جب یہ سوال اٹھا کہ حضرت گرامی کی خدمت میں ان کی اس خواہش اور ذوق کا اظہار کون کرے، تو ہر ایک کانوں پر ہاتھ دھرنے لگا، رد و قدح کے بعد طے ہوا کہ وہی مولانا جمال الدین جنہوں نے خراسان کے "مولانا بحاث" کے دماغ کا نشہ اتارا تھا، چونکہ حضرت نے خصوصی خوشنودی کا ان کے ساتھ اظہار کیا تھا، اس لیے ان ہی کو آمادہ کیا گیا، بیچارے سیدھے آدمی تھے، تیار ہو گئے اور سب مل کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آگے بڑھ کر مولانا جمال الدین نے عرض کیا۔ "مخدوم را اگر فرمان باشد یاراں وقتے بحثے کنند" یہ سُننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہو گیا، گو پیش کرنے والے تو صرف مولانا جمال الدین ہی تھے لیکن "دانست کہ ایں سوال ہمہ یاراں است کہ حاضر آمدہ اند" لایعنی غیر ضروری دماغ کاویوں میں وقت ضائع کرنے کی چاٹ جو ان لوگوں کو پڑی ہوئی تھی، یہ محسوس کر کے کہ ابھی ان کا یہ غلط ذوق بالکلیہ مردہ نہیں ہوا ہے، ذرا برہمی کے ساتھ آپ نے فرمایا۔

من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است وایشاں ہم چو پیاز پوست در پوست اند"

یہ بڑا اہم تاریخی فقرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مریدوں کا ایک طبقہ تو عوام کا تھا، جو مرید ہوتا تھا اور چلا جاتا تھا، ان لوگوں کو مرید کرنے کی کیا غرض ہوتی تھی، اس کا ذکر تھوڑی دیر بعد کیا جائیگا، لیکن اہل علم کے ایک طبقہ کو سلطان المشائخ کسی خاص مطلب اور غرض کے لیے تیار کر رہے تھے، لیکن ان کو مایوسی ہوئی کہ مغز کار تک ان کی رسائی نہیں ہوئی، اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ارشاد ایک شیخ کا اپنے تلامذہ اور مریدوں کے ساتھ تھا، لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ پیشہ ورانہ علمی مشاغل کے ایک بڑے حصہ کو خصوصاً ان لوگوں کے لیے جنہیں اپنے کسی مطلوب خاص کے لیے تیار کیا جاتا تھا، ان کے لیے اس قسم کی غیر ضروری مشغولیت کو پسند نہیں فرماتے تھے، زائد از حاجت غیر ضروری مطالعہ جو زیادہ تر ذہنی التذاذ کے لیے کیا جاتا ہے، یہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے واقعی طالب العلمی کی ہو، ایک ایسا عارضہ ہے جس سے نجات آسان نہیں ہے، اس کے لیے بڑی گہری اور عمیق عقل کی ضرورت ہے، ورنہ جس بیچارے میں صرف پوست ہی پوست ہو مغز

نہ ہو اس کے نزدیک تحقیق و تدقیق، ریسرچ و اکتشاف سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا ہے غالباً ایں قدرم علم کفایت باشد۔

اس حقیقت تک رسائی ہر بے مغز آدمی کا کام نہیں ہے، علم کو صرف علم کے لیے حاصل کرنا چاہیے، اس بے معنی فقرہ کا اہمال اگر کسی پر واضح بھی ہو جائے، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ ع۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

علم گزیدہ دماغوں سے باوجود سب کچھ سمجھنے کے اس ذوق کا سمی اثر آخر وقت تک نہیں مٹتا۔ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اس قصہ کا دانائے راز حقیقت آگاہ اور کون ہو سکتا ہے، وہ بھی تو کبھی محفل شکستی اور بحاثی کی لذت اُٹھا چکے تھے۔ حالت یہ تھی کہ "علم کو علم کے لیے" کے کاروبار کو چھوڑ دینے کے بعد کبھی کبھی خود اپنا حال بیان فرماتے جیسا کہ حسن علا سنجری نے فوائد الفواد میں نقل کیا ہے کہ ایک دن "مشغولی حق" کا ذکر ہو رہا تھا، ارشاد ہوا کہ

"کار آن دارد (یعنی کام کی بات یہ ہے) دیگر ہر چہ جز آن ست مانع آں دولتست"

مگر اس تحقیق کے بعد بھی وہی دماغ سے گذری ہوئی پُرانی چیزوں کا خیال آہی جاتا تھا، مطالعہ کے لیے ان ہی کتابوں میں سے کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھنا شروع کرتے کہ معاً خیال آجاتا کہ یہ کیا کر رہا ہوں، خود ہی فرماتے ہیں

"اگر وقتے ازاں کتب کہ خواندہ ام مطالعہ می کنم وحشتے درمن ظاہر شود با خود گویم کہ کجا اُفتادم" [ص۹۱]

بہر حال غیر ضروری معلومات کے ذخیرہ کو دماغ میں بھرتے چلے جانا یا اُن نکات اور پیچیدگیوں کا حل کرنا، جن کا نہ دین میں نفع ہو نہ دنیا میں جو ہمارے یہاں کے علوم نہیں بلکہ سارے جہان کے اکثر علوم و فنون کا حال ہے، کوئی مرے ہوئے لوگوں کی ولادت اور وفات کے سنین کی تحقیق میں مشغول ہے، کوئی کسی قبر کے کتابہ کو پڑھ رہا ہے کوئی ستاروں کو گن رہا ہے، کوئی آسمانی طبقات کو شمار کر رہا ہے۔ الیٰ غیر ذٰلک من المشاغل العلمیۃ التی ینتشاغلون

فیہا الا نہا شغل علمی بگر غزالی الامام نے اگر یہ لکھا ہو کہ آسمانی طبقات کا گننا اور کسی پیاز کے چھلکوں کو اُتار اُتار کر شمار کرنا، نتیجہ کے لحاظ سے بتایا جائے کہ دونوں میں کیا فرق ہو تو اس کا آخر کیا جواب ہو، جو گلیوں کے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو چن چن کر گنتا جائے اور اپنی ڈائری میں ان کی تعداد کو نوٹ کرتا پھرے، اگر اس پر جنون کا فتویٰ لگانا صحیح ہو تو پھر جو رات رات بھر جاگ جاگ کے آنکھوں پر دوربینیں لگا لگا کر کہکشاں کے ستاروں کو گنتے ہیں، اس کی باضابطہ رپورٹ تیار کرتے ہیں اور اسے اسٹرانومی (نجومیات) کی اہم خدمت قرار دیتے ہیں، اس فتوے سے ان بیچاروں کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہو۔"افادہ" کے معیار پر آپ علوم و فنون کی اس لمبی فہرست کو اگر جانچینگے تو اکثر و بیشتر کا یہی حال نظر آئیگا، اس لیے حدیثوں میں علم لا ینفع (ایسا علم جس پر کوئی نفع مرتب نہ ہوتا ہو) سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہو، اور یہی ہمارے مشائخ چشت کا علم کے باب میں نقطۂ نظر تھا، تاہم پھر بھی علوم کی ان قسموں کے متعلق جن سے اگر نفع نہیں ہو تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچتا بجز اس ضرر کے کہ آدمی کا وقت بیکار ضائع ہوتا ہو، چنداں سختی نہیں کی جاتی تھی، سلطان المشائخ جب شروع شروع میں شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو آپ کا بیان ہو کہ حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد "عرض داشت کردم فرمان شیخ چیست ترک تعلم گیرم؟"

اس تعلم سے غیر ضروری علوم کا مطالعہ درس و تدریس تحقیق و تدقیق مراد ہو کیونکہ علم کی قدر ضروری سے تو حضرت فارغ ہی ہو چکے تھے، اور جو کچھ کمی رہ گئی تھی بابا صاحب نے اس کی تکمیل خود ہی فرما دی تھی۔ شیخ کبیر نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"من کسے را از تعلم منع نکنم آن ہم کن ایں ہم کن تا غالب کہ آید" ص ۱۰۷

مطلب یہ ہو کہ جس نے اس راہ میں حقیقت آگاہی کے صحیح مقام کی یافت کے بعد قدم رکھا ہو، اس کا تعلق غیر ضروری علوم سے خود بخود رفتہ رفتہ کمزور و مضمحل ہوتا چلا جائیگا اور "علم" کا جو حقیقی مقصد و مآل کار ہو اُس پر قدم جما دیگا اور اگر یونہی دیکھا دیکھی اس راہ میں آیا ہو تو پھر

اپنے قدیم مالوفات کی طرف واپس ہو جائیگا، اور اس سے ان بزرگوں کے حکیمانہ طریقۂ کار کا سُراغ ملتا ہی کہ جس پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہو زبردستی جبراً اس کو ایسی بات پر مجبور کرنا جس میں کوئی ضرر بھی نہیں ہو، تربیت کی صحیح راہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہی بات کہ "این ہم کن آں ہم کن تا کہ غالب آید" جو کچھ اندر میں ہو باہر اُسی کا تابع ہو جائیگا۔

لیکن یہ فیصلہ صرف ان ہی علوم کی حد تک محدود رہ سکتا ہی جس سے نفع نہیں تو ضرر بھی کسی کو نہیں پہنچ سکتا، باقی تعلیم و تعلم تحقیق و مطالعہ کی وہ راہ جس نے خدا جانے کتنوں کی راہ ماری اور جو بسا اوقات برہم زن ایوانِ انسانیت ہوئی ہی حضرت بابا صاحب ہی سے نظام الاولیا، نے نقل کیا ہی کہ ایک دن اجودھن میں حضرت کے پاس ایک شخص آیا اور کان میں کچھ کہنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں دلی میں ہم سبق تھے، پھر علم سے کیا کیا، دنیاوی فوائد حاصل کر سکتے تھے، اس کا ذکر اس نے کیا۔ شیخ کبیر کو میں نے دیکھا کہ وہ جواب میں فرما رہے تھے۔

"اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل است مخواں و بخلق ایذائے مرساں واگر برائے عمل است ہمیں قدر کافی ست کہ می خوانند و عمل می کنند" ص ۸۵ سیر

اور یہ علم کی وہ قسم اور اس کا وہ استعمال ہے جس کے متعلق ہمارے بزرگوں کا فیصلہ "مخواں" کا تھا، یعنی جس کا پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہی، خصوصاً دینی علوم کے لیے تو زہرِ قاتل اور سم ہلاہل ہی، اس کے بعد خود شیخ کبیر کا ارشاد ہی

"مقصود از خواندن شریعت عمل ست نہ از برائے ایذائے خلق"

اور یہی وہ تماشا ہی جس کا نظارہ ہندوستان میں آج تقریباً سو سال سے دیکھا جا رہا ہی جب تک اس ملک کے لازمی نصاب میں لوگ دینیات کی حیثیت سے صرف قرآن اور وہی مشارق الانوار یا مصابیح السنۃ، قدوری، ہدایہ پر قناعت کر رہے تھے اس وقت تک یہاں کے مسلمانوں کا ایک دین تھا، ایک مشرب تھا، لیکن آج ادب کا غلغلہ بلند ہی اختل

اور عنترہ اور ابو العلاء اور فرزدق کی شاعری پر تنقید ہو رہی ہے، تحریر و تقریر کا بازار گرم ہے۔ اسماء الرجال اور تاریخ و سیر کا سمندر ہے کہ اُبل رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ شاید ہی ہندوستان پر کسی دن کا آفتاب گذشتہ صدی میں طلوع ہوا جس کے ساتھ کسی نئے فتنہ نے سر نہ اُٹھایا ہو، کہیں اجتہاد کا دعویٰ ہے، فقہ اور ائمۂ فقہ کی توہین ہو رہی ہے، کسی جگہ مہدویت و مسیحیت بلکہ نبوت کی تعمیر قلزم علم کے انہی صدف ریزوں سے عمل میں آ رہی ہے۔ کسی گوشہ سے حدیث کے انکار کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے، کسی سمت سے قرآنی آیات کی نئی نئی تفسیریں پیش ہو رہی ہیں، کہیں "امت مسلمہ" کا نظام نو بنایا جا رہا ہے، ڈھونڈ ہے جو مچی ہوئی ہے۔ فتنے ہیں کہ ٹوٹے ہوئے ہار کے مانند یکے بعد دیگرے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دینیات کا جو لازمی کورس ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں رکھا تھا، اگر علم کو جدل اور لڑائی جھگڑوں کے لیے استعمال نہ کیا جائے، تو عمل کے لیے وہ کافی نہ تھا؟ قرآن اور حدیث کی عام معمولی سادہ عربی سمجھنے کے لیے کیا واقعی امرء القیس اور طرفہ تابّط شرا کے کلام کے نکات پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے کسی جگہ عرض کیا تھا کہ ہمارے اسلاف (قدس اللہ اسرارہم) کے جہاں اور بہت سے عجیب و غریب کارنامے ہیں اُن میں بڑا نمایاں کام اُن کا یہ بھی ہے کہ عربی زبان کے اس حصّہ کو جس میں اسلامی ادبیات محفوظ ہیں اسے اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی ملک کی مادری زبان اسے نہ بنا سکے تو ان علاقوں کے مسلمانوں کی جو مادری زبان تھی اس میں قرآن و حدیث کے ان الفاظ کو شریک کر دیا گیا تھا۔ جس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کے اس ذخیرہ سے (جسے میں اسلامی الفاظ کہتا ہوں) تقریباً ۹۰ فیصدی الفاظ سے ہم عربی سیکھے بغیر واقف رہتے ہیں، مثلاً آپ سورۂ فاتحہ کو لیجیے۔ ایک انگریز کے سامنے بھی اسے پڑھیے اور ایک ہندوستانی مسلمان کے سامنے بھی، ظاہر ہے کہ عربی زبان نہ انگریز کی مادری زبان ہے اور نہ ہندوستانی مسلمان کی لیکن نظر بڑا دل سے آخر تک ہر ہر لفظ کے معنی جاننے کے

لیے اس کا محتاج ہو کہ اسے بتایا جائے۔ مگر ہمارا حال کیا ہی، ہم میں کون ہی جو حمد[1]، اللہ[2]، رب[3] عالم[4]، رحمٰن[5]، رحیم[6]، مالک[7]، یوم[8]، الدین[9]، عبادت[10]، استعانت[11]، ہدایت[12]، صراط[13]، مستقیم[14]، انعام[15] غضب[16]، غیر[17]، ضلالت[18] کے معانی سے واقف نہیں، اب آپ ہی گن لیجیے کہ ان اٹھارہ الفاظ کو نکال لینے کے بعد سورۂ فاتحہ میں کتنے الفاظ رہ گئے جن سے ہندستانی مسلمان ناواقف ہیں۔ بجز حروف جارّہ، اسم اشارہ، اسم موصول یعنی لِ[1]، ایاکَ[2]، نا[3]، الذین[4]، ہُم[5]، علیٰ[6] کے اور بھی اس پوری سورت میں کچھ ہی جس سے ہندستانی مسلمان عموماً واقف نہیں ہیں۔ تقریباً چوبیس[24] الفاظ میں صرف چھ لفظوں کی عدم واقفیت کوئی عدم واقفیت قرار پا سکتی ہی، اور یہ الفاظ بھی ایسے ہیں جن کی حیثیت مفردات منتشرہ کی نہیں ہی، یعنی جن میں ہر ہر لفظ کے لیے لغت دیکھنے کی ضرورت ہو، بلکہ کلّی الفاظ ہیں یعنی اسم اشارہ، اسم موصول، حروف جارّہ یا ازیں قبیل چند گنے چُنے کلّی الفاظ ہیں، جنھیں بآسانی چند دنوں میں سکھایا جا سکتا ہی، گویا ان چند صنفی الفاظ کے معانی سے واقف ہو جانے کے بعد تقریباً قرآن کے پچانوے چورانوے فیصدی الفاظ کے ہم عالم ہو جاتے ہیں۔ ایک چیز یہ، دوسری بات صیغوں کی خصوصی شکلیں یعنی عبادت کے معنی سے واقف ہونے کے باوجود نعبدُ سے یا استعانت کے معنی جاننے کے باوجود نستعین کا مطلب ہندی مسلمان جو نہیں سمجھ سکتا، یہ بھی ایک معمولی سی بات ہی، چند سادہ صرفی ابواب سے روشناس ہونے کے ساتھ ہی وہ صیغوں کی صورت پہچاننے لگتا ہی۔ ایک فَعَلَ کی صرفی صورت سے اسے آشنا کر دیجیے واحد غائب ماضی کے سارے قرآنی الفاظ سے وہ آشنا ہو جاتا ہی اور صرفی صیغے یہ ہیں ہی کتنے۔ تیرہ چودہ شکلیں ماضی کی، تیرہ چودہ مضارع کی چھ شکلیں امر کی باقی اسم فاعل، اسمِ مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ مبالغہ تفضیل، صفت مشبہ۔ یہ بھی اتنے کلّی قاعدوں میں جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کے یاد کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔[1] باقی تعلیلات کا قصہ وہ دراصل اشتقاق کبیر کا علم ہی جو نفعل کو سمجھتا ہی کہ جمع متکلم کا صیغہ ہی، قرینہ سے نقولُ کو بھی سمجھ لیگا، خواہ یہ نہ جانتا ہو کہ تلفظ

---

[1] خاکسار نے ایک کتاب بھی ادب قرآنی کے نام سے ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھدی ہے جو طبع ہو کر

میں فرق کیوں پیدا ہو گیا، اُردو میں ہم تھوکنا روز بولتے ہیں، لیکن اس پر کون غور کرتا ہے کہ یہ تھوکرنا کا مخفف ہے۔ راء کلمہ بوجہ ثقیل ہونے کے حذف ہو گیا، قرآن کے چند رکوع میں ہیر پھیر کر جب صحیح، معتل، مضاعف، مہموز کے ابواب کی صورتیں گذرینگی۔ دماغ خود اندازہ کرلیگا کہ عربی میں مثلاً نَصَرَ بھی ماضی کی ایک شکل ہے اور قَالَ بھی۔ ہر زبان میں اس قسم کے تغیرات ہوتے ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو کچھ کچھ کلیات ہی ہوتے ہیں، جن کے تحت یہ تغیرات پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کو بے جانے آدمی بولتا ہے سمجھتا ہے، آپ روز جانا مصدر بولتے ہیں گیا ماضی، جانے والا اسم فاعل، لیکن کبھی اس کو بھی سوچا کہ جانے کی جیم ماضی میں گاف سے کیوں بدل گئی اور مضارع میں پھر اصلی حالت پر کیوں واپس آگئی۔ آپ تمبا کو بھی بولتے ہیں اور گڑا کو بھی، لیکن اس پر آپ نے کب غور کیا کہ گڑا کو میں تین حروف ت م ب کو حذف کر کے گڑا کو بنایا گیا ہے۔ سوچیے تو بات میں بات نکلتی چلی آئیگی اور نہ سوچیے تو ساری باتیں اس سوچ کے بغیر آپ کی سمجھ میں آتی چلی جائینگی۔

اور بالفرض اگر تھوڑے بہت تعلیلی قوانین سے صرف میں واقف ہونے کی ضرورت بھی ہو تو ان قانونوں کی تعداد ہی کیا ہے، یہ تو پچھلے زمانوں میں ان معلموں نے جنہیں غالباً خطرہ رہتا ہوگا کہ اگر صرف و نحو کی کتابیں جلد ختم کرا دیتا ہوں تو ہمارا سرمایہ ہی ختم ہوتا ہے آگے بقاء ملازمت کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ معاملہ کو دراز کیا جائے[1]۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان صرفی قوانین کو واقعی اہمیت حاصل نہیں جتنی اہمیت اسے خدا ہی جانتا ہے کہ اس ملک میں کب دی گئی، اگر ہمیشہ سے یہی حال تھا، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانہ میں فاتحۂ فراغ کی عمر عموماً چودہ پندرہ سے لے کر بیس بائیس کی کیسے ہوتی تھی ۔ اب تو جس طریقہ

[1] میرے گاؤں گیلانی میں ہندوؤں کا ایک ابتدائی پاٹ شالہ ہے، اس پاٹ شالہ کے بوڑھے گروجی کا عام قاعدہ ہے کہ دو سال میں بیس تک کے پہاڑے سے آگے بچوں کو پڑھنے نہیں دیتے۔ مدت ہوئی اُن سے ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ گروجی آپ دو سال میں بیس تک کا پہاڑہ سکھاتے ہیں! بولے کہ بابو اتنے پہاڑے تو میں چار مہینوں میں بھی سکھا سکتا ہوں لیکن اس کے بعد پھر میری تنخواہ کا کیا سامان ہوگا ۱۲۔

سے صرفی ابواب کو پنجابی طریقہ سے رٹایا جاتا ہے، اسی کے لیے یا زیادہ سے زیادہ نحو کو بھی ملا لیجیے، اتنی مدت کافی نہیں ہوتی جس کی شہادت پنجابی نحو وصرف کی وہ تعلیم دے سکتی ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے وہ مروج تھی خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کا جو اسلامی حصہ ہے، میرے خیال میں اس کے مطالب اور معانی سے واقف ہونے کے لیے عربی زبان کے ان الفاظ اور ترکیبوں بندشوں کے جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، جن میں جاہلی شعراء کا کلام ہے، اور بالفرض کہیں کہیں تھوڑا بہت ہو بھی تو تفسیروں میں وہ بیان کر دیا گیا ہے، اب تفسیروں کی ان ہی بتائی ہوئی باتوں کو پھر خود تحقیق کرنے کے لیے دواوین عرب پر عبور حاصل کرنا، اگر آپ کا ذاتی شوق ہے تو اختیاری مضامین کی حیثیت سے آپ یہ بھی کر سکتے ہیں، ہر زمانہ میں جن لوگوں کو شوق تھا، ان کو کون روکتا تھا، لیکن ہر طالب العلم کے لیے خواہ اسے براہِ راست ادبی تحقیقات کا شوق ہو، یا نہ ہو، وہ بجائے جلالین یا مدارک بیضاوی کے نہیں چاہتا کہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے متعلق جاہلی شعراء کے کلام سے شاہد پیش کرے، بلکہ مفسرین نے تحقیق کر کے جو معنی لکھ دیے ہیں یا جس فقرہ کی جس ترکیب کا جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، اس مفہوم کو بتا دیا ہے تو آپ اس بیچارہ کو خواہ مخواہ اس پر کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی آپ کے اس غیر ضروری مذاق کی ہمنوائی کرے۔ آخر زمخشری، ابوعبید وغیرہ ائمۂ لغت سے تو آپ کا علمی احاطہ زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ قرآن کے جس لفظ کا مطلب جاہلی شعراء کے کلام میں تلاش کرتے ہیں، وہ بیچارہ کشاف میں یا بیضاوی میں اٹھا کر دیکھ لیتا ہے۔ حاصل تو دونوں کا ایک ہی ہوا۔

یہی حال حدیث کا ہے، سند کے مباحث مدت ہوئی کہ ختم ہو چکے، امام بخاری

---

[۱] واللہ اعلم پنجاب میں یہ رواج کب سے جاری ہوا تھا کہ شرح جامی اور اس کے حواشی تک کی تعلیم میں پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال صرف ہوتے تھے لیکن بحمداللہ اب زمانہ بدل گیا، خود پنجاب کے ایک عالم حافظ عبدالرحمٰن امرتسری مرحوم نے کتاب الصرف و کتاب النحو لکھ کر صرف و نحو کے قصہ کو چند مہینوں تک محدود کر دیا ہے ۱۲۔

مسلم جیسے ائمہ جن کی کتابیں تلقی بالقبول ہو چکی ہیں، یہ مان لیا گیا ہے کہ جانچ کر پرکھ کر صحیح حدیثوں کو غیر صحیح حدیثوں سے جدا کر کے ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے، اس لیے اب ہر حدیث کی ہر سند پر بحث کرتے ہوئے طلبہ کو پڑھانا ایک ایسے کام کو انجام دینا ہے جو آپ سے بہتر شخصیتوں کے ذریعہ سے انجام پا چکے ہیں۔ رہ جاتا ہے متن کا معاملہ متن حدیث میں ایک حصہ خلافیات کا ہے اور وہ کم ہے، دوسرا حصہ وہ ہے جو علم حدیث کی جان ہے۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، ظاہر ہے کہ پہلے حصہ کے متعلق بھی پہلی ہی صدی میں بحمد اللہ اُمت کے بہترین دل و دماغ اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں ان کے متعلق ترجیح و تطبیق و تاویل کے لیے جو کچھ کرنا تھا سارا کام کیا جا چکا ہے اور اسی کام کے آخری نتائج کا نام فقہ ہے۔ جو مختلف ائمہ کے ناموں سے اُمت کے مختلف طبقات میں معمول بہ ہے، اور یہ مسلّمہ ہے کہ ان میں کوئی طبقہ گمراہ اور استحقاقِ نجات سے محروم نہیں ہے، اس لیے حدیث میں طلبہ کو لازمی طور پر جو پڑھانے کی چیز اور سمجھانے کی بات ہو سکتی ہے وہ حدیث کا وہ حصہ ہے، جس کا تعلق خلافیات سے نہیں، بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ اور اس کے لیے کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ مشارق الانوار یا مصابیح السنہ، مشکوٰۃ المصابیح جیسی کتابیں کیا کافی نہیں ہو سکتیں۔ ان کتابوں میں سے کسی کتاب کو جو اچھی طرح جانچ کر پڑھ لیگا آئندہ وہ حدیث کی دوسری کتابوں کا شرح، حواشی کی مدد سے یقیناً مطالعہ کر سکتا ہے، پھر ہمارے بزرگوں نے لازمی نصاب کا جز، انہی کتابوں میں سے کسی کتاب کو اگر رکھا تھا تو کیا غلطی کی تھی؟ باقی اس کے بعد بھی اگر کسی کو فن اسناد و فن خلافیات میں خصوصی مہارت پیدا کرنے کا خیال ہو تو اس سے کس نے کب منع کیا تھا، اور جن لوگوں کو شوق تھا، وہ اپنے شوق کی ہر زمانہ میں تکمیل کرتے ہی رہے، ہندوستان بھی ایسے بزرگوں سے کبھی خالی نہیں رہا، جس کا اجمالی ذکر پہلے آ چکا ہے۔

غالباً بعض خیالات جن کا میں پہلے بھی اظہار کر چکا ہوں، ان کا بالکلیہ تو نہیں۔ لیکن بعض اجزا کو میں نے پھر دہرایا ہی اور یہ میں نے قصداً کیا ہی، ایک بڑی غلط فہمی ہمارے قدیم نصاب کے متعلق پھیلی ہوئی ہی۔ چاہتا ہوں کہ لوگ اس کے افادہ کو سمجھیں اور نہ اس وقت تو مقصد شیخ کبیر کے کلام کی تشریح تھی کہ شریعت یا دینی علوم کی تعلیم سے مقصود اگر عمل ہی اور وہی ہو بھی سکتا ہی تو اس لحاظ سے ہمارا قدیم نصاب قطعاً کافی تھا۔ اور ایسا آسان سہل الحصول تھا کہ جس طرح پہلے زمانہ میں اس کو مختلف عقلی علوم وفنون کے ساتھ جوڑا گیا تھا، اسی زمانہ میں بھی باآسانی، پرانے عقلیات کو نکال کر جدید علوم وفنون کے نصاب میں "اسلامیات" کے اس لازمی نصاب کو باآسانی ہم شریک کر سکتے ہیں تاکہ دینی و دنیوی علوم کے جو مختلف دو دھارے دو تلواروں کی طرح ہمارے ملک میں بہہ رہے ہیں، اور ان سے باہم خواص بھی کٹے جاتے ہیں، ان کا وقار برباد ہو رہا ہی اور عوام بھی ذبح ہو رہے ہیں، اس دو عملی کا خاتمہ ہو جائے۔ مذہب کو اپنی عملی زندگی میں شریک کرنے کا موقعہ اہل علم کی ہر جماعت کو براہِ راست حاصل ہو جائے

لیکن اگر بجائے عمل کے مذہب کو نکتہ نوازیوں اور دماغی زور آزمائیوں کی صرف مشق گاہ کی حیثیت سے آپ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یا بقول شاہ ولی اللہؒ علم حدیث کو قصاصوں کی خودنمائیوں کی تماشا گاہ بنانا چاہتے ہیں کہ جہاں کوئی ذرا سا اجنبی یا مشکل لفظ حدیث میں یا قرآن میں آیا، گویا شکار ہاتھ آیا اور بقول شاہ صاحب

"شواہد از کلام شعرا و اخوات کلمہ و اشتقاق و محال استعمال وغیرہ"

کا دریا بہنے لگا۔ ہر ہر سند کے ہر ہر راوی کے متعلق "احوال ایں قوم و سیرت ایشاں" کا بیان شروع کر دیا گیا۔ اور کہیں فقہ کے کسی مسئلہ کا ذکر آگیا تو "بر آں مسائل ضمیمہ یا عیسا تخریج" کا دروازہ کھل گیا اور ساری بحر الرائق اور شامی، عالمگیری اونڈیل دی گئی کوئی تاریخی قصہ ہاتھ آیا بس "بادنی مناسبت قصص عجیبہ و حکایات غریبہ" نوادر و امثال، محاضرات و مسامرات کی بھرمار شروع ہو گئی

شاہ ولی اللہؒ نے اگر درس حدیث[1] و قرآن کے اس طریقہ کے متعلق یہ فیصلہ صادر فرمایا ہی، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہی کہ درس کا یہ طریقہ "طریقہ قصاص است و قصد ازاں اظہار فضیلت و علم است بہ غیراں" تو انہوں نے کیا غلط لکھا ہی، مستعد طالب العلم پڑھنے کے بعد خود مطالعے کے ذریعہ سے جن چیزوں کو جان سکتا ہی اُسی کو سُنا سُنا کر اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ان چیزوں کے سمجھنے کی پوری اس میں صلاحیت بھی نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہی کہ بسا اوقات اضاعت وقت کا سبب ہو جاتا ہی اور وہی بات صادق آتی ہی جو ہندوستان کے ایک مشہور معقولی استاد کی طرف منسوب ہے ان کا قاعدہ تھا کہ تہذیب میں ملا جلال کی باتیں، اور ملا جلال میں شفاء و اشارات کی باتیں طلبہ کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس درجہ کے طلبہ کی سمجھ سے وہ اونچی باتیں باہر ہوتی تھیں، طلبہ جب پڑھ کر اُٹھنے لگتے تو خود ہی فرما دیتے کہ پڑھانے کو تو میں نے سب کچھ پڑھا دیا، لیکن میری تقریر میرے مصلیٰ سے باہر نہیں ہوئی، گھوم گھما کر اسی میں رہ جاتی ہی اور درس کے اس طریقہ میں خود نمائی ہی صرف ہو تو خیر متحمل بھی ہو سکتی ہی، آج تو جس چیز کا تجربہ ہو رہا ہی، فتنہ اور فساد کے جو دروازے بغیر کسی ضرورت کے کھولے جا رہے ہیں۔ تو جیسا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا تھا کہ "اے بیچارہ اگر خواندن برائے جدل ست مخواں" اس پڑھنے اور پڑھانے سے تو ملک کا جاہل ہی رہنا بہتر تھا، بلکہ پُرانے معقولی اگر اپنی خود نمائی کے لیے معقول کی کتابوں میں بال کی کھال نکالا کرتے تھے، میر زاہد اور ملا جلال کی ایک ایک سطر پر جھونپڑیاں ڈال ڈال کر خود بیٹھتے تھے اور طلبہ کو بٹھاتے تھے، حمد اللہ کے ایک مقام

---

[1] یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہی، دار العلوم دیوبند اور اس کے متعلقہ مدارس میں حدیث کا جو دورہ ہوتا ہی، اُس کی تاریخ یہ ہی کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنہ حادثہ کے مقابلہ میں جو غیر مقلدیت کی شکل میں نمایاں ہوا، بطور اختیاری مضمون کے حدیث کے دورے کا افتتاح کیا۔ ہندوستان کے مختلف مدارس سے فارغ ہونے کے بعد جن لوگوں کو تکمیل حدیث کا شوق ہوتا تھا وہ حضرت کے پاس جاتے تھے، اصل مقصود تو وہی دماغ کی اصلاح کے بعد دل کی اصلاح ہوتی تھی، لیکن ضرورت وقت کو دیکھ کے حضرت نے حنفی مذہب کی تائید کے طریقہ کا اضافہ درس میں فرما دیا، وہی دورہ گنگوہ والا دیوبند میں جاری ہی۔ بجز ایک ترمذی کے عموماً نو مہینے میں صحاح ستہ بطور سرد کے ختم کرا دی جاتی ہے۔ ۱۱۲۰۔

"وجود رابطی" پر خدا ہی جانتا ہے کہ اس زمانہ میں کتنے رسائل تصنیف ہوئے تو یہ ایک غیر دینی چیز کے ساتھ ملعبہ تھا، اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک قسم کی دماغی ورزش طلبہ کو کراتے تھے، لیکن دین کو دماغی عیاشیوں کا تختۂ مشق بنانا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ علوم کی قدر ضروری و غیر ضروری، مفید و مُضر کے متعلق ان لوگوں کے جو خیالات تھے جن کے ہاتھ میں ہندی مسلمانوں کی باگ قدرت نے سپرد کی تھی، میری مُراد خواجگانِ چشت کے اکابر سے ہے وہ آپ کی نظر سے گذر چکے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان بزرگوں نے اس باب میں جو رائے قائم کی تھی اس پر اب بھی کوئی اعتراض کر سکتا ہے ہندوستان کے علماء عموماً چونکہ انہیں بزرگوں کے زیر اثر رہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے جو ان کی علم کے متعلق رائے تھی اُسی کے ماتحت یہاں کا علمی نصاب رہا، باقی یہ سوال کہ علم کے جس قدر ضروری کو عمل کی شکل وہ دیتے تھے اس کی کیا صورت تھی اور اس کا کیا طریقہ تھا۔ یہی دراصل اصل سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان عموماً اور علماء خصوصاً اس پر غور کریں۔

علم کی تعمیلی شکل خواجگانِ چشت میں

دوسرے طرق و سلاسل کے مقابلہ میں کسی فخر و امتیاز کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ ہمارے بزرگوں کا جو طریقۂ کار تھا، اُس کی مثالیں پیش کرنی ہیں، اور ان مثالوں سے تربیت و اصلاح کے جن اصولی ضوابط کا سُراغ ملتا ہے، صرف ان کی طرف اشارہ کرنا، غرض صرف اتنی ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ان لوگوں کے متعلق جو "قدرِ علم" کے عام نصاب سے فارغ ہونے کے بعد ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، طبعًا دو طریقۂ کار اختیار کیے جاتے تھے، یعنی ایک تو وہی تزکیہ، یا چاہیے تو صاف اور عام تعبیر میں یہ کہیے کہ صفائی کا کام کیا جاتا تھا، ہم سلبی اور منفی طریقۂ کار اس کا نام رکھتے ہیں اور دوسری بات "تحلیہ" یعنی صفائی کے بعد جن صفات کی پرورش ان کے پیشِ نظر تھی اس کی عملی راہ پر لوگوں کو لگانا، نفوس کو ان صفات و ملکات سے آراستہ و پیراستہ کرنا۔

تزکیہ اور صفائی

یوں تو تزکیہ کے ذیل میں بیسیوں چیزیں آتی ہیں لیکن خیر و شر کے اس مجموعہ میں جس کا نام "الحیوٰۃ الدنیا" ہے جس کی کوئی بھلائی بُرائی سے جُدا ہو کر نہیں پائی جاتی اور کوئی بُرائی ایسی نہیں ہے جس میں بھلائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہو حتیٰ کہ بقول عارفِ شیراز

چراغ مصطفوی با شرار بولہبی ست

اسی چمن کا ایک بہترین پھول علم کا بھی پھول ہے، لیکن قرآن کے حوالہ سے گذر چکا کہ اس پھول میں بھی

کلا ان الانسان لیطغیٰ ہوشیار! کہ انسان ضرور سرکش ہو جاتا ہے

کا کانٹا بھی چھپا ہوا ہے، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ ایک دن فرمانے لگے کہ آدمی

"چوں علم بیاموزد او را شرفے حاصل آید" ص ۴۴ فوائد

اور اگر یہ علم کہیں دین کا علم ہوا اور دینی علم کے مطابق روزے نماز میں بھی کوئی لگ گیا، تو پھر کیا کہنے ہیں۔ "چوں طاعت کند کار او بہتر رود" سودا خوب چل نکلتا ہے، انگلیاں اُٹھنے کے لیے، آنکھیں جھانکنے کے لیے ہر طرف تیار ہو جاتی ہیں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ علم اور عمل کی اس مجموعی کیفیت سے "پندار" کا فاسد مواد عالم کے دماغ میں پکنے لگتا ہے، یہی وقت ہوتا ہے کہ بساطِ علم کے ان تازہ نو واردوں پر کوئی پختہ کار "پیر باید تا ہر دو را بشکند یعنی علم و عمل را از نظر او فرو آرد"

"علمی پندار" کی ریاح جب دماغوں میں بھر جاتی ہے اور ان مسکینوں کی گردنیں ان ہی ہر یلی گیسوں سے اکڑ کر رہ جاتی ہیں، اس وقت اس کھنچی ہوئی گردن کو نرمانے کے لیے نشتر کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ سب سے بڑا سرطانی پھوڑا جس کا نام "خود پسندی" اور "عجب" ہے اس کی ٹیس سے انسانی روح کو نجات مل جاتی ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں "تا بہ عجب (خود پسندی) مبتلا نہ شود"

بہر حال یہ پہلی سلبی کارروائی ہوتی ہے جو اس راہ میں اختیار کی جاتی ہے، سلطان المشائخ کا علاج شیخ کبیر نے اس سلسلہ میں کس طریقہ سے کیا تھا، بعد کو اس کا ذکر خود کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ

"مولنا بحاث" اور "محفل شکن" کے خطابات لے کر مولانا نظام الدین کے نام سے سلطان جی شیخ کبیر، شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، پہلا کام شیخ نے یہی کیا کہ باوجود سب کچھ لکھ پڑھ چکنے کے حکم دیا کہ نظام تمہیں کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی پڑینگی، اسی بنیاد پر عوارف کا سبق شروع ہوا، غالباً چند ہی اسباق ہوئے ہونگے کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جو نسخہ عوارف کا شیخ کبیر کے ہاتھ میں تھا" ہمانا کہ نسخہ بود بخط باریک نوشتہ باسقیم گونہ" یعنی اس نسخہ کا خط باریک تھا، یا اس کی لکھائی گونہ اچھی نہ تھی، ہوا یہ کہ "شیخ را درمیاں ان اندک سکتہ بود" یعنی شیخ کبیر کچھ اس مقام پر اٹکنے لگے، بیچارے بوڑھے آدمی، وہ تو اس عبارت میں غور کر رہے تھے، ادھر جوان عالم کے جوان علم کے گرم خون میں جوش آیا، سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ

"من نسخہ دیگر بخدمت شیخ نجیب الدین متوکل علیہ الرحمۃ دیدہ بودم"

اسی "دیدہ بودم" کے ذریعہ سے اپنی وسعت نظری کا اظہار فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ کبیر کے سامنے یہ الفاظ کیا کہ "شیخ نجیب الدین نسخہ صحیح دارد" بس "دیدہ بودم" کے علم کا ادھر اظہار ہوا اور دوسری طرف سے ایک آواز جس میں ہیبت ملی ہوئی تھی سلطان المشائخ کے کان سے ٹکرانے لگی۔ "درویش را قوت تصحیح نسخہ سقیم نیست" ایک دفعہ نہیں بار بار شیخ کبیر اس فقرہ کو دہراتے جاتے تھے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا کہ یہ اشارہ کس کی طرف ہے لیکن چند بار مکرر سہ کرر یہی الفاظ شیخ کبیر کی زبان مبارک سے نکلتے رہے تو جماعت کے دوسرے ساتھی مولانا بدر الدین اسحٰق نے سلطان جی کو اشارہ کیا کہ خطاب تمہاری طرف ہے۔ سلطان جی کے ہوش اڑ گئے۔ فرماتے ہیں کہ "سر برہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم" شیخ کبیر کے قدموں پر "محفل شکن" "مولانا بحاث" کا سر پڑا ہوا تھا کہنے جاتے تھے۔

"نعوذ باللہ منہا کہ مرا مقصود ازیں سخن کنایتے بہ مخدوم بودہ باشد"

وہ یہ سمجھے کہ شیخ کبیر نے شاید میرے اس بیان سے کہ شیخ نجیب الدین کا نسخہ صحیح ہے اپنی اہانت محسوس کی اسی کی معافی چاہ رہے تھے، حالانکہ واقعہ تو کچھ اور تھا، فرماتے ہیں کہ

میں عرض کر رہا تھا کہ

"من نسخہ دیدہ بودم ازاں حکایت کردم مرا اصلا چیزے دیگر در خاطر نہ بود"

اور اسی "دیدہ بودم" کے پیچھے تو وہ بات چھپی ہوئی تھی جس پر یہ قیامت برپا ہوئی تھی خلاصہ یہ ہے کہ "من معذرت می کردم از بے رضائی ہمچناں در شیخ می دیدم" جرم ناقابلِ عفو قرار پایا سب کچھ تج کر جو کسی کے آستانہ پر آیا تھا صرف ایک دیدہ بودم کے دعوے نے اس کو اس حال میں پہنچا دیا۔ صادق اور کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا دنیا دیکھ رہی تھی اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے، کیا مولانا بحاث اور "محفل شکن" ہی کے لقب کو لے کر دنیا سے واپس چلے جائینگے جیسے لاکھوں ہی بحاث اور محفل شکن آئے اور چلے گئے یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے ورنہ سچ یہی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

"چند کلیاں" جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے، ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور میں نے غلطی ہی کیا کی ہے۔ ایک اچھے نسخے کا علم تھا اس کا اظہار کیا گیا تھا، پھر اس پر اتنی برہمی کے کیا معنی؟ یہی شوشہ اگر سامنے آجاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا، اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے، مزاج میں تندی اور غصہ ہے۔ العیاذ باللہ۔ آگے بڑھ کر تو اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت بھی قرار دیا جا سکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لے کر سلطان جی چاہتے تو "اسوۂ حسنہ نبویہ" کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنا علاج کرانے کے لیے آئے تھے شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ "معالج" "طبیب" ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔ بہر حال فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر

کی "بے رضائی" کو ایک حال میں دیکھ کر مایوس مجلس سے اُٹھا، "برخاستم ندانستم کہ چہ کنم" "نہ دانستم چہ کنم" یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے آج اجودھن میں نکل رہے ہیں، جو کل تک ہر محفل میں ہر سوال کا جواب دے کر محفل کا رنگ بگاڑ رہا تھا آج اُس کی قابل رحم نادانی اور "چہ کنم" کا یہ حال ہی، فرماتے ہیں۔

"مبادا ہیچ کس را آں چناں روز و آں چناں غم کہ مرا آں روز بود"

دماغ میں جواب پیدا ہونے کی جگہ دل میں غم کی لہریں اُٹھنے لگیں اور کیسی لہریں جس کی کسک آخر وقت تک نہیں بھولے تھے، دعا کرتے تھے کہ خدا کسی پر ایسا سخت دن نہ لائے اور ایسے غم میں کسی کو مبتلا نہ کرے، دل کے اس درد اور سینہ کی اس سوزش کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا جو ہمیشہ غم دیدوں کا آخری علاج ہی، خود وہی فرماتے ہیں "گریہ در من اُفتاد" اور یہی "گریہ" اصل مقصود تھا جس سے وہ سب کچھ دُھل جاتا ہی جسے اپنے ساتھ وہ دلی سے دلی کے مدرسوں سے لائے تھے، روتے تھے، روتے جاتے تھے کوئی چُپ کرنے والا بھی نہیں جب تک رونا ممکن تھا روتے رہے، آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، اب کیا کروں، فرماتے ہیں کہ "مضطرب و حیراں بیروں آمدم" سُننے والے سُن رہے ہیں "بیروں آمدم" یہ "بیرون آمدم" کس ارادے اور کس قصد سے ہوا ہی۔ "شیخ نجیب الدین نسخہ صحیح دارد" صرف علم کے اس دعوے نے آج رونے والے کو حجرے سے باہر نکالا ہی، اس لیے نکالا ہی کہ "تا رسیدم بر سر چاہے" کیا پانی پینے کے لیے، ہاتھ مُنہ دھونے کے لیے، غم کی گرمی میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے "بر سر چاہے" رسائی ہوئی ہی۔ انہی سے سُنیے جو اس کنوئیں کے کنارے آ کر کھڑے ہوئے ہیں:۔ "خواستم کہ خود را دراں چاہ اندازم" معالج نے علاج سے انکار کیا ہی اس مریض سے پوچھیے جو طبیب سے آخری جواب لے کر واپس ہوا ہو۔ نور اللہ ضریح السعدی حیث قال

ماجرائے دل دیوانہ بگفتم بہ طبیب — کہ ہمہ شب در چشم ست بفکرت بازم
گفت ازیں نوع حکایت کہ تو گفتی سعدی — درد عشق ست ندانم کہ چہ درماں سازم

پھر کچھ خیال آیا، کیا خیال آیا۔ "لا ایں بدنامی بہ کہ باز گردد" کنویں میں فقیر کو کس نے ڈھکیل کر مار ڈالا، اس تہمت میں کس کس کی گرفتاری ہو، فرماتے ہیں کہ اسی خیال نے "چاہ اندازم" کے خیال سے باز رکھا، عقل و ہوش کا تکلیفی سرمایہ اگرچہ گم ہو چکا تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ تحت الشعور "خودکشی" کے جرم کا خیال بھی مانع آ رہا ہو، بہر حال کنویں کی منڈیر سے نیچے اُتر آئے اور

"دریں محنت و حیرت سراسیمہ وار جانب صحرا بیروں رفتم"

اجودھن کی فضاؤں میں کسی کے نالہائے زار اب تک گونج رہے ہونگے، فرماتے ہیں،

"جانب صحرا بیروں رفتم با خود گریہ و زاری کردم"

خدا ہی جانتا ہے "گریہ و زاری" کا یہ طوفان کب تک اُمنڈ تا رہا، ہفتہ گزرا یا مہینہ، شیخ کبیر کے ایک صاحبزادے شہاب الدین لقب سلطان جی اور ان میں میل ملاپ تھا، موقع مناسب پا کر اُنہوں نے سلطان جی کا حال شیخ کبیر کے سامنے عرض کیا، جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ "بیا مدم سر در قدم مبارک آوردم" جرم کی معافی ہوگئی، معافی کے دوسرے دن پھر طلبی ہوئی اور ارشاد ہوا، جو راز تھا، اس سے پردہ اُٹھایا گیا۔ شیخ کبیر نے مولانا نظام الدین بحاث و محفل شکن کو جو اب صرف بابا فرید کے "نظام" بن چکے تھے مخاطب کر کے فرمانے لگے: "ایں ہمہ برائے کمال حال تو می کردم" مرید سے پیر کا کیا تعلق ہوتا ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اسی دن یہ راز بھی واضح ہوا شیخ کبیر نے فرمایا "پیر مشاطہ مرید باشد" مرید کی ساری ژولیدگیوں کو وہی سلجھاتا ہے میل کچیل کو دھو دھا کر صاف کرتا ہے، غازہ ملتا ہے، بال سنوارتا ہے اور یوں "یحببکم اللہ"[1] کے مقام پر پہنچا کر اُسے ملا، اعلیٰ کا اور ملا، اعلیٰ کا اثر ملا ء ادنیٰ پر، ملا ء ادنیٰ سے محبوبیت کی وہی کیفیت قلوب انسانی میں پھیل جاتی ہے[2]۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ

---

[1] خدا کے تم محبوب ہو جاؤ گے، اگر تم اپنے اندر میرا رنگ ڈھنگ، میری شان و ادا پیدا کرو گے، حضرت حق سے محبوبیت ذاتی کا جسے تعلق ہے، اسی کی زبان مبارک سے قرآن میں یہ اعلان کرایا گیا ہے، "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" کی آیت سے کون واقف نہیں ۱۲۔

[2] ایک صحیح حدیث جو عام طور سے مشہور ہے یہ اسی کا حاصل ہے ۱۲۔

اس ارشاد کے بعد "مرا خلعت فرمود و بکسوت خاص مرا مشرف گردانید" فوائد الفواد ص ۲۷

پندار و خود پسندی کا فاسد مواد اگر اتنے کا گزنشتر کے بعد بھی نہ نکلتا تو کب نکلتا، اس کے بعد سلطان المشائخ کا جو حال ہو گیا تھا، اس کی کیفیت بھی خود ہی بیان کرتے ہیں، شیخ کبیر نے سلطان جی کو ایک دعا سکھائی، پوچھا کہ اب سناؤ، سنانے لگے، ایک لفظ کے اعراب میں شیخ کبیر نے اصلاح فرمائی، فرماتے ہیں کہ گو جو اعراب میں نے پڑھا تھا "ہم معنی داشت" لیکن یہ تو ان کا نحوی علم تھا، اس سے دست بردار ہو چکے تھے۔ پس "ہمچناں کہ شیخ فرمود بخواندم" شیخ نے دوبارہ سنانے کے لیے حکم دیا، دعا سنائی گئی "واں شیخ فرمودہ بود ہمچناں بخواندم"

سلطان المشائخ فرماتے ہیں، میرے اس طریقۂ عمل کو مولانا بدرالدین اسحٰق دیکھ رہے تھے۔ جب شیخ کبیر کے سامنے سے اٹھ کر ان کے پاس آیا کہنے لگے "نیکو کردی کہ ایں اعراب ہمچناں خواندی کہ شیخ فرمودہ بود" سلطان المشائخ نے جواب میں کہا۔

"اگر سیبویہ کہ واضع ایں علم نحو، ست واں دیگراں کہ بانی ایں قواعد بودند بیایند

مرا گویند کہ اعراب ہمچناں نیست کہ می خواندی من ہمچناں بخوانم کہ شیخ فرمود"

یہ تھا صفائی کا پہلا مقام جس پر پہنچنے کے بعد

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

یہ تو پندارِ علم کی شکست کی تدبیر تھی جو اس زمانہ میں اپنے مریدوں کے ساتھ پیروں کا وہ طبقہ اختیار کرتا تھا جو واقعی ان کی مشاطہ گری کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا تھا لیکن علمی پندار سے بھی زیادہ ایک اور دوسرا عارضہ انسانی فطرت کو چمٹا ہوا ہے، عارضہ بھی ہے اور اسی پر ہماری ساری صحت مندیوں ترقیوں اور بلندیوں کا دار مدار بھی۔

انسانیت کا "معکوس فلسفہ" جو دنیا پر چھایا ہوا ہے، اب تو اس کا سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔ بہر حال سمجھ میں آئے یا نہ آئے مجھے تو ہندوستان کے ایک خاص عہد کی تاریخ بیان کرنی ہے جو واقعات گذرے ہیں ان کا اظہار مقصود ہے۔ سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے بات

یہ ہے کہ مذہب کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں بجائے اپنی مرضی اور اپنے دماغی مشوروں کے حق تعالیٰ کی اس مرضی کی پابندی کی جائے جس کا اظہار پیغمبروں کے ذریعہ سے فرماتا رہا ہے اور جس کی کامل ترین محفوظ ترین آخری شکل کا نام قرآن اور اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے خدا کی مرضی جب اپنی مرضی سے ٹکرانے لگے، اُس وقت خدا ہی کی مرضی کی رہنمائی قبول کر کے اسی کے تحت اپنے آپ کو ڈال دینا، اسی کی مشق کا اصطلاحی نام ہمارے بزرگوں میں یہ تھا کہ نفس کی خلاف ورزی کی مشق بہم پہنچانی چاہیے، قرآن کی آیت

ونھی النفس عن الھویٰ (القرآن الحکیم) اور رو کا نفس کو "الھویٰ" سے

سے ان کی یہ اصطلاح ماخوذ تھی، خدا کی مرضیات سے نفس کی جو خواہشیں متصادم ہوتی ہیں ان ہی کا قرآنی نام "الھویٰ" ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نفس کی عام خواہشوں پر آدمی کو قابو حاصل ہو جائیگا تو پھر جو خواہشیں مرضی حق کے مطابق نہ ہونگی اُن کو چھوڑ کر بآسانی اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے مطابق بنانے کی اُس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

آزادی اور حریت کے اس دور میں جس میں نفسانی خواہشوں کی تعبیر رائے کی آزادی، فکر کی آزادی اور خدا جانے کون کون سی آزادیوں کی خوبصورت الفاظ سے کر کے انسانیت کی بلندی کا معیار یہی اب یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جو شخص جس حد تک اپنی نفسانی خواہشوں کا پابند ہے اسی حد تک وہ آزاد ہے، حر ہے، اور جو حر ہے آزاد ہے۔ اسی پر بنی آدم کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی ہیں۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی معکوس اور اوندھی ذہنیت کے زمانہ میں "مخالفت نفس" کا نظریہ جس حد تک بھی بے معنی ہو کر نہ رہ جائے کم ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ پرانے ادبیات کی پیروی میں کم و بیش اب بھی اس لفظ کا استعمال دنیا میں باقی ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے، اس مشق کا کیا مقصد ہے، میں تو نہیں سمجھتا کہ کسی کے سامنے ان سوالات کے وہی جواب جو واقعی ان کے جواب تھے اب باقی

ہونگے، کچھ دھندلا دھندلا سا اس قسم کا تصور عالم لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ صوفیہ کے نقطۂ نظر سے گویا آدمی میں ثانوی قسم کا کوئی زندہ حیوانی وجود اور بھی ہے، جس کی دشمنی اور عداوت صوفیوں کے نزدیک ضروری ہے، حالانکہ واقعہ جو کچھ ہے وہ میں عرض کر چکا حق تعالیٰ کی مرضیات کے مطابق جو زندگی گذارنا چاہتا ہے، کیا اس مشق سے بے نیاز رہ سکتا ہے؟

بہرحال اب کسی کی سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن ایک زمانہ تھا جس میں کامیابی کا بڑا راز اسی مشق میں مستور سمجھا جاتا تھا، چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

"نفس آدمی بمنزلہ درختیست کہ بمد دہوائے شیطانی در ذات ایں کس بیخ می گیرد، ومحکم می شود اگر آدمی بتدریج وسکونت بزور عبادت وتقویٰ وبقوت محبت وعشق ہر روز آں درخت را بجنباند ہر آئینہ بیخ او سست شود، وقابل قلع گردد" سیر الاولیاء ۲۴۲

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے، تو پھر آدمی کو قوانینِ الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

فان الجنۃ ھی الماوی (القرآن الحکیم) جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

کا نظارہ اسی "نھی النفس عن الھویٰ" کی تعمیل کے بعد ہی سامنے آجاتا ہے،

خلاصہ یہ ہے، اس زمانہ میں خواہ جو بھی فیصلہ صادر کیا جائے، اور آزادی، حریت جس چیز کا بھی نام رکھا جائے، لیکن ہمارے بزرگوں کے نزدیک تو

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد　　کہ بستگان کمند تو رستگار انند

حقیقی آزادی کا صحیح ترجمہ یہی تھا، اس آزادی کی تلاش میں سلطان المشائخ شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، شیخ اس سلسلہ میں ان سے کیا کیا کراتے تھے اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اجزاء کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، میں نے بیان کیا تھا کہ سلطان جی جب اجودھن میں تھے تو اُن کا ایک رفیقِ درس بھی اس عرصہ میں اجودھن پہنچا، ان کی

اس حالت کو دیکھ کر جس میں بظاہر وہ مبتلا نظر آتے تھے اسے بڑا تعجب ہوا اور بولا کہ

"نظام الدین ترا چہ پیش آمد"

میں نے لکھا تھا کہ شیخ کبیر نے اسی زمانہ میں حضرت نظام الاولیاء کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ تمہاری موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہنا کہ

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو   ترا سعادت بادا مرا نگونساری

کیا شبہ ہے کہ سننے کی حد تک اور کہنے کی حد تک شعر بڑا لذیذ ہے لیکن جب اسی پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو کتنے ہیں جو سعادت کو چھوڑ کر نگونساری اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج نے صرف شعر سنانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اسی کے بعد آپ نے سلطان جی کو حکم دیا کہ "در مطبخ برو دیگوتا خوانے پر بالوان نعم آراستہ بیارند"

یہ اجودھن کا وہ وقت تھا کہ جہاں ایک مدت تک سلطان المشائخ کی روایت کے مطابق کہ شیخ کبیر نے جب شروع شروع

"در اجودھن ساکن گشت بنان درویشانہ دچیزہائے کہ دراں دیار خیزد چوں پیلو و مانند آں قانع گشت۔

لیکن اب وہ وقت باقی نہ تھا بلکہ "زآمد و شد خلق حد نہ بود" آنے والوں میں غیاث الدین[۱] بلبن جیسے سلاطین بھی تھے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس اجودھن کا کیا حال ہوگا۔

---

[۱] سلطان المشائخ ہی کی روایت ہے کہ جس زمانہ میں بلبن سلطان ناصر الدین محمود کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو ملتان جاتے ہوئے اجودھن بھی حاضر ہوا۔ ساری اسلامی فوج نے اجودھن کا احاطہ کر لیا تھا، ہر ایک شیخ کبیر سے تبرک حاصل کرنا چاہتا تھا، کوٹھے سے ایک آستین شیخ کی لٹکا دی گئی اور فوج کے لوگ اسی کو بوسہ دے کر آگے بڑھتے جاتے تھے تا اینکہ "آں ہم پارہ پارہ شد" القصہ بطولہا، آخر میں بلبن نے خدمتِ مبارک میں نقد اور چار گاؤں کا فرمان پیش کیا، گاؤں کے فرمان کو تو واپس کر دیا گیا، اور نقد فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے قبول فرما لیا گیا، بلبن نصیحت کا طلبگار ہوا، دو شعر سنا دیے گئے ؎

فریدون فرخ فرشتہ نہ بود   زعود و زعنبر سرشتہ نہ بود

زداد و دہش یافت آں نیکوئی   تو داد و دہش کن فریدوں توئی

نظام الاولیاء کا بیان ہے کہ

درخانہ بہ قیاس نیم شب کم و بیش نہ بستندے یعنی پیوستہ و ہانہ بودے و طعام و نعمت
موجود از کرم خدائے آئندہ و روندہ را از اں نصیب شدے، ہیچ بخدمت ایشاں
نیامدے کہ او را چیزے نصیب نہ گردے۔ (سیر الاولیاء ص ۶۵)

اور سچ تو یہ ہے کہ "تقوی" کی تاریخ میں۔

یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث — بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے کشائش کی راہ اور روزی
لا یحتسب — پہنچاتا ہے ایسی جگہ سے جہاں سے شان گمان بھی نہ ہو

کی قرآنی آیت کی ان تفسیروں کو دنیا نے کب نہیں دیکھا ہے، خصوصاً اسلام تو اراک (پیلو) ہی کے پھل کھانے والوں سے شروع ہوا اور "الوان نعم" پر ختم ہوا۔

بہر حال میں کیا کہنے لگا قصہ نظام الاولیاء کا سُنا رہا تھا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے ان کو مطبخ بھیجا کہ ایک "مکلف خوان" مرتب کر کے میرے پاس لایا جائے۔ خوان آگیا، کس لیے آیا، سلطان المشائخ ہی سے سُنیے فرماتے ہیں کہ مجھ ہی کو خطاب کر کے شیخ کبیر کا ارشاد ہو رہا تھا

"نظام! ایں خوان طعام را بر سر کن و در مقامے کہ آں یار فرود آمدہ است ببر"

ابھی جس ہم درس نے مولانا نظام الدین کو دلی میں محفل شکنی میں مصروف پایا تھا، اور اسی بنیاد پر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے چند گھنٹے پہلے اسی اجودھن میں اس حسن ظن کا اظہار کیا تھا کہ "اگر در شہر تعلیم می کردی، مجتہد زمانہ می شدی" اسی بیچارے "مجتہد زمانہ" کا یہ انجام ہے کہ اس کے سر پر خوانچہ رکھا جاتا ہے اور دو رویہ بازار کے بیچ سے بھری ہوئی مخلوق کے سامنے سے اسی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اس طعنہ دینے والے ساتھی کے پاس اس خوان کو لیجاؤ۔ خودداری کے گھاؤ سہنے والے اس ٹھیس کو کیا برداشت کر سکتے تھے؟ آزاد فکر، آزاد رائے کیا اس بوجھ کو اُٹھا سکتی تھی؟ "تا سعادت بادا مر انگو نساری" کی لذت صرف کانوں تک نہیں بلکہ جب روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے تو پھر سب کچھ اٹھایا جاتا ہے "مجتہد زمانہ" بننے والوں کے

اس حالت کو دیکھ کر جس میں بظاہر وہ مبتلا نظر آتے تھے اسے بڑا تعجب ہوا اور بولا کہ

"نظام الدین ترا چہ پیش آمد"

میں نے لکھا تھا کہ شیخ کبیر نے اسی زمانہ میں حضرت نظام الاولیاء کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ تمہاری موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہنا کہ

نہ ہمری تو مرا راہ خویش گیر برو — ترا سعادتؒ بادا مرا نگونساری

کیا شبہ ہے کہ سُننے کی حد تک اور کہنے کی حد تک شعر بڑا لذیذ ہے، لیکن جب اسی پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو کتنے ہیں جو سعادت کو چھوڑ کر نگونساری اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج نے صرف شعر سنانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اسی کے بعد آپ نے سلطان جی کو حکم دیا کہ "در مطبخ برد و بگو تا خوانے پر با لوان نعم آراستہ بیارند"

یہ اجودھن کا وہ وقت تھا کہ جہاں ایک مدت تک سلطان المشائخ کی روایت کے مطابق کہ شیخ کبیر نے جب شروع شروع

"در اجودھن ساکن گشت بنان درویشانہ بہ چیز ہائے کہ دراں دیار خیزد چوں پیلو و مانند آں قانع گشت۔"

لیکن اب وہ وقت باقی نہ تھا بلکہ "از آمد و شد خلق حد نہ بود" آنے والوں میں غیاث الدینؒ بلبن جیسے سلاطین بھی تھے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس اجودھن کا کیا حال ہو گا۔

---

[1] سلطان المشائخ ہی کی روایت ہے کہ جس زمانہ میں بلبن سلطان ناصر الدین محمود کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو ملتان جاتے ہوئے اجودھن بھی حاضر ہوا۔ ساری اسلامی فوج نے اجودھن کا احاطہ کر لیا تھا، ہر ایک شیخ کبیر سے تبرک حاصل کرنا چاہتا تھا، کوٹھے سے ایک آستین شیخ کی لٹکا دی گئی اور فوج کے لوگ اسی کو بوسہ دے کر آگے بڑھتے جاتے تھے تا اینکہ "آں ہم پارہ پارہ شد" والقصہ بطولہا، آخر میں بلبن نے خدمت مبارک میں نقد اور چار گاؤں کا فرمان پیش کیا، گاؤں کے فرمان کو تو واپس کر دیا گیا، اور نقد فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے قبول فرما لیا گیا، بلبن نصیحت کا طلبگار ہوا، دو شعر سنا دیے گئے ؎

فریدون فرخ فرشتہ نہ بود — ز عود و ز عنبر سرشتہ نہ بود
ز داد و دہش یافت آں نیکوئی — تو داد و دہش کن فریدوں توئی

نظام الاولیاءکا بیان ہے کہ

درخانہ بہ قیاس نیم شب کم وبیش نہ بستندے یعنی پیوستہ وہ بازبودے وطعام ونعمت

موجود از کرم خدائے آئندہ وروندہ را ازاں نصیب شدے، ہیچ بخدمت ایشاں

نیامدے کہ اورا چیزے نصیب نہ گردے۔ (سیرالاولیاء ص ۶۵)

اور سچ تو یہ ہے کہ "تقوی" کی تاریخ ہیں۔

یجعل لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث　　بنا دیتا ہے اللہ اس کے لیے کشائش کی راہ اور روزی

لایحتسب　　پہنچاتا ہے ایسی جگہ سے جہاں سے شان گمان بھی نہ ہو

کی قرآنی آیت کی ان تفسیروں کو دنیا نے کب نہیں دیکھا ہے، خصوصاً اسلام تو اراک (پیلو) ہی کے پھل کھانے والوں سے شروع ہوا اور "الوان نعم" پر ختم ہوا۔

بہرحال میں کیا کہنے لگا قصہ نظام الاولیاء کا سنا رہا تھا کہ شیخ کبیر شکر گنج نے ان کو مطبخ بھیجا کہ ایک "متکلف خوان" مرتب کرکے میرے پاس لایا جائے۔ خوان آگیا، کس لیے آیا، سلطان المشائخ ہی سے سنیے فرماتے ہیں کہ مجھ ہی کو خطاب کرکے شیخ کبیر کا ارشاد ہو رہا تھا

"نظام! ایں خوان طعام را بر سر کن و در مقامے کہ آں یار فرود آمدہ است ببر"

ابھی جس ہم درس نے مولانا نظام الدین کو دلی میں محفل شکنی میں مصروف پایا تھا، اور اسی بنیاد پر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے چند گھنٹے پہلے اسی اجودھن میں اس حسن ظن کا اظہار کیا تھا کہ "اگر در شہر تعلیم می کردی، مجتہد زمانہ می شدی" اسی بیچارے "مجتہد زمانہ" کا یہ انجام ہے کہ اس کے سر پر خوانچہ رکھا جاتا ہے اور دو رویہ بازار کے بیچ سے بھری ہوئی مخلوق کے سامنے سے اسی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اس طعنہ دینے والے ساتھی کے پاس اس خوان کو لیجاؤ خودداری کے گھاؤ رکھنے والے اس ٹھیس کو کیا برداشت کر سکتے تھے؟ آزاد فکر، آزاد رائے کیا اس بوجھ کو اٹھا سکتی تھی؟ "تا سعادت با دام انگو نساری" کی لذت صرف کانوں تک نہیں بلکہ جب روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے تو پھر سب کچھ اٹھا لیا جاتا ہے "مجتہد زمانہ" بننے والوں کے

سامنے وہی آدمی چلا جاتا ہی، سر پر خوانچہ لیے چلا جاتا ہی، دیکھو مولانا نظام الدین اسی حال میں "اجودھن" کے بازار سے گذر رہے ہیں خود فرماتے ہیں۔

"من بحکم فرمان خواجہ آں خوان را بر سر گرفتم و رواں شدم و در سرائے کہ آں یار فرود آمد بود آوردم"

"مجتہد زمانہ" ہونے کی صلاحیت کا حسن ظن رکھنے والا سلطان جی سے کس حد تک متاثر تھا، اس کا اندازہ آپ اسی سے کیجیے کہ خود حضرت ہی کا بیان ہی۔

"چوں نظر آں یار بر من افتاد گریہ کناں دوید"

جو دلّی میں اتنا بلند تھا کہ دنیا اس کو سر پر اُٹھائے ہوئے تھی آج وہ ایک معمولی خدمتگاروں کی مانند بر سر بازار اپنے سر پر خوانچہ لیے چلا آرہا ہی۔ یہ حال تھا ہی اتنا رقت انگیز کہ وہ چیخ اُٹھا روتے ہوئے دوڑا "وخوان از سر من فرود آورد و پرسیدن گرفت کہ ایں چہ حال ست"، سلطان جی اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ ع "کاں تحمل کہ تو دیدی ہمہ بر باد افتاد"

جو دل چاہی، دماغ چاہے، وہ نہ چاہا جائے، اس کی مشق گاہ میں یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہی، جھوٹی عزت اور جھوٹے ناموس کا علاج کرنے والے یہی علاج کرتے ہیں، سننے والا اور دیکھنے والا بھی آدمی تھا، انسان کسی حال میں بھی کوئی دلدل میں پھنسا ہو لیکن حقیقت شناسی کے فطری جواہر پھر بھی انہی کیچڑوں میں کسی سخت ضرب سے چمک اُٹھتے ہیں اب وہ بھی روشنی میں تھا، اعتراف کرنے لگا کہ

"ایں چنیں شیخے معظمے داری کہ نفس ترا بدیں حد ریاضت دادہ ست"

"نفس ترا بدیں حد ریاضت دادہ ست" یہ تھی سارے قصہ کی روح جسے افسوس اس زمانہ میں وہ بھی پا لیتے تھے جو کچھ پائے ہوئے نہ تھے، اس نے بھی شیخ کبیر کی قدمبوسی کی تمنا ظاہر کی، سلطان جی نے کھانا کھانے پر اصرار کیا، کھانا کھا لیا گیا، اب خوانچہ خالی ہو چکا تھا، سلطان جی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

دانشمند (یہی ان کا عالم دوست) خدمتگار خود را گفت کہ این خوان بر سر کن برابر ما بیا"
وہ خدمتگار سے یہ کہہ رہا تھا، لیکن خدمت لینے والے نے یہ خدمت جس کے سپرد کی تھی۔
"خیر چنانکہ اں خوان آوردہ ام ہمچناں ببرم و برسانم"
کہتے ہوئے جس خوان کو ان کے شیخ نے سر پر چڑھایا تھا، پھر سر پر اٹھالیا، دانشمند مجبور تھا،
کیا کرتا، اسی حال میں" آں دانشمند برابر سلطان المشائخ بخدمت شیخ شیوخ العالم آمد"
اس قصہ کے براہ راست راوی حضرت چراغ دہلوی نے یہ فرماکر فقرہ کو ان الفاظ
پر ختم کیا: "و از سر رعونت را بر خاک درگاہ آں بادشاہ اہل محبت نہاد" (سیر الاولیا، ص ۲۴۰)
میر خورد نے چراغ دہلوی کی زبان مبارک سے اس قصہ کو سن کر اپنی کتاب میں درج
کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "انتباہ فی
سلاسل اولیاء اللہ" میں طریقہ چشت کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

مخالفۃ النفس راس العبادۃ وموافقۃ الناس اساس الکفر۔ "النفس کی مخالفت (چشتیوں) کے یہاں عبادت کی جان ہے، اور عام راہ و رسم کی پابندیوں میں پھنسے رہنا یہ ان کے یہاں کفر کی بنیاد ہے۔

اور یہ کہ "النفس ہو الصنم الاکبر" (چشتی صوفی نفس کو "صنم اکبر" کہتے ہیں۔
چشتی مجاہدات کی یہی بنیادی اینٹ ہے، ان کا "طریقہ خاص" جیساکہ شاہ صاحب نے اسی کے
بعد نقل کیا ہے، اس دستور پر مبنی تھا
"گر حیاتِ خوب" خواہی نفس را گردن بزن زانکہ از نفست قوی تر ہیچ دشمن دار نیست"
اور "حیات خوب" "ستھری زندگی" کے حاصل کرنے کی یہ سلبی شرط تھی، یعنی اپنی مرضی، اپنی خوشی
اپنی خواہش سے جس وقت بھی دست بردار ہونے کا حکم دیا جائے، آدمی اسی وقت بغیر کسی
کشمکش لیت و لعل کے دست بردار ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس ملکہ کو پیدا کرنے کی صورت
اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گو "طریقۂ چشت" میں مجاہدہ کے اس پہلو پر بظاہر زیادہ زور دیا جاتا ہے، اور راہ کی پہلی منزل یہی ٹھہرائی گئی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اور بھی جتنے دوسرے طرق و وسائل ہیں، اس کی مشق تو سب ہی میں کرائی جاتی ہے، حتیٰ کہ اس حد تک تو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب کے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک نفس کی مخالفت کی مشق بہم نہیں پہنچائی جائیگی غیب کی راہ آدمی پر نہیں کھلتی، جوگیوں سے، یوگیوں سے راہبوں سے جس سے بھی آپ پوچھینگے پہلی بات وہ آپ کے سامنے یہی پیش کریگا، اور وہ دل ہلا دینے والے ریاضات ہائلہ جن کا انتساب مختلف مذاہب کے درویشوں، اور فقیروں کی طرف کیا جاتا ہے، دریافت سے معلوم ہوگا کہ سب کی تہ میں یہی بات چھپی ہوئی ہے، گو جس کا مطالبہ کیا گیا تھا، غلو[1] پسند انسان جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے اپنے "نشان زدہ" حدود پر ٹھہرا نہ رہا، اور نفس کی مخالفت میں بڑھا، تو اتنا بڑھا کہ جس مقصد کے لیے یہ مشق تھی خود اس مقصد کی مخالفت کی بھی پروا نہ کی گئی، مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشوں کی مخالفت کے مشق کی غرض جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہی تھی کہ حق کی مرضیات کی تعمیل آدمی پر آسان ہو جائے، لیکن دیوانوں نے مخالفت نفس ہی کو مقصد بنالیا، اور اس حد تک اب اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے کہ خدا کی مرضی کی بھی اس سلسلہ میں اگر مخالفت ہو رہی ہے تو اس سے بھی وہ بے پروا ہو گئے۔

خصوصاً ہمارے ملک ہندوستان نے تو "مخالفت نفس" کے مسئلہ میں وہ وہ عجیب تماشے تاریخ میں پیش کیے ہیں کہ شاید دنیا اس کی نظیر کے پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس ملک کے ہندو درویشوں ہی کا ایک فرقہ وام مارگی فرقہ تھا جو تنہائی میں عورتوں

---

[1] غلو کی ایک اچھی مثال مولانا غلام علی نے نقل کی ہے، حضرت برہان الدین غریب کے ایک مرید مولانا شمس الدین فضل اللہ نامی تھے ایک دن جوش میں آکر شیخ سے عرض کرنے لگے "ایں بیچارہ می خواہد کہ ترک عمل واورادمی کند، شیخ نے پوچھا کیوں تو بولے کہ قرآن میں ہے من عمل صالحاً فلنفسہ جو عمل نیک کرتا ہے اپنے نفس کے لیے کرتا ہے، بولے کہ من برائے نفس گندہ خود عمل نخواہم کرد ص۱۲ ظاہر ہے کہ اسی کا نام غلو ہے۔ شیخ مسکرائے اور فرمایا "فرمان چنین ست باید کرد۔ اور جب فرمان کے مطابق ہوا تو نفس کے لیے کب رہا ۱۲

اور مردوں کے مخلوط مجمع نیں شراب پی پی کر اس کا امتحان لیتا تھا کہ عورتوں کے متعلق مردوں کو اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں سارا بر اعظم ہند ایسی خانقاہوں اور آشرموں سے بھرا ہوا تھا جن میں جوان مرد اور جوان عورتیں عریاں ہو کر نفس کشی کی مشق کرتی تھیں، اور بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہوگئی تھی، الگھوری پنتھ کے فرقے بھی "مخالفت نفس" ہی کی ایک غلیظ نظریہ کے ساتھ اس ملک میں پیدا ہوئے اور اپنے سارے گندے کاموں کی تعبیر "نفس کشی" سے کر کے مدعی تھے کہ ان کی آتما (روح) اس طریقہ سے مہا آتما (روح اعظم) کے مقام تک پہنچ جاتی ہے، پنڈت دیانند سرسوتی جی کا ستیارتھ پرکاش میں یہ بیان بھی ہے، کہ اسی ملک میں نفس دشمن فرقوں میں ایک فرقہ "یا سمپردائے" ان لوگوں کا بھی تھا جو اپنے مسلک کی تعبیر "مانگ ودیا" سے کرتے تھے، پنڈت جی ہی نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کے یہاں مخالفت نفس کا سب سے اعلیٰ مقام یہ تھا کہ آدمی اپنی ماں سے بھی بدکاری کر گذرے کہ یہ سب سے بڑی مخالفت ہے نفس کی جس پر وہ کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا گویا جب یہ بھی کر گذرا تو اب اس راہ کی کوئی منزل باقی نہیں رہی اور یہی ہوتا ہے ہمیشہ انجام اُن لوگوں کا جو خدا کی باتوں میں اپنے دماغی وسوسوں کو شریک کر کے اسی کو اپنا مذہب ٹھہرا لیتے ہیں، ہا! کتنا پاکیزہ اصول تھا لیکن نفس کے بندوں نے نفس ہی کی موافقت میں مخالفت نفس کے نام سے کن تباہیوں اور بربادیوں کا اسے ذریعہ بنا دیا۔

بہرحال بہ انجام تو ان کا تھا جنہوں نے مخالفت نفس کے طرز عمل کو حق تعالیٰ کی مرضیات کی موافقت کا ذریعہ نہیں بلکہ خود اسی کو ایک اہم مقصد بنا لیا، لیکن ظاہر ہے کہ اسلام میں مخالفت نفس کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کی قیمت اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس مخالفت کو رضائے حق کی موافقت کا ذریعہ بنایا جائے،

مخالفت نفس کے سلبی اور منفی مجاہدہ کے بعد قدرۃً یہ سوال ہوتا ہے کہ اس مشق کی قیمت حاصل کرنے کی صحیح راہ کیا ہے؟ زندگی کو مرضیات حق پر بآسانی منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا

جب یہی اس مجاہدہ کی اصل غرض تھی، تو اب یہی تلاش کرنے کی چیز تھی، کہ "حق کی مرضیات" کے ملنے کی ایسی راہ کون سی ہے جس میں خالق کے سوا کسی مخلوق کے دماغی مشوروں کے کانٹوں سے اُلجھ جانے کا قطعًا اندیشہ نہ ہو، کیونکہ اگر خالق کی مرضی کے ساتھ ساتھ مخلوق کی مرضی پر بھی ہمیں چلنا ہے، تو پھر مخلوقات میں بجائے دوسروں کے خود اپنی مرضی ہی کی شرکت کے ساتھ خدا کی مرضی کی اطاعت ہم کیوں نہ کریں۔

دنیا کی جن قوموں کے پاس "خدا کی مرضی" جو پیغمبروں کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھی، جب "خالص خدا کی مرضی" باقی نہ رہی تو مخالفت نفس کی ساری ورزشوں کے بعد ظاہر ہے کہ اس ورزش سے نفع اُٹھانے کی کوئی صورت ہی ان کے پاس باقی نہ رہی غالبًا غیر اقوام و ادیان کے پیروؤں میں مخالفتِ نفس کی بوالعجبیوں کے رواج پذیر ہونے کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جس مقصد کے لیے ان کے بزرگ نفس کشی کراتے تھے، جب اس مقصد کا حصول ہی ان کے لیے ناممکن ہوگیا تو اُنھوں نے بذاتِ خود "نفس کشی" ہی کو اپنا بالذات مقصود بنالیا، چونکہ مخالفت نفس کی انتہائی ہولناک بلکہ مہلک غیر فطری شکلوں میں بعضوں کو "یکسوئی" کے مواقع ہاتھ آجاتے ہیں، آخر جس نے کھانا بھی چھوڑ دیا ہو، پینا بھی چھوڑ دیا ہو، پہننا بھی چھوڑ دیا ہو، ظاہر ہے کہ اس کے دماغ میں حرکت ہو تو کیوں ہو۔ انسانی دل و دماغ میں حرکت، و جنبش تو ان ہی ضروریاتِ حیات کی فراہمی کے لیے ہوتی ہے اور یہ ایک مذہبی نہیں بلکہ فطری بات ہے، انسان کی فطرت کا قانون ہے کہ یکسوئی کے بعد آدمی کی پوشیدہ قوتیں فعالیت کا رنگ اختیار کرلیتی ہیں، کیونکہ ضروریات حیات میں تژولیدہ قلوب ان قوتوں کے آثار سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو حیرت ہوتی ہے، لوگ ان پوشیدہ قوتوں کے کرشموں کے دکھانے والوں کے معتقد ہو جاتے ہیں، وہ مسکین یہ سمجھ لیتا ہے کہ لوگوں کا معتقد ہو جانا ہے، یہی مذہب کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اسی کو "وصول حق" قرار دے کر خود بھی فریب میں مبتلا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا کرتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اندھوں کے مقابلہ میں اگر سوانکھوں کے پاس بینائی کی قوت پائی جاتی ہے، ایسی بینائی جس سے رنگ روشنی وغیرہ کو دیکھ سکتا ہے، جن کے دیکھنے سے اندھے معذور رہیں، تو کیا یہ سوانکھوں اور بینائی والوں کا یہ حال اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا رسیدۂ اللہ کے برگزیدہ ہیں، چونکہ میں سنتا ہوں، اس لیے میں ولی ہوں، چونکہ میں دیکھتا ہوں اس لیے قطب ہوں۔ اگر دعویٰ اور دلیل کی یہ صورت مضحکہ خیز ہے تو پھر یہ بات کہ میں چونکہ تھاٹ ریڈر ہوں اس لیے ولی ہوں، مجھے اشراف علی الضمائر ہوتا ہے لوگوں کے قلبی اور دماغی خطرات کا علم ہو جاتا ہے اس لیے برگزیدۂ حق ہوں، میں کچھ پیش گوئیاں کر سکتا ہوں اس لیے رسیدۂ حق ہوں۔ بتایا جائے کہ دعویٰ اور دلیل کی ان صورتوں پر بھی ہنسی کیسے رک سکتی ہے، دین کا مقصد تو خدا کی مرضی کو خدا کی خالص مرضی کی شکل میں پانا ہے، کہ شخصی ہستی ہو یا کائناتی ہستی دونوں ہی معمہ کا حل اس مرضی کی یافت کے بغیر ناممکن ہے عقل اس معمہ کے حل میں درماندہ ہو چکی ہے۔

لیکن لوگوں نے بجائے اس کے باطنی قوتوں کے بیدار کرنے، احساس و علم کی بعض چھپی ہوئی طاقتوں کے ابھارنے ہی کا نام دین اور مذہب رکھ لیا، حالانکہ اگر اسی کا نام مذہب ہے تو پھر وہ بیچارا پہلوان جو مٹی اور گرد کو بازوؤں پر مل مل کر اپنے مسل اور عضلات میں مقاومت کی قوتوں کو برسر کار لاتا ہے، از کو یا جمناسٹک والے یا مداریوں کے تماشہ والوں کو بھی دین اور مذہب کی بلندی کا کوئی حصہ کیوں نہیں عطا کیا جاتا، آخر یہ لوگ بھی تو اپنی پوشیدہ قوتوں ہی کو بیدار کرتے ہیں، ان ہی چھپی ہوئی طاقتوں کو ابھارتے ہیں جن کے امکانات ان کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔

یہ ساری بے تمیزیاں، دراصل پیدا ہی اس سے ہوئیں کہ "حق کی مرضی" کو ان قوموں نے "حق کی مرضی" کی شکل میں باقی نہ رکھا، مقصود کا چہرہ نگاہوں سے چھپ گیا، وہ واپس ہوئے اور وہاں واپس ہوئے جہاں سے خدا ہی جانتا ہے کہ "مرضی حق" کی تلاش

کی طرف انہیں کب واپسی میسر آئیگی، وہ قومی نخوتوں کے شکار ہیں، اپنی قوم اپنے وطن اپنی زبان کے سوا کسی دوسری قوم کسی دوسرے ملک کسی دوسری زبان میں وہ "خدا کی مرضی" کو ڈھونڈھنا نہیں چاہتے حالانکہ جس ذات گرامی نے (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری دفعہ کامل ترین شکل میں "خدا کی مرضی" کو دنیا پر ظاہر کیا۔ اس نے اپنی دعوت کو، اپنی آواز کو اپنی ہمدردیوں کو کسی قوم کسی ملک کسی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا ہے، وہ جہاں کا رسول بن کر آیا ہے، عالمین کے لیے رحمت لے کر آیا ہے لیکن قومی نشوں کے متوالے اسے اب تک عرب ہی کا رسول اُمیوں ہی کا پیغمبر مسلمانوں ہی کا نبی باور کر رہے ہیں۔

میں پھر دور نکلا چلا جا رہا ہوں، عرض یہ کر رہا تھا کہ ہندوستان کے "خواجگانِ چشت" "مخالفت نفس" کی ممارست و مشق کے سلبی مجاہدے کے بعد پھر کس اثباتی مجاہدہ میں لوگوں کو مشغول کرتے ہیں؟

ایک سوال ہے اور بڑا بلکہ بڑے ہونے کے ساتھ دلچسپ سوال بھی ہے، میں نے ابتدا ہی میں اپنے دعوے کا اعلان کیا ہے کہ اس سلبی مشق کے بعد جس ایجابی مشغلہ میں اپنے وابستوں کو وہ غرق کرتے تھے، دنیا سن کر ضرور جھجکیگی، جن چشتیوں کا کام آج صرف گانا بجانا سمجھا جاتا ہے، یقیناً ان ہی کے متعلق یہ سن کر اچنبھا ضرور ہو گا، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ یقین خالص کے تحت دینی زندگی کو منظم کرنے کے لیے اس کتاب میں غوطے دیتے تھے جس کے سوا رب العلمین کی طرف منسوب ہونے والی کتابوں میں ریب اور شک سے دنیا کی کوئی کتاب اب پاک نہیں ہے جس ملک میں مذہب کو فلسفہ بنانے یا میتھالوجی بنانے میں آخری زور دکھلایا گیا ہو، میں نے عرض کیا تھا، اسی ملک میں اس کے سوا "چارہ کار" بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، کہ لوگوں میں "مرضی حق" کے اسی لاریبی مظہر اتم "القرآن الحکیم" کے ذریعے سے لازوال یقین کی روشنی پیدا کی جائے، اور یہی میرا دعویٰ ہے کہ "خواجگانِ چشت" کے طریقہ میں بھی ذکر و شغل، مراقبہ وغیرہ کے صوفیانہ مشاغل پائے جاتے ہوں، جیسا

کہ عام طور پر صوفیاءِ اسلام کے دوسرے طرق و سلاسل میں پائے جاتے ہیں یا نہ پائے جاتے ہوں لیکن جن بزرگوں کو سرزمینِ ہند میں "طریقۂ چشتیہ" کے معمارانِ اول کا مقام حاصل ہے۔ جہاں تک میں نے ان کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایجابی مجاہدات کے سلسلہ میں ان کا سارا زور "راسخ یقین" کی پیدائش پر مرکوز تھا جو قرآن سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ یقین کا یہی ایک ایسا سرمایہ یا کارگر حربہ ہو سکتا ہے جیسا کہ تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ اسی سے فلسفیانہ دین یا قصاصانہ دھرم والوں کا عملی مقابلہ ممکن ہے۔ اس "لازوال یقین" سے پیدا ہونے والی عملی زندگی کے سامنے یقین کیجیے کہ نہ وہ زندگی ٹھہر سکتی ہے جو فلسفیانہ نظریات کے زیرِ اثر منظم ہوئی ہو، اور نہ وہ زندگی جس پر صرف مبالغہ آمیز خوارق و عجائب کے افسانوں کا دباؤ ہو میں کہہ چکا ہوں کہ فلسفہ ہو یا افسانوی وسوسہ، ظاہر ہے کہ دونوں کی بنیاد میں صرف شک ہے ظن ہے تخمینہ ہے، رجم بالغیب ہے، جو کچھ کہا گیا ہے بے دیکھے کہا گیا ہے بے جانے کہا گیا ہے۔ دونوں طریقوں سے پیدا ہونے والی مذہبی زندگیوں کی گرفت دکھانے والے خواہ قوت کی جس شکل میں بھی دکھلاتے ہوں، لیکن جس کی آخری بنیاد میں یقین نہیں ہے انسانی فطرت پر اس کی گرفت اتنی سخت ہو ہی نہیں سکتی جو صرف کامل یقین ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ جس ملک میں کام کرنے کی خدمت چشت کے پیشواؤں کے سپرد ہوئی اس میں تو خوارق اور کرامتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا، میں بتا بھی چکا ہوں اور کون نہیں جانتا کہ "مخالفتِ نفس" کی پریکٹس نے عوام نہیں تو اس ملک کے خواص میں وہ ساری خصوصیتیں پیدا کر دی ہیں جن سے ان خوارق کا تعلق ہے جو ہر اُس شخص سے صادر ہو سکتے ہیں جس نے "مخالفتِ نفس" کی مشق کے ذریعہ سے یکسوئی پر قابو حاصل کیا ہو۔ اس کے لیے تو خدا کے ماننے کی بھی ضرورت نہیں، آج یورپ میں کتنے اسپرچولزم، مسمریزم، ہپناٹزم اور خدا جانے کون کون سے ازم والے ہیں، جن کی زندگی کو خدا کے عقیدہ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے، دیکھنے، سننے، سونگھنے، سمجھنے کی احساسی و ادراکی

قوتوں کے لیے اگر خدا کا ماننا ضروری نہیں ہی تو پھر اسی قسم کی بعض پوشیدہ ادراکی قوتیں اگر کسی کی برسرِ کار ہو جائیں تو اس کے لیے خدا کا ماننا کیوں ضروری ہو۔

مگر ظاہر ہی کہ ان سارے تماشوں سے سب کچھ ہو سکتا ہی، آدمی ہوا پر اُڑ سکتا ہی پانی پر چل سکتا ہی، دلوں کے بھید بتا سکتا ہی لیکن "معمہ کائنات" کے "یقینی حل" کی جو قدرتی راہ ہی، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "خالق کائنات کی مرضی" کی یافت کا جو طبعی طریقہ ہی اس سے بے تعلق ہونے کے بعد "یقین" و "سکینت" کی کیفیت سے وہ اسی طرح محروم رہیگا جیسے ایک عام آدمی کا حال ہی۔

اور یہی ایک چیز ہی جو قرآن کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے کسی کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

خواجگانِ چشت اور قرآن

"چشتی اور غزلوں کے دیوان" کی جگہ یہ واقعہ ہی کہ اس زمانہ میں "چشتی اور قرآن" کی ترکیب لوگوں کو ایک عجیب اکھڑی اکھڑی سی اَن میل بے جوڑ بات محسوس ہو رہی ہوگی، لیکن میں کیا کروں کہ میرے معلومات یہی ہیں، اور آپ کو چاہیے کہ میرے بیان سے پہلے انکاری یا استعجابی فیصلے کے صادر کرنے میں عجلت نہ کریں، تمہیدی گفتگو بہت طویل ہوگئی، مختلف اغراض و مقاصد کے تحت مجھے اپنی اس تمہید میں بہت سی باتوں کو طے کرنا تھا، خدا کرے جو میں نے سوچا ہی، وہی اثر قلوب پر مرتب بھی ہو۔ اب سیدھے سادے الفاظ میں اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے متعلقہ معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

یہ تو ظاہر ہی کہ خواجگانِ چشت میں پہلی ہستی جو اس ملک میں آئی وہ حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہی، ماننا تو مسلم ہی کہ حضرت خواجہ حافظِ قرآن تھے مناقب العارفین میں ہی کہ گھر سے نکلنے کے بعد حضرت خواجہ

"مدتے در سمرقند و بخارا ماند و حفظ قرآن و علوم ظاہری تحصیل کرد (ص ۲۵۰)

مگر اس سلسلہ میں حضرت والا کے متعلق مجھے جس تفصیل سے عرض کرنا ہے ابھی نامکمل ہونے کی وجہ سے میں ان کے متعلق سردست اسی پر اکتفا کر کے درخت پر بحث کرنے کے بجائے چاہتا ہوں کہ اس کے پھلوں کا کچھ ذکر کردوں۔

آخر جس درخت کے پھلوں کو ہم پہچانتے ہیں آپ مجھے روک نہیں سکتے، اگر خود اس درخت کے پہچاننے کا بھی دعویٰ کروں، اس لیے خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو اپنے بیان کو ملتوی، صرف ملتوی کرتے ہوئے ان کے بعد کی کڑیوں پر آتا ہوں سب جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں پہلا نام مبارک حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ المعروف بقطب صاحبؒ کا آتا ہے، حضرت قطب کے ان سلبی مجاہدات کا ذکر مقصود نہیں ہے جو اپنے مرشد کے زیر ہدایت انجام دیے گئے۔ کیونکہ نمونہ کے لیے میں شیخ کبیر کے طرز عمل کو پیش کر چکا ہوں، بتانا یہ ہے کہ جب سلب اور نفی کی ساری منزلیں طے ہو چکیں تو ان کا آخری مشغلہ کیا رہ گیا تھا؟ سنیے ان کے بیک واسطہ مرید و جانشین حضرت سلطان المشائخ کی شہادت سنیے۔ فوائد الفواد میں ہے حسن علا سنجری لکھتے ہیں، یہ بیان ۱۲ر شوال روز چہار شنبہ ۷۱۳ھ کا ہے

"بعدہٗ حکایت بزرگی شیخ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز فرمود"

کیا فرمائینگے، کیا یہ کہ قطب بختیار رحمۃ اللہ علیہ قرآن کی تلاوت بہت کیا کرتے تھے، یا یہ فرمائینگے کہ وہ حافظ تھے، بچپن میں انہوں نے قرآن یاد کیا تھا، نہیں یہ نہیں بلکہ

"فرمود، کہ در آخر عمر قرآن یاد گرفت چوں تمام محفوظ شداں گاہ نقل فرمود" ص ۹،

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جب سب کچھ کر چکے، تزکیہ و تصفیہ کے سارے مراتب سے فارغ ہو چکے ... تو دل اور دماغ کی جو تختی دھو کر صاف کی گئی تھی، اسی صاف شدہ تختی پر جو نقوش آخر عمر تک سرزمین ہند کے اسلام کا دوسرا بنیادی معمار ثبت کرتا رہا وہ صرف "یقین" و

"اذعان" کا وہی لاریبی سرمایہ تھا، جس کا نام "القرآن" ہے اس کے بعد زندگی کی آخری سانس تک یہی مجاہدہ جاری رہا، تا اینکہ جب یہ مجاہدہ بھی پورا ہو گیا، یقین کا یہ سارا سرمایہ ہضم ہو گیا تب "آں گاو نقل فرمود" یہ خواجہ بزرگ اجمیری قدس سرہ العزیز کے پہلے خلیفہ اور جانشین کے متعلق شہادت ہے، ایسی شہادت جس سے زیادہ معتبر قابل وثوق شہادت اور کیا مل سکتی ہے کہ خود سلطان المشائخ کا یہ براہ راست بیان ہے۔

طریقہ چشت کا جو پہلا پودا اس سرزمین میں آکر نصب ہوا، اس کے ایک ممتاز پھل (قطب صاحب) کے متعلق تو یہ رپورٹ ہے، عوام واقف نہ ہوں، لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ خواجہ اجمیری قدس سرہ کے ایک اور نامور خلیفہ حضرت حمید الدین الناگوری السوالی ہیں شیخ محدث ان کے ذکر میں لکھتے ہیں "از اعاظم خلفا حضرت خواجہ بزرگ معین الحق والدین است" صاحب سیر الاولیاء "ہم خرقہ شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ" سے ان کو روشناس کراتے ہیں، ہندستان کی اسلامی تاریخ کے ایک دلچسپ سوال کے جواب میں لوگ ان ہی حمید الدین الناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا نام پیش کرتے ہیں، یعنی دلی کو پایۂ تخت بنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کو باضابطہ دار الاسلام بنانے کا اعلان جب کیا، تو اس نئے جدید دار الاسلام میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا مسلمان کون تھا؟

شیخ محدث دہلوی نے خود خواجہ حمید الدین سے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے

"اوّل مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانۂ مسلمانان آمدم منم" اخبار، ص ۳۰۔

ابوالفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معزز دولتمند اسلامی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا، لکھتا ہے۔

شیخ حمید الدین سوالی ناگوری پور شیخ احمد در سر آغاز جوانی بس نکو روو خواستہ و ثروت داشت

راہ بوٗ، ص ۷)

یعنی صرف کسی خواستہ دار گھرانے ہی سے تعلق نہ تھا بلکہ بذاتِ خود بھی امیرانہ شکل و صورت

رکھتے تھے جو عموماً ناز و نعمت میں پلنے والوں کی خصوصیت ہے۔ درمیان میں کن ذہنی اور قلبی انقلابات سے گذرنا پڑا۔ بڑا طویل قصہ ہے، آخر میں اسی "نیکو رو خواستہ دار" نوجوان کو مارواڑ کے علاقہ ناگور (نواگرام) کے ایک گاؤں سُوالی میں ان کو دیکھا گیا۔ میر خورد نے لکھا ہے:۔

یک بیگہ زمین داشت نیم بیگہ ازاں بدست مبارک بکلبند (کدال) راست کردے دچیزے بکاشتے تا ایں غایت کہ آں رسیدے (فصل تیار ہو جاتی) نیم بیگہ دیگرے راست کردے دچیزے بکاشتے" (سیر الاولیا، ص۳۰)

خواجہ بزرگ نے اپنے محبوب اور راستباز مرید کو سلطان التارکین کا خطاب عطا فرمایا تھا، فرماتے، پیار کے لہجہ میں فرماتے

"التارک للدنیا والنازع عن العقبیٰ سلطان التارکین حمید الدین الصوفی" (اخبار، ص۳۰)

علوم رسمیہ میں بھی پایہ بڑا بلند تھا، عمر بھی کافی طویل ہوئی۔ بعض تحریری یادگاریں اب بھی پائی جاتی ہیں جن سے علمی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ علم کا جو بوجھ آپ پر لدا ہوا تھا جب ارادہ ہوا کہ ہم ہی اس پر لد جائیں، محمول کی جگہ علم ہی ہمارا حامل ہو جائے اسی کی عملی ترکیب سیکھنے خواجہ اجمیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خاندانی اعزہ نے بری طرح ان کا پیچھا کیا، ۔۔۔ کہ آخر میں ناصحانِ مشفق کو خطاب کر کے فرمایا۔

"بروید و بنشینید منکہ ازار بند خود چناں محکم[1] بستہ ام کہ فردا شاید بجوراں جنت ہم باز نکنم (سیر الاولیاء، ص۱۵۶)

---

[1] اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ برہم چاریوں کی زندگی آپ نے اختیار فرمائی تھی/ آپ بیوی بھی رکھتے تھے، بال بچے بھی ہوئے، نسل آپ کی مدتوں باقی رہی کیا تعجب ہے کہ اب بھی ہو، آپ کی بیوی صاحبہ کا ایک دلچسپ لطیفہ تاریخوں میں نقل کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ ناگور کے مقطع (صوبہ دار) نے شیخ سے چاہا کہ کچھ اس کی امداد قبول کریں، لیکن پذیرائی نہ ہوئی، اس نے بادشاہ غالباً نصیر الدین محمود یا التمش کو ان کے حالات لکھ بھیجے۔ دلّی سے پانصد تنکہ نقرہ دفرمان یک دیہ صوبہ دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو۔ صوبہ دار لے کر حاضر ہوا۔ آپ دیوانخانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صوبہ دار نے حال سُنایا، کچھ نہ بولے، اندر زنانہ میں تشریف لے گئے بیوی سے جا کر واقعہ کا ذکر کیا۔ اس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی پھٹی ہوئی تھی اور شیخ کی لنگی میں بھی پیوند تھے۔ (باقی بر صفحہ ۱۱۴)

آپ کے خطوط کا ایک بڑا مجموعہ حضرت زکریا بہاء الدین ملتانی کے نام ہے جن کا نقطۂ نظر اس راہ میں ابوذری نہیں، سلیمانی و عثمانی تھا، اس لیے دونوں میں سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ان کے مکاتیب کی قیمت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ

"کلمات او را از تصنیفات او انتخاب نمودہ" (ص ۳۰)

سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری ہندی خواجگانِ چشت میں جس مقام رفیع کے مالک ہیں اس کے لیے مذکورۂ بالا اجمالی تعارف غالباً کافی ہے اب سُنیے حضرت شیخ محدث دہلوی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سُنیے کہ ان کا طریقہ خاص جو صدیوں ان کے سلسلہ میں معمول بہ رہا وہ کیا تھا؟

واقعہ یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ دلی کی مرکزی حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر چند حصّوں میں جب تقسیم ہو گئی، تو ان میں ایک مستحکم علم دوست دین پژوہ حکومت شادی آباد مانڈو کی بھی تھی، شادی آباد مانڈو کے بادشاہوں میں ایک مشہور بادشاہ محمود خلجی ہیں جنہوں نے مالوہ کے سوا "تمام ولایت بوندی و مارواڑ بزور شمشیر برگرفت (سیر المتاخرین ص ۱۷۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) مگر سُنتے ہو اس حال میں بھی اسلام کی خاتون کا حال سُنتے ہو، شیخ سُن رہے تھے "اے خواجہ تو چہ می خواہی کہ فقر چندیں سالہ خود را باطل کنی، تو خاطر جمع دار من دو سیر ریسماں بدست خود رشتہ ام ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترا فوطہ (لنگی) و مرا دامنے (اوڑھنی) مرتب خواہد شد" (تذکرہ ص ۱۵۷) (دو سیر سوت کات لیا ہے) ظاہر ہے کہ جس کی بیوی کا یہ حال ہو اس کا شوہر سلطان التارکین اگر ہو جائے تو کیا تعجب ہے ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ میر خورد نے انتخاب کے طریقہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مطالعہ کی کتابوں میں نشان لگانے کا اس زمانہ میں کیا طریقہ تھا، اس کا پتہ چلتا ہے یعنی سلطان المشائخ بقلم مبارک خود بعلامت "ح" در حاشیہ اختیار کردے "ح" سے شاید ترجیح مُراد ہو یا صحت کا مخفف ہو، واللہ اعلم، ایک اور دلچسپ بات میر خورد نے یہ لکھی ہے کہ شیخ حمید الدین اور شیخ زکریا بہاء الدین میں خط و کتابت جو ہوتی تھی اُس میں ذریعہ یہ تھا کہ سوداگرے بود در ناگور کہ کنجد (تل) از ناگور در ملتان بردے و از ملتان پنبہ (روئی) در ناگور آوردے" یہی سوداگر دونوں کے درمیان ڈاکیہ کا کام انجام دیتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ مارواڑ ناگور وغیرہ میں روغنی دانے اور ملتان میں کپاس کی کاشت اُس زمانہ میں ہوتی

اسی وجہ سے اجمیر، ناگور وغیرہ کے علاقے بھی اسی کی دائرہ حکومت میں شریک ہو چکے تھے محمود خلجی کی عظمت و شوکت کا چرچا ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں تک پہنچا ہوا تھا، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہو۔

"خواجہ جمال الدین استرآبادی از جانب سلطان ابوسعید مرزا باگزیں ارمغان (قیمتی تحفوں) پیش آورید"

یعنی تیمور کے پوتے نے دربار مانڈو میں اپنی سفارت بھیجی تھی ہندوستان کی اس نئی طاقتور حکومت کا شہرہ سُن کر حسب دستور مختلف بلاد و امصار سے لوگ شادی آباد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، شاید پہلے بھی کہیں ذکر آیا ہو کہ علماء اور صلحاء کو اپنے شہر میں لا کر بسانے اور اپنے ملک میں آباد کرنے کا محمود کو خاص شوق بھی تھا، مآثر رحیمی میں محمود خلجی (سلطان مالوہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہو کہ

"چون سلطنت باوقار گرفت در تربیت علماء و فضلاء کوشید و مدارس ساختہ"

اس نے صرف یہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ

"زر بہ اطراف و اکناف عالم فرستادہ و مستعدان را طلب داشت"

اسی کتاب میں لکھا ہو کہ بادشاہ کے اس عجیب و غریب ذوق و شغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مالوہ کے جنگلوں کے بیچ کا یہ شہر[1] "درزمان ادیونانِ ثانی گشت"۔ ص۲۵

[1] ابوالفضل نے مانڈو کی اسمی توجیہ اور جنگل میں اس شہر کو بسا کر جس راجہ نے منگل بنایا تھا، یہ خرافی قصہ نقل کیا ہو کہ کسی کسان کی درانتی سنگ پارس، جو اس علاقہ میں "کارآگہاں ہندی نژاد" کے خیال کے مطابق پایا جاتا ہو، اس سے چھو گئی۔ بجائے سیاہی کے رنگ اس کا پیلا پڑ گیا، کسان غریب بیچارہ پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت آئی۔ مقامی لوہار کے پاس اصلاح کے لیے گیا، لوہار نے پہچان لیا کہ یہ تو سونا ہو گئی ہو، واقعہ پوچھا کسان نے اس پتھر کا پتہ دیا جس کا یہ کرشمہ تھا، لوہار نے اُس پتھر کو اُٹھا لیا، کچھ دن خود نفع اُٹھایا اور آخر میں اُس عہد کے راجہ بکرماجیت سنگھ دیو کی خدمت میں اس پتھر کو اس نے نذرگذران دیا۔ تمنا صرف یہ ظاہر کی کہ میرے نام سے یک قلعہ بنا دیا جائے۔ لوہار کا نام "مانڈن" تھا، اسی کے نام پر راجہ نے بارہ سیل کے دور میں قلعہ بنوایا، پتھر جو قلعہ میں لگائے گئے ہیں لوہار کی مناسبت سے سندان (نہائی) کی شکل کے ہیں۔ جب مالوہ کی (بقیہ بر صفحہ ۱۱۶)

بہرحال اطراف واکناف عالم میں روپے بھیج بھیج کر جن اہل علم وکمال والوں کو محمود خلجی نے مالوہ بلایا تھا اُن میں حضرت امام محمدؒ بن حسن الشیبانی صاحب ابی حنیفۃؒ الامام کے خاندان کے ایک بزرگ بھی تھے جنہیں بادشاہ نے تاج الافاضل کا خطاب دیا تھا، اجمیر شریف کی قضاءت ان کے سپرد ہوئی تھی۔ قیام گاہ راجپوتانہ کے مشہور شہر نارنول میں تھا جو کسی زمانہ میں شرفاء اسلام کا ایک بڑا مرکز تھا تاج الافاضل کے صاحبزادے علامہ مجدالدین الشیبانی تھے جو قاضی مجد کے نام سے مشہور تھے، قاضی مجد کے سات صاحبزادے تھے شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ

"قاضی مجدالدین راہفت پسر بود، ہمہ دانشمند (عالم) متقی ومتدین"

لیکن ان ساتوں بھائیوں میں شیخ احمد مجد شیبانی نے اپنے وقت میں بڑی عظمت وشہرت حاصل کی، یہ نارنول سے اٹھارہ سال کی عمر میں اجمیر شریف چلے آئے تھے۔ اجمیر شریف میں اس وقت سلطان التارکین خواجہ حمیدالدین ناگوری جن کا تعارف کرا چکا ہوں انہی کے خاندان کے ایک بزرگ خواجہ حسین ناگوری کی معرفت وہدایت کا چراغ روشن تھا۔ شیخ احمد مجد خواجہ حسین ناگوری ہی کے "شاگرد ومرید" (اخبار) ہیں۔ میں نے شیخ احمد مجد کے متعلق ذکر کیا تھا کہ عربی زبان پر ان کو اتنی دسترس حاصل تھی کہ "در عربی وفارسی تقریر کردے" (اخبار)

تقریباً چورانوے (۹۴) سال کی عمر ہوئی عمر کا زیادہ حصہ اجمیر میں گذرا لیکن وفات ناگور میں ہوئی شیخ محدث نے انہی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے معمولات میں ایک اہم ضروری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) مستقل حکومت کا مانڈو دارالسلطنت قرار پایا تو اس کا نام شادی آباد رکھ دیا گیا، لیکن چلا نہیں مسلمانوں نے اپنے عہد میں اس قلعہ کی عمارتوں میں بہت کچھ رد وبدل کیا، بلکہ گویا نیا قلعہ تعمیر کیا، ایک ہشت منظری مینار درمیان قلعہ میں تھا جس سے دور دور کے مقامات نظر آتے تھے شاہ ہوشنگ کی قبر پر جو گنبد ہے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ گرمیوں میں اُس سے پانی چھڑتا رہتا ہے، لوگ اس کو ہوشنگ کی کرامت خیال کرتے ہیں "ژرف نگاہ داند کہ حال چیست" واللہ اعلم ژرف نگاہ نے کیا تحقیق کی ہے، تقریباً ایک سو ستر سال تک مالوہ میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم رہی اکبر کے زمانہ میں دلی سے الحاق ہوگیا ۱۲۔

معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے" یہ بھی لکھا ہے کہ "ہفتاد سال
در اجمیر بر ہمیں منوال گذاردند"

مدارک پڑھاتے وقت ان پر جو حال طاری رہتا تھا شیخ محدث نے اُس کی تصویر
ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

"دربیان وعدہ وعید چنداں گریہ وحالت کردے کہ صوفیاں درحالت سماع کنند
وچشماں او را ز غایت بکا و بیداری سرخ ومرمد (آشوب (دہ) بودے"

لیکن اس شیبانی بزرگ نے اس طریقہ کو کیا ہندوستان سے باہر کسی دوسرے اسلامی ملک
سے یہاں داخل کیا تھا؟ مجھے اسی کے متعلق عرض کرنا ہے، شیخ محدث کی شہادت ہے

"وایں وظیفہ تفسیر مدارک طریقہ سلوک مشائخ ایشان ست"

"مشائخ ایشاں" کون لوگ ہیں، ایشاں کی شرح میں محدث ہی فرماتے ہیں۔

"کہ خواجہ حسین ناگوری وشیخ حمید الدین صوفی نیز ہمچنیں می کردند" (اخبار الاخیار ص۱۸۲)

مطلب اس کا اور کیا ہوا، کہ خواجہ حمید الدین صوفی جن کے متعلق آپ سن چکے کہ یکے از
اعاظم خلفا خواجہ بزرگ وہمخرقہ قطب الدین بختیار اوشی ہیں، یہ ان ہی کے عرفانی سلوک کا
طریقہ تھا۔

اب خود ہی غور کرنا چاہیے، کہ خواجہ بزرگ اجمیری کے دو ہی خلفا نے ہندوستان
میں خواجہ کی نیابت کا فرض انجام دیا۔ دونوں میں سے ایک کے متعلق سلطان المشائخ کی
یہ گواہی گذر چکی کہ کامل قرآن "چوں محفوظ شد آنگاہ نقل فرمود"
اور دوسرے صاحب کے متعلق محدث دہلوی کی شہادت ہے کہ "تفسیر مدارک" کو سلوک کا طریقہ
بنا کر اپنے سلسلہ میں اس کو رائج کیا: کہ اسی وظیفہ سے ان پر وہ حال طاری ہوتا تھا

"کہ صوفیاں درحالت سماع کنند"

کیا اسلام کا جو ایمانی و عرفانی شجرہ طیبہ سب سے پہلی دفعہ کفرستان ہند میں نصب ہوا، اس کے

دونوں پھلوں، خواجہ بختیار و خواجہ حمید رحمۃ اللہ علیہما کے اس رنگ و مزہ کو دیکھ کر ہم اس "شجرہ طیبہ" کے طریقہ سلوک کے متعلق فیصلہ کرنے میں اب بھی شک کر سکتے ہیں؟[1]

خواجہ بزرگ کو روپوش ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہی حضرت قطب صاحب زندہ ہیں اجمیر شریف کی جامع مسجد کے امام ایک بزرگ مادھو نامی ہیں۔ معلوم نہیں اصلی نام کیا تھا، سلطان المشائخ نے اسی نام سے ان کا تذکرہ کیا ہی، اجمیر کی جامع مسجد کے انہی امام صاحب کے سامنے سے ایک نوجوان لڑکا گذرتا ہی، احمد نام ہی، شیخ محدث نے لکھا ہی۔ "بافندہ بود" (ص ۷۴) آواز میں درد ہی، ہندی زبان کے گیت لوگوں کو سُنا رہا ہی۔ امام جامع اجمیر ان کو پاس بلاتے ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہی کہ اسی گانے والے نوجوان کو خطاب کر کے امام نے کہنا شروع کیا۔

"چنیں آوازے تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندوی خرچ کنی"

"یعنی جس قسم کی آواز تم رکھتے ہو افسوس کی بات ہی کہ ہندی گانوں میں اسے خرچ کرو" نوجوان پوچھتا ہی کہ پھر کیا کروں؟ اجمیر کو اجمیر والے نے جس فضا سے معمور فرمایا تھا کیا امام جامع کا یہ جواب فضا، کی اس تاثیر کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہی۔ اُنھوں نے مشورہ دیا سلطان المشائخ کے حوالہ سے فوائد الفواد میں مشورہ کا یہ فقرہ منقول ہی "فرمود کہ قرآن یادگیر" مشورہ قبول کیا جاتا ہی اور چند ہی دنوں میں ہندوی گیت والے بافندہ کے متعلق خبر ملتی ہی کہ "قرآن یادگرفت" (فوائد الفواد۔ ص ۱۷۴) کیا صرف "یادگرفت" کا تعلق محض الفاظ سے تھا، شیخ محدث نے لکھا ہی، خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سامنے جب یہی احمد جواب "خواجہ احمد نہروانی" کے نام سے مشہور ہوتے پیش ہوئے تو فرمایا۔

---

[1] اجمیر شریف میں اب بھی عہد خواجہ کا جو تبرک دکھایا جاتا ہی واللہ اعلم تاریخی سند اس کی کیا ہی لیکن کہتے ہیں کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہی جو خواجہ بزرگ کی تلاوت میں رہتا تھا، اگر صحیح ہی تو پیر و مرید دونوں کے ذوق کا ثبوت ملتا ہی کہ ۔

بعد مرنے کے مرے گھر سے تو قرآن نکلا

"اگر مشغولی احمد بسنجند مایۂ دہ صوفی باشد" (اخبار ص ۴۷) "یعنی دس صوفیوں کا سرمایہ ایک شیخ احمد کی مشغولی کے مساوی ہے"

شیخ محدث نے زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کی یہ رائے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ "شیخ الاسلام زکریا ملتانی قدس سرہ کم کسے راپسندیدے" لیکن جس نے قرآن پایا تھا، بھلا اس کی پسندیدگی میں بھی کسی کو شک ہوسکتا تھا، قول ثقیل سے جو وزن پیدا ہوسکتا ہے یقین کیجیے کہ اس وزن کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کرسکتی، پہاڑ جس سے پھٹتے ہوں، خود سوچنا چاہیے کہ اس کو کون پھاڑ سکتا ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ بزرگ کے دونوں خلفار میں سے حضرت قطب صاحب کو تو بجائے اجمیر کے دلی رہنا پڑا، شمس الدین التمش نے بڑی بڑی خوشامدوں سے ان کو خواجہ بزرگ سے مانگ لیا تھا، میر خورد کی روایت ہے کہ جب دلی میں رہنے کی اجازت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو عطا فرمائی تو

"سلطان شمس الدین سعادت قدم بوس شیخ را دریافتہ ہمراہ شیخ قطب الدین شادی تمام متوجہ شہر گردید" (سیر الاولیا، ص ۵۵)

لیکن مارواڑ اور راجپوتانہ میں خواجہ اجمیری کی روشنی کو پھیلانے کے لیے، وہی ایک بیگہ زمین کے کاشتکار سلطان التارکین شیخ حمید ناگوری ہی رہ گئے تھے، انھوں نے طریقۂ چشتیہ کے حقیقی رنگ کو پیش کیا، آہ! کہ جو رنگ آج نگاہوں سے اتنا پوشیدہ ہو رہا ہے کہ میں دعویٰ کرتا جا رہا ہوں اور خود سمجھ رہا ہوں کہ لوگ اسے میری زبردستی قرار دینے پر تُلے ہوئے ہونگے، مگر اب تک جو واقعات آپ کے سامنے پیش ہوچکے ہیں، کیا ان میں میرے دعوے

---

[1] اشارہ قرآن کے ان چند امتیازی صفات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن ہی میں کیا گیا ہے۔ سورۂ مزمل میں اس کو "قول ثقیل" (وزنی بات)، سورۂ حشر کی مشہور قراۃ والی آیتوں میں ہے کہ اگر اس قرآن کو پہاڑ پر ہم اتارتے تو تم دیکھتے کہ اللہ کے ڈر سے پہاڑ جھک گئے، اور پاش پاش ہوگئے ۱۲۔

کے ثبوت کی جھلک بھی آپ کو محسوس نہیں ہو رہی ہے، مگر نہیں مجھے ابھی تو بہت کچھ کہنا ہے۔
میں نے شیخ احمد مجد شیبانی کے پیر خواجہ حسین ناگوری کا ذکر کیا تھا۔ بتایا تھا کہ یہ خواجہ حمید الدین ناگوری کی اولاد میں ہیں، مدارک کے وظیفہ کے سوا جُوابًا عن جدٍ "طریقۂ سلوک" کے طوبران کے خاندان میں منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا تھا، انہی کا وہ قرآنی ذوق تھا، جس کا تذکرہ میں نے کسی اور جگہ بھی کیا ہے، یعنی تیس جلدوں میں "نور النبی" نامی تفسیر انہی خواجہ حسین ناگوری کی لکھی ہوئی ہے۔ ہر پارہ کی تفسیر کے لیے الگ جلد ارقام فرمائی گئی تھی۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجمیر اور مارواڑ کا علاقہ محمود خلجی کے عہد میں حکومت مالوہ سے ملحق ہو چکا تھا، محمود خلجی کے بعد مانڈو کے تخت پر غیاث الدین خلجی بیٹھا، اسی کے عہدِ حکومت میں خواجہ حسین ناگواری اجمیر میں افادہ و استفادہ کی مسند بچھائے ہوئے تھے، غیاث الدین ان کا بیحد معتقد تھا، لیکن ساری عمر اسی آرزو میں اس کی گذری کہ کسی دن مانڈو بھی آپ کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہو، شیخ کی طرف سے باوجود رعیت ہونے کے نفی میں جواب ملتا رہا، محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ غیاث الدین کو کسی نے ترکیب سجھائی، بادشاہ کے پاس کسی نے موئے مبارک نذر میں پیش کیا تھا، ترکیب بتانے والے نے مشورہ دیا کہ موئے مبارک کی زیارت عام کا اعلان کیجیے، شیخ کھنچے کھنچے خود ہی چلے آئینگے، یہی ترکیب کی گئی اور چل گئی، محدث دہلوی کا بیان ہے کہ خبر پاتے ہی خواجہ حسین

"ہماں ساعت بے توقف سماع کناں و درود گویاں، احرام دیار منڈو بست"

بادشاہ کو اپنے نسخہ کے کارگر ہونے کا جب علم ہوا شیخ کے استقبال کو شہر سے باہر نکلا، بیسیوں بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں، ان ہی میں ایک خستہ حال گاڑی شیخ کی بھی تھی، اسے خیال بھی نہ گذرا بعد کو پتہ چلا، بڑی معذرت سے پیش آیا، بعض کرامات کا بھی تجربہ ہوا، محمود خلجی کی قبر پر لے جا کر مغفرت کی دعا کرائی، شیخ نے منظور فرمایا، یوں غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری میں تعلقات پیدا ہوئے، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ "سلطان تحفہائے عالی پیش آورد او قبول نہ کرد"

شیخ نے تو خیر سلطان کے تحفے قبول کیے یا نہ کیے لیکن ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں، اسی غیاث الدین خلجی سلطان مانڈو کے ذکر میں پڑھتے ہیں، فرشتہ راوی ہے "ہزار کنیزک حافظ قرآن درحرم داشت" یعنی صرف شاہی محل سرا میں قرآن کا ذوق اتنا پیدا ہوگیا تھا کہ بادشاہ کی لونڈیوں میں ایک ہزار عورتیں قرآن کی حافظ تھیں، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پھر مردوں کا کیا حال ہوگا۔ ظاہری حکومت مانڈو کی اجمیر پر قائم تھی لیکن بباطن خدا نے یوں مانڈو کو اجمیر کے قرآنی مذاق کا تحت بنا دیا تھا۔ غیاث الدین کا یہ حال تھا کہ اُس نے محل کی عورتوں کو حکم دے رکھا تھا۔

کہ جہت نماز تہجد او را بیدار کردہ می باشند وعند الاحتیاج آب برروئے ادمی پاشید باشند اگر در خواب گراں باشد بزور بجنبانند، واگر باز ہم بیدار نشود دستش گرفتہ برخیزانند"

یہ بھی فرشتہ ہی کا بیان ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس نے بادشاہ کی دنیا روکی تھی بادشاہ پر اُس کے دین کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا اور یہ ترکیب تو بادشاہ نے مادی نیند سے بیدار کرنے کی اختیار کی تھی، غفلت کی خواب سے چونکنے کے لیے اُس نے اپنے درباریوں کو یہ عجیب حکم دے رکھا تھا، کہ جب

در وقت عشرت و مشغولی بسخنان دنیا ہرچہ کہ اسم کفن برو نہادہ بودند بنظرش می آورند تا تنبیہ شدہ عبرت گرفتہ از مجلس می برخواست وتجدید وضو کردہ باستغفار وتوبہ انابت می پرداخت"

اور یہی بات مجھے پیش کرنی تھی کہ خواجگانِ چشت کا تعلق قرآن سے کیا تھا، خواجہ حسین ناگوری کا چونکہ ذکر آگیا ہے، اس لیے ایک اہم تاریخی بات جس کا ان کی ذات سے تعلق ہے جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر بھی کر دوں، شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خواجہ بزرگ اجمیری کی قبر شریف کے متعلق یہ واقعہ درج کیا ہے

"در اجمیر کہ موضع اقامت او بود مدفون گشت اول قبر خواجہ از خشت بود"

غالباً "خشت" سے کچی اینٹیں ہی مراد ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ کبیر شکر گنج

کے روضہ طیبہ کے متعلق یہ مروی ہے کہ

بجہت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام حاجت شد، چوں موجود نمی شد در خانہ شیخ

شیوخ العالم کہ خشت خام برآوردہ بودند ازاں خشت فرود آوردند تا در لحد خرچ شد

طیب اللہ ثراہ" (سیر الاولیاء ص ۹۱)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ چشتیہ کے معماران اولین کی قبروں میں کچی اینٹوں ہی کے لگانے کا رواج تھا، محدث دہلوی نے خواجہ بزرگ کے مزار مبارک کے متعلق یہ تاریخی بیان بھی دیا ہے کہ جس زمانہ میں خواجہ حسین ناگوری نے جوار خواجہ میں قیام فرمایا، اس وقت

"حوالی او بیشہ شیراں گشتہ و دراں زماں بالائے قبر شریف عمارت نہ بود"

یہ بھی لکھا ہے کہ اطراف میں کوئی خانقاہ وغیرہ بھی نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ

دروازہ و خانقاہ بعضے از ملوک مندو ساختند" ص ۲۳

بعضے ملوک مندو سے یہی غیاث الدین خلجی ہی مراد ہے، کیونکہ غیاث الدین ہی کے عہد میں غالباً اپنے قیام اور واردین صادرین کے قیام کے لیے، جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے

"اول کسے کہ در مقبرہ خواجہ عمارت کرد خواجہ حسین ناگوری بود" ص ۲۳

اور انہی کے زیر اثر اس عجیب و غریب بادشاہ نے اس مقام میں جو "بیشۂ شیراں" بن گیا تھا، خانقاہ اور خانقاہ کا دروازہ بنوایا، واللہ اعلم بالصواب

میری غرض تو اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ خواجہ حسین ناگوری اور غیاث الدین خلجی سلطانِ مالوہ کے تعلقات کو دکھاؤں، انہی تعلقات کی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ شادی آباد مانڈو کے صرف شاہی محل سرا کی لونڈیوں میں ہزار ہزار عورتیں پورے قران کی حافظ تھیں اب دنیا خواہ کچھ ہی خیال کرے لیکن غیاث الدین اور خواجہ حسین ناگوری کے جن تعلقات کا میں نے ذکر کیا ہے، انہی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر غیاث الدین کے اس

قرآنی ذوق کو خواجگانِ چشت کے قرآنی شغف کا نتیجہ قرار دیا جائے تو اس کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ ہو کہ ہندوستان کے طریقۂ چشتیہ کی حمیدیہ ناگوریہ کی شاخ میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد سے کم از کم بابر کی آمد کے زمانہ تک مدارک کے درس کو طریقہ سلوک کی حیثیت مسلسل بغیر کسی انقطاع کے حاصل رہی، وجہ اس کی یہ ہو کہ خواجہ احمد مجد جن کے تذکرہ میں شیخ محدث نے اس مسئلہ کا ذکر کیا ہو، اجمیر شریف سے ہجرت کر کے ناگور آخر عمر میں چلے گئے تھے اور وہیں وفات ہوئی، شیخ محدث نے ان کی اس ہجرت کے متعلق لکھا ہو کہ۔

"چوں در اجمیر خلل شدہ وقلعہ را رانا سانگا گبرے عظیم بود از دست مسلماناں بگرفت واکثر مسلماناں را شہید ساخت احمد مجد پیش ازیں حادثہ بہفت روز بحکم اشارت خواجہ بزرگ خواجہ معین الحق والدین از شہر برآمد وبہ مسلمانان خبر کرد کہ یک چندے بر ایں شہر نظر جلال ست فرمان بندگی خواجہ بریں ست کہ مسلمانان از شہر برآیند وروز دوشنبہ ۹۲۳ھ با جماعہ از مسلمانان از اجمیر برآمدہ ودوشنبہ دیگر کافراں بر سر اجمیر آمدند و آں دیار را زیر وزبر ساختند" ص۱۵۵

واللہ اعلم شیخ احمد مجد کو یہ اشارہ خواب میں ہوا، یا کوئی کشفی واقعہ تھا، مجھے یہ عرض کرنا ہو کہ یہ گبر عظیم رانا سانگا جس کا شیخ محدث نے ذکر فرمایا ہو، ظاہر ہو کہ یہ وہی رانا سانگا ہو جو بیانہ کے میدان میں حضرت بابر بادشاہ سے نبرد آزما ہوا اور خاص غیبی تائید نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں تیموری خاندان کا تخت بچھیگا، بدترین شکست کے ساتھ رانا سانگا نے راہ گریز اختیار کی۔ شیخ احمد مجد کا انتقال ۹۲۷ھ میں ہوا ہو اور بابر نے ۹۳۲ھ میں پانی پت کا میدان ابراہیم لودی کے مقابلہ میں جیت کر کچھ ہی دن بعد رانا سانگا سے وہ مقابلہ کیا جس کی نظیریں دنیا کی تاریخوں میں کم مل سکتی ہیں اور یہی میری غرض تھی کہ بابر کے عہد تک طریقہ

ا (بر صفحہ ۱۲۴)

چشتیہ کی ناگوری حمیدی شاخ میں مسلسل تفسیر مدارک کے سلوک کا طریقہ جاری رہا۔ اسی شاخ کے ایک بزرگ نے قرآن کی وہ ضخیم تفسیر لکھی اور اسی بزرگ کے معتقد غیاث الدین خلجی کو ہم اس حال میں پاتے ہیں جس کا تذکرہ فرشتہ سے ہیں۔ نے نقل کیا ہے جس کے قرآنی شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ صرف شاہی محل میں ہزار ہزار عورتیں قرآن کی حافظات پائی جاتی تھیں۔ کیا ان واقعات کو پیشِ نظر رکھنے والوں کے لیے اب بھی میرے دعوے کی تصدیق میں شک کی گنجائش ہے۔

اور یہ تو صرف چشتی شجرۂ طیبہ کے ایک پھل کا حال ہے۔ دوسرے دہلوی خلیفہ حضرت

سلہ کہتے ہیں کہ پتھورا اجمیر کے راجہ نے "مسلمانے از پیوستگان خواجہ قدس سرہٗ را بہ سببے از اسباب برنجانید" (اخبار) اسی ایک مسلمان کے ستانے کی علت میں راجہ پتھورا کو یہ سزا ملی کہ خواجہ بزرگ کی زبان مبارک سے مشہور فقرہ نکل گیا "پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم"

شیخ محدث نے لکھا ہے اسی زمانہ میں شہاب الدین غوری کے مقابلہ میں پتھورا کو شکست ہوئی "و بدست معز الدین سام اسیر گشت" غور کرنے کی بات ہے کہ اس گبر عظیم رانا سانگا نے اجمیر کو لوٹا اور وہاں کے مسلمانوں کو شہید کیا، اگر اسی کی سزا میں بجائے شہاب الدین کے اندجان (پایہ تخت بابر در فرغانہ) سے بابر ہندوستان آیا اور ابراہیم لودی جو لاکھوں لاکھ فوج کے باوجود مسلمانانِ اجمیر کی شہادت کا تماشا چپ چاپ دیکھتا رہا، اس کو بھی اور خود رانا سانگا کو بھی اپنے کیے کی سزا ملی، تو عقلاً کیا یہ مستبعد ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ ظہیر الدین بابر جس شان کے ساتھ رانا سانگا سے لڑا ہے وہ خود تاریخ کا ایک اعجوبہ طراز واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ بابر کے پاس یونہی کل دس بارہ ہزار فوج تھی، ہندوستان کی گرمی اس فوج کے لیے ناقابلِ برداشت بنی ہوئی تھی۔ رانا سانگا کی ٹڈی دل فوج جو ایک لاکھ سے متجاوز تھی اس کو دیکھ کر افواج بابری کی ہمت چھوٹ گئی اور مقابلہ سے ہچکچانے لگی، بابر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ شاہی خیمہ جس میں پینے پلانے کا سامان رکھا ہوا تھا پہلے تو اس نے ایک ایک گلاس اور قرابہ شراب کو توڑ پھوڑ کر برابر کیا، غسل کیا، نماز پڑھی، سجدہ میں گر گیا گڑگڑانے لگا "حکومت کے خیال کو سر سے نکالتا ہوں، خالص جہاد کی نیت کرتا ہوں"۔ دل کو قرار آیا، باہر نکل کر اس نے اعلان عام کر دیا، اب جنگ نہیں جہاد ہوگا، جو رہنا چاہے رہے، جسے جانا ہو چلا جائے، بہت سے فوجی جو کرایہ پر آئے تھے چلے گئے بہ مشکل پانچ چھ ہزار فوج رہ گئی۔ انہی کے ساتھ تکبیر کے نعروں میں رانا سانگا کی فوج پر حملہ ہوا، کچھ ایسی صورت پیش آئی کہ رانا کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، رانا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، اور تقدیر نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت صدیوں کے لیے بابر کی اولاد میں رہیگی۔ نواب علاؔ

قطب صاحب کا قرآن سے جو ذاتی تعلق تھا، اس کا ذکر تو گذر ہی چکا، لیکن اس شاخ میں بھی بات انہی تک ختم نہیں ہوگئی ہے۔ یاد ہوگا کہ قطب صاحب کے خلیفۂ برحق شیخ کبیر شکر گنج خود قرآن کا درس دیتے تھے سلطان المشائخ نے چھ پارے تجوید کے ساتھ انہی سے پڑھے تھے، لیکن یہ پڑھنا اور پڑھانا تو دیکھ کر تھا، میر خورد نے سیر الاولیا، میں نقل کیا ہے کہ

"سلطان المشائخ بقلم مبارک خود نبشتہ ست"

یہ چیز کیا تھی جسے سلطان المشائخ نے اپنے قلم مبارک سے ثبت فرمایا تھا، میر خورد نے وہ عبارت بجنسہٖ نقل کی ہے۔ میں بھی وہیں سے نقل کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

"شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین، قدس اللہ سرہ العزیز کاتب حروف را بخواند"

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"روز آدینہ (جمعہ) بعد از فراغ نماز بست و پنجم ماہ جمادی الاولی سنہ ۶۶۹ تسع و ستین و ستمائۃ لعاب از دہن مبارک در دہن کاتب (سلطان المشائخ) کرد"

شیخ کبیر شکر گنج نے سلطان جی کے منہ میں دہن مبارک کا لعاب کس لیے ڈالا تھا، اسی کا ذکر مقصود ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں

"و وصیت فرمود بحفظ کلام مجید رزقنہ اللہ تعالیٰ" (کتاب مذکور ص ۱۲۳)

گو مجھے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے کہ خود شیخ کبیر شکر گنج کو زبانی قرآن یاد تھا یا نہیں لیکن قرآن کے ساتھ ان کا شغف اسی سے ظاہر ہے کہ پچانوے سال کی عمر تک تراویح کی نماز جو ظاہر ہے فرض نہیں ہے پڑھتے رہے آخر عمر میں بیٹھ کر پڑھتے تھے، قرأت و تجوید کے ساتھ قرآن پڑھانے کا حال بھی سن چکے ہیں، سلطان المشائخ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خانقاہ حافظوں سے بھری رہتی تھی میر خورد نے حضرت ہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ جب پہلی دفعہ اجودھن میں میری حاضری ہوئی اور شرف بیعت سے سرفراز ہوا اس کے بعد شیخ کبیر نے خدام خانقاہ کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

"بجہت ایں متعلم (طالب العلم) غریب در جماعت خانہ کھٹ راست کنید"
سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں جب جماعت خانہ میں واپس آیا تو دیکھا کہ میرے لیے پلنگ (کھٹ) بچھایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل میں خیال کیا بلکہ ارادہ ہوا۔

"من بارے ہرگز برکھٹ نخواہم خفت"

اسی موقع پر "نخواہم خفت" کے خیال کی جو وجہ سلطان المشائخ نے بیان فرمائی تھی وہ انھی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

زیرا چہ چندیں سائراں عزیزاں وحافظان کلام ربانی وعاشقانِ درگاہ رحمانی می بینم
کہ برخاک می غلطند من چگونہ برکھٹ بغلطم"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان عزوجاہ (عزیزاں) وعاشقانِ درگاہ رحمانی کے ساتھ خانقاہ فریدیہ کا ایک حصہ خاص حافظانِ کلام ربانی کا بھی تھا۔

سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ شیخ کبیر عموماً لوگوں کو حفظ قرآن کی ایک وِردی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے یعنی فرماتے تھے، غالباً حضرت والا کا خود تجربہ تھا۔

بجہت یاد گرفتن قرآن اول سورۂ یوسف فرمو ے کہ یاد باید کرد تا بہ برکت آں
حق تعالیٰ حفظ تمام قرآن روزی کند" (سیر الاولیارص ۴۳۹)

سنداً اس حدیث میں ممکن ہے بعضوں کو کلام ہو جس پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں ہے لیکن شیخ کبیر عموماً اپنے لوگوں کو یہ حدیث بھی سُنایا کرتے تھے

ہر کرا نیت یاد گرفتن قرآن باشد وبداں نرسد وہم دراں نیت از جہاں سفر کند[1] چوں
اورا بگور نہند فرشتہ بیاید وترنجے از بہشت آوردہ بدست او دہداں کس آں ترنج
ابتلاع (نگل جانا) کند تمامہ قرآن اورا محفوظ گردد فردا چوں حشر شود، او حافظ مبعوث
گردد" (سیر الاولیار ص ۴۳۹)

اور اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وابستوں میں وہ قرآن سے کس قسم کا تعلق پیدا کرنا چاہتے

[1] مشہور حدیث فان منزلتک عند اٰخر اٰیۃ تقرءہ (آدمی قرآن کی جس آیت کو پڑھتے ہوئے مرتا ہے وہی س...
(بقیہ برصفحہ ۱۲۷)

تھے، جس کا حاصل یہی ہوا کہ جس سے جتنا بھی ممکن ہو زندگی کا ایک حصّہ اس کام میں وقف کرے، کامل قرآن محفوظ نہ ہو سکے تو جتنا بھی اپنے اندر قرآن کو اتار سکے والا اُتار لیگا، یہی چیز دوسری زندگی میں اس کی تکمیل کی ضمانت بن جائیگی۔ گو پارے دو پارے سے بھی کم ہی محفوظ کرکے مرا ہو لیکن اُٹھے گا پورے قرآن کا حافظ بن کر، ظاہر ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی زبانِ مبارک سے اس مفت کی دولت کا حال سُن کر حضرت والا کے دست گرفتوں میں کون ہوگا جس کے دل میں کم از کم اس نیت کی گدگدی نہ پیدا ہوتی ہوگی۔

سب کچھ پڑھنے پڑھانے دینے دلانے کے بعد آخری وصیت، بابا صاحب کی اپنے خلیفہ اکبر و محبوب (سلطان المشائخ کو "قرآن جا کر یاد کرد" کی ہے، اور اس اہتمام کے ساتھ وصیت ہے، کہ لعاب مبارک سلطان المشائخ کے دہن پاک میں ڈالا جاتا ہے اور جیسا کہ میر خورد نے سلطان جی کی اسی یادداشت سے جو ان کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی تھی، اسی کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ کلام اللہ کے حفظ کی وصیت کے بعد شیخ کبیر شکر گنج نے فرمایا "نظام! میں نے "لبیک" کے ساتھ جواب عرض کیا، اس کے بعد سلطان المشائخ ارقام فرماتے ہیں کہ "خواجہ گفت دین و دنیا ترا دادہ اند" کیا یہ اشارہ اسی قرآن کی طرف تھا؛ جس کے متعلق اجتماعی اور انفرادی تجربات تیرہ سو سال سے یہی ہیں، آگے ہے کہ شیخ کبیر نے فرمایا "این جا ہمہ این ست" یہ بجنسہٖ الفاظ ہیں جو میں سیر الاولیاء سے نقل کر رہا ہوں، واقعی مطلب کیا ہے، بولنے والے اور بولنے والے کا خدا ہی اسے جان سکتا ہے، لیکن گفتگو جس مسئلہ میں ہو رہی ہے، اُس کا تو کھلا ہوا اقتضا یہی ہے کہ "ہمہ این ست" سے وہی قرآن مراد ہے جس کے حفظ کی وصیت کے لیے خاص مجلس نماز جمعہ کے بعد آج قائم کی گئی ہے، بہرحال میرے نزدیک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) مقام ہوتا ہے) جسے ابوداؤد و ترمذی کی روایت ہے اور ترمذی نے "حسن صحیح" سے اس کی توثیق بھی کی ہے اگر اس حدیث کے اوّل و آخر کے الفاظ پر غور کیا جائے تو جو مفہوم شیخ کبیر کی بیان کردہ روایت کا ہے اس کی نتیجۃً اس سے تصدیق ہوتی ہے۔

ہمہ این ست" کے ایں کا مطلب اور مشار الیہ قرآن معلوم ہوتا ہے اور "این جا" کی "این" کا اشارہ خواجگان چشت کے اس طریقہ کی طرف ہے جو ہندوستان کے خصوصی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے اس ملک میں جاری کیا تھا، شیخ الاسلام فرید الحق والدین رحمۃ اللہ علیہ کا آخری فقرہ اس کے بعد یہ ہے:-

"برو ملکِ ہندگیر نظرۃ منك یکفینی"

قرآن حوالہ کیا جاتا ہے، اسی کو سب کچھ بتایا جاتا ہے، اور اسی کے بعد "ہندگیری" کی بشارت سنائی جاتی ہے، اگر اسے بشارت قرار دیا جائے، یا للکارا جاتا ہے، ایک ہتھیار دے کر جس سے ہندگیری کی مہم میں کامیابی ہوسکتی ہے، آگے عربی فقرہ

نظرۃ منك یکفینی تمہاری ایک نگاہ میرے لیے کافی ہے۔

واللہ اعلم مرشد نے اپنے اس مرید اور خلیفہ کو جسے قرآن دے کر "ہندگیری" کی مہم پر بھیج رہا ہے، یہ کیا کہا؟ کیا یہ مطلب ہے، ایمان و یقین کی جو روشنی قرآن سے پیدا ہوتی ہے اس کی صرف ایک نظر ان لوگوں پر قابو پانے کے لیے کافی ہوسکتی ہے، جن کی پوری زندگی صرف شرک کے انگاروں پر لوٹتے کٹی ہے یا کٹ رہی ہے، ایک دوسرے موقعہ پر سلطان المشائخ ہی کے حوالہ سے میر خوردہی نے قرآن کے متعلق ایک عجیب بات نقل کی ہے۔ سوال کرنے والے وہی مولانا فخر الدین زرادی ہیں جن کے غیر معمولی علم و فضل کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا زرادی نے عرض کیا۔

"مشغول شدن بکلام اللہ فاضل تر یا ذکر"

تصوف جس کی بنیاد ہی ذکر و اذکار پر سمجھی جاتی ہے اور جہاں جہاں ضرورت تھی یقیناً وہاں کے لیے ذکر اذکار، اشغال و مراقبات کے ذرائع مفید بھی ہوئے، لیکن سوال ہندوستان میں پوچھا جارہا تھا "ہندگیری" کی مہم اپنے پیر کی طرف سے جسے سونپی گئی تھی اس سے دریافت کیا گیا تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا۔

"ذاکر را وصول زود تر بود، اما خوف زوال ہم بود، تالی (قرآن پڑھنے والا) را وصول دیر تر بود لیکن خوف زوال نہ باشد" (ص ۴۴۶)

وجہ ظاہر ہے کہ ذکر سری ہو یا جہری دونوں کی کثرت و مزاولت خصوصاً جب حضورِ قلب اور شعورِ معنی کے ساتھ ہو تو مذکور سے اشتیاق و انہماک، حب والف کی نسبتوں کے پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی، جن ممالک کے باشندے مسلمان ہو چکے ہیں، اجمالاً ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی مجمل کو مفصل کرنے کے لیے انہیں ذکر و فکر، مراقبہ اور مطالعہ کے مشاغل میں مشغول کیا جاتا ہے، ایمان کی حلاوت ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مذکور کی محبت کی آگ جو ایمانی فطرت میں بہر حال دبی ہوتی ہے، وہ ذکر کے ضربات سے بھڑک اُٹھتی ہے اور یہی ان کا مطلوب ہوتا ہے، لیکن یہ سارے ذکری ذوق و شوق و لولے اور شورش اسی وقت تک تر و تازہ رہتے ہیں، جب تک ذاکر ذکری و فکری مشاغل کو بھی تازہ کرتا رہے۔ خدانخواستہ اگر کسی وجہ سے ان میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو جیسی اور جتنے دن کی رکاوٹ ہوگی اسی نسبت سے ذکری کیفیات کی شدت میں بھی ضعف اور ذوق و شوق کی لذت کم ہوتی جاتی ہے، اسی لیے ارشاد ہوا کہ گو ذکر سے مقصد تک رسائی تو جلد ہو جاتی ہے، ایمان مجمل پر ایمان مفصل کے آثار تھوڑی محنت کے ساتھ ہی مرتب ہونے لگتے ہیں بلکہ غلبہ ذکر سے یکسوئی جو پیدا ہوتی ہے بسا اوقات اس کی وجہ سے کشف و کرامات جیسی چیزوں کا صدور بھی ہونے لگتا ہے، لیکن نتائج کا تعلق چونکہ تجدید ذکر کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اس لیے مرض و حرج یا دوسرے اسباب کے تحت یہ بالکل ممکن ہے کہ اس راہ پر چلنے والے اپنے آپ کو ان تمام حالات سے خالی پائیں، جنہیں اتنی محنت و مشقت سے انہوں نے حاصل کیا تھا، اور یہی مطلب ہے "خوفِ زوال" سے۔

لیکن قرآن کا حال بالکل مختلف ہے، کچھ نہیں، ایک بات، اور صرف ایک ہی بات ہے، جس پر اس کے افادہ کا دار مدار ہے، یعنی جس ذریعہ سے بھی ہو کسی طرح یہ طے ہو جائے کہ سرورِ

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک العیاذ باللہ غلط بیانی کے الزام سے پاک و بری ہی
ظاہر ہی کہ یہ سراسر ایک عقلی مقدمہ ہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق کسی دوسرے
غیبی عالم سے نہیں اسی عالم محسوس وشہادت سے ہی۔ وہ ہم انسانوں ہی میں پیدا ہوئے
ہم ہی میں رہے، منٹ دو منٹ کے لیے نہیں جیسے بعض دفعہ کسی غیبی ہستی سے
سالک کا احساس متاثر ہوکر پھر اپنے سامنے کچھ نہیں پاتا، یہ حالت نہیں ہی سالہا
سال تک وہ ہم ہی میں رہے، ہم ہی میں زندگی گذاری، گورے کالے، مشرقی ومغربی
ہندو مسلمان عیسائی، یہودی ظاہر ہی کہ اس حیثیت سے آپ کو سب جانتے ہیں، آپ
سب ہی کے جانے بوجھے دیکھے بھالے ہیں،

اسی واضح محسوس، بدیہی حقیقت کے متعلق ہمیں اپنی فطرت اور اپنے اندرونی
احساسات کو صرف اس حیثیت سے ٹٹولنا ہی کہ العیاذ باللہ کیا وہ سچ نہیں بولتے تھے
اس کے تصور کی بھی صلاحیت کیا ہم میں باقی ہی؟

ایسی بات جسے شاید اب کوئی غیر مسلم بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہی کہ
ایک پیدائشی مسلمان کے سینے میں اس کی کیا گنجائش پیدا ہوسکتی ہی

ادھر یہ مقدمہ طی ہوا اور اچانک وہی درماندۂ عقل جس کی آخری رسائی

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہی ‏ ‏ پردہ چھوڑا ہی کچھ ایسا کہ اُٹھائے نہ بنے

پر ختم ہوجاتی ہی۔ قرآن کی روشنی میں جگمگا اُٹھتی ہی، اب اپنے آپ کو وہ اس علم محیط کی راہنمائی
میں پاتی ہی، جس سے نہ ماضی غائب ہی نہ مستقبل نہ شہادت پوشیدہ ہی نہ غیب اوجھل ایسی
روشنی جو ظاہر ہی کہ اپنی خالص ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک کیفیت کے ساتھ کسی دوسرے ذریعہ
سے کسی کو اب کہیں میسر نہیں آسکتی، اور یہ سب کچھ ایک صرف ایک "نظرۃ"

خراباتیاں مے پرستی کنید ‏ ‏ محمدؐ بگوئید و مستی کنید

کا نتیجہ ہی ع بمصطفی برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست۔

جس کو اس ایک "نظرۃ" کی دولت حاصل ہو چکی ہو دراصل "معمۂ کائنات" کے وہ سارے اسرار جو دانش ماضی و حاضر کے کسی سرمایہ سے کسی پر کبھی کھل نہیں سکتے تھے اس کے حل کی ایک ایسی راہ اس کے سامنے آگئی ہو جس پر چلنے والا اپنے اردگرد پس وپیش میں شک و شبہ، ظن وتخمینہ کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا کیونکہ ظاہر ہو کہ اب اس سلسلہ میں جو کچھ جانیگا جو کچھ سمجھیگا وہ محدود عقل رکھنے والے انسان کا کوئی تخمینی نتیجہ نہ ہوگا جس میں ہر تھوڑی دیر بعد دغدغہ ہوتا ہو اور اس دغدغہ کو ہونا چاہیے کہ بے جانے صرف قرائن وقیاسات سے جن لوگوں نے نتائج پیدا کیے ہیں، کیا ضرور ہو کہ وہی واقعہ ہو خصوصاً جب آئے دن عقل کے تخمینی نتیجوں کے متعلق مسلسل تجربہ ہوتا چلا آرہا ہو کہ کل جس چیز کے واقعی قرار دینے پر عقل کو اصرار تھا آج وہی عقل جہل کے قہقہوں سے اُسی کا مضحکہ اُڑا رہی ہو فکر انسانی کی ہزارہا ہزار سال کی تاریخ بیجا اصرار اور بیجا تمسخر کی داستانوں سے لبریز ہو۔

حالانکہ یہ سارا قصہ صرف اسی ایک "نظرۃ" کی تصحیح کے بعد ختم ہو جاتا ہو۔ آئندہ مسئلہ جو کچھ رہ جاتا ہو وہ راہ کا نہیں بلکہ راہ پر چلنے کا ہو سلطان المشائخ نے علماء رسوم (علماء ظاہر) اور صوفیہ میں فرق بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ دونوں ہی دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی "لاریبی علم" "القرآن الحکیم" اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی دعوت دیتے ہیں لیکن فرق یہ ہو کہ۔

"ہرچہ علماء بزبان دعوت کنند مشائخ بہ عمل دعوت کنند (سیر الاولیاء بحوالہ نوشتہ دست خاص سلطان المشائخ۔ ص ۳۲۱)

اور اتنے دھوم دھام سے آپ شیخ کبیر کو جو دیکھ رہے ہیں کہ آخری وصیت اپنے خلیفۂ خاص کو حفظ قرآن کی کر رہے ہیں اس حفظ سے غرض وہی ہو کہ "ہند گیر دعوت" کی جس مہم پر سلطان المشائخ کا انھوں نے تقرر کیا تھا، ضرورت تھی کہ پہلے اس دعوت کو وہ خود اپنی عملی زندگی بنالیں کہ ان کو زبان سے نہیں اپنے عمل سے دعوت دینی تھی۔

خواجگانِ چشت میں قرآن کے علم کو عمل بنانے کی کیا تدبیر کی جاتی تھی، تلاوت و حفظ کا تو خیر الفاظ سے تعلق تھا لیکن اپنے الفاظ سے قرآن جن معانی کو عطا کر رہا ہے ان کو اپنے اندر ہضم کس طریقہ سے کرنا چاہیے۔ مشائخ چشت بیعت لیتے ہوئے پہلا معاہدہ جو یہ لیتے تھے جیسا کہ سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ

"پیر اورا (مرید را) تلقین کند دیدہ را نا دیدہ کنی و شنیدہ را ناشنیدہ" (سیر الاولیاء ص ۳۲)

اس کا یہی مطلب تھا کہ اپنے حسی و عقلی معلومات کو ان معلومات کے مقابلہ میں جو قرآن عطا کریگا، جلا دینا پڑیگا، کیونکہ بہرحال عقل و حواس کے معلومات جیسے کچھ بھی ہوں ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں جن کی رسائی محدود ہے اور محدود رسائی رکھنے والے ذرائع سے جو معلومات حاصل ہونگے ظاہر ہے کہ وہ ناقص ہونگے، ناقص مقدمات سے جو نتائج پیدا کیے جائینگے خواہ بظاہر جتنے بھی یقینی اور بدیہی معلوم ہوں لیکن ان معلومات بیّنہ قطعیہ کا تو مقابلہ نہیں کر سکتے جو حق تعالیٰ کے علم محیط کلّی سے ماخوذ ہونگے۔

سلطان المشائخ ہی سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ معلومات جن ذرائع اور طرق سے آدمی کو حاصل ہوتے ہیں اُن کے تین اطوار ہیں، فرماتے ہیں:-

"یکے طور حس دوئم طور عقل سوئم طور قدس"

طور قدس سے اشارہ علم کے اسی قطعی لاریبی ذریعہ کی طرف ہے جو ہر قسم کے اندیشوں، مشکوک و شبہات سے مقدس اور پاک ہے عقلی طور کے معلومات کی دونوں مشہور قسموں یعنی غور و فکر کے بعد آدمی جن نتیجوں تک پہنچتا ہے جنہیں منطق میں کسبی اور نظری کہتے ہیں اور غور و فکر کے بغیر جو معلومات ہر شخص کو حاصل ہوتے ہیں جنہیں بدیہی کہتے ہیں۔ سلطان المشائخ نے ان دونوں قسموں کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ

"بدیہیا علم قدس نیست تا کسبی چگونہ باشد" فوائد ص ۲۹

بہرحال یوں شنیدہ کو ناشنیدہ، اور دیدہ کو نا دیدہ بنا کر بزرگانِ چشت جیسا کہ معلوم ہوتا ہے،

قرآنی معانی کو چوسنے کا حکم دیتے تھے فوائد الفواد ہی میں تلاوت کے جن قاعدوں کا ذکر ہے
ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرتبہ اس کا یہ ہے کہ

"انچہ می خواند معانی آں بر دل گذراند"

دوسرا مرتبہ اس کا یہ ہے، کہ

"در حالت قرآن خواندن، جلال و عظمت حق بر دل بگذراند"

اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ

وقت خواندن قرآن باید کہ دل خواندہ را تعلق بحق باشد" (ص ۷۱)

اس آخری عمل کا مطلب یہی ہوا کہ براہ راست حق تعالیٰ سے گفتگو اور مناجات کی سعادت اسے حاصل ہو رہی ہے، گویا وہی چیز ہے جس کی تلاش میں لوگ سرگرداں ہیں، مجاہدات و ریاضات برداشت کرتے ہیں کہ شاید غیب کی کوئی کرن چمک اٹھے، کسی ایماء اور اشارہ سے سرفرازی ہو، قرآن کے پڑھنے والے کو بہ سہولت تمام یہی مقام حاصل ہے سلطان المشائخ لوگوں سے فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے کم از کم اس شعور کو تو ہر شخص میں ہونا چاہیے کہ

"این دولت چہ لائق منست. مرا چہ محل ایں سعادت باشد"

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس ناسوتی زندگی میں اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی بغیر کسی واسطہ کے حق تعالیٰ سے ان ہی کے الفاظ میں ان علوم کو حاصل کر رہا ہے جن کے حاصل کرنے کا اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ اب باقی نہیں ہے، شیخ محدث دہلوی نے ملتان کے ایک بزرگ سید صدر الدین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے۔

" دو نعمت در عالم بالفعل موجود است کہ فوق جمیع نعمتہاست لیکن مردم قدر آں دو
نعمت را نمی شناسند و بداں پے نمی برند و از تحصیل آں غافل اند"

پھر ان دونوں نعمتوں کی شرح کرتے ہوئے ایک تو اسی نعمت کا ذکر کرتے کہ

"قرآن مجید کلام پرور، گار است و... سبحانہ تعالیٰ بے واسطہ بداں متکلم و خلق ازاں غافل اند"

اور دوسری نعمت یہ ہے کہ

"وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست" (اخبار ص ۲۱۵)

اور اس سے ہندوستانی صوفیا کے اس نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، جو میرے نزدیک مشائخ چشت کی برکتوں میں ایک برکت ہے، سید صدر الدین کا زمانہ سلطان المشائخ کے بہت بعد کا ہے، لودیوں کے عہد میں ملتان میں رہتے تھے۔

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں تو خواجگان چشت کے طرزِ عمل کا ذکر کر رہا تھا، کہ انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں میں کس قسم کا قرآنی مذاق پیدا کیا تھا، اور اس سے استفادہ کے طریقے ان کے یہاں کیا تھے، میر خورد نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ کا عام حکم قرآن خوانی کے متعلق یہ بھی تھا کہ

"یک سیپارہ بہ سکونت حرفاً بعد حرفٍ خواندن بہتر از پانزدہ سیپارہ بسرعت خواندن ست"

فرماتے تھے کہ

درچنیں خواندن نورِ تلاوت بیش تر باشد اگرچہ درروان خواندن ہم از نور خالی نبود"

خود آخر عمر تک جو اسّی سے متجاوز تھی، پوچھنے والے نے جب یہ پوچھا کہ

"شما ہر روز چہ مقدار می خوانید، فرمود یک سیپارہ"

ظاہر ہے کہ اس "ایک سیپارہ" کے پڑھنے کا وہی مطلب تھا کہ "بہ سکونت حرفاً بعد حرفٍ خواندن" کے طریقہ پر حضرت والا کا عمل تھا، تلاوت کے اس طریقہ سے جیسا کہ سلطان المشائخ ہی سے میں نقل کر چکا ہوں کہ "تالی (قرآن پڑھنے) را وصول دیر تر بود"

لیکن گو ذکر کے عام طریقہ سے یہ وصول دیر میں ہوتا ہو، لیکن واقعہ وہی ہے کہ

"چنداں خوف زوال نبود"

اس لیے زوال کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ العیاذ باللہ کسی مسلمان کے دل

میں خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدانخواستہ "غلط بیانی" کا شبہ پیدا ہو لیکن جس شبہ کی گنجائش اب غیر مسلموں کے قلوب میں بھی اگر سچ پوچھیے تو باقی نہیں رہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا عام وزن نسل انسانی پر اتنا پڑ چکا ہے کہ کھلے بندوں بغیر کسی جھجھک کے اس کی ہمت کسی میں باقی نہیں رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہہ سکتا ہو کہ خاکم بدہن "آپ جھوٹ بولتے تھے" تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنے اندر اس شبہ کی گنجائش کہاں سے پا سکتا ہے، اور میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن سے استفادہ صرف ایک اسی مقدمہ پر مبنی ہے، میں نہیں جانتا کہ "وصول حق" کے لیے اس سے زیادہ مختصر قطعی اور یقینی راہ اور کیا ہو سکتی ہے، دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کے سامنے سب کچھ پیش کر سکتی ہیں لیکن قرآن ہی ایک دولت مسلمانوں کے پاس یقین کی ایسی دولت ہے جس کا مقابلہ نہ یورپ کا فلسفہ کر سکتا ہے اور نہ ہندوستان کا "اپنشد" نہ یہاں کے قصاصوں کے خوارق اور عجائب کا وہ طومار، صرف ایک مقدمہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے تھے اچانک علم ویقین کے ایک ایسے دروازے کو قرآن کی صورت میں کھول دیتا ہے جس کے بعد علم کے سارے دروازے جن میں بہر حال کچھ نہ کچھ شک ہے بے اعتمادی اور عدم وثوق کے جراثیم ان کی بنیادوں میں بھرے ہوئے ہیں، خود بخود بند ہو جاتے ہیں عقلی تخمینوں کی تاریکیوں سے نکل کر آدمی براہ راست حق تعالیٰ کے علم کی روشنی میں آ جاتا ہے، البتہ اس علم سے استفادہ کے جو مذکورہ بالا طریقے مشائخ چشت میں مروج تھے، ان پر جب آدمی عمل کرنا شروع کرتا ہے اور جو ضابطے تلاوت قرآن کے ان بزرگوں نے اس ملک میں نافذ کیے تھے جو ان کے نہیں بلکہ سلف ہی سے منقول تھے، جب ان کو اپنا دستور العمل سلوک بناتا ہے، تو گو دیر ہی میں سہی، لیکن وصول کے نتائج اس کے سامنے اسی زندگی میں ظاہر ہونے لگتے ہیں سلطان المشائخ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ قرآنی راہ سے وصول کی جو سعادت اس زندگی میں میسر آتی ہے وہ کیا

ہوتی ہے، آپ نے اس کا جو جواب دیا تھا فوائد الفواد میں آپ ہی کے الفاظ میں وہ منقول ہے

"فرمود در حالت تلاوت وسماع سعادتے کہ حاصل آید آں بر سہ قسم ست انوار ست،
احوال ست و آثار ست"

ظاہر ہے کہ یہ تینوں چیزیں تجربے سے تعلق رکھتی ہیں، الفاظ سے ان کی تعبیر مشکل ہے۔ تاہم سلطان المشائخ نے اس کی کچھ تفصیل بھی فرمائی ہے۔ آخری چیز یعنی "آثار" کا چونکہ تعلق اسی عالم حس سے ہے یعنی آدمی کے جسم پر آنکھوں پر یہ کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، اس لیے اس کو تو ہم آپ بھی سمجھ سکتے ہیں، سلطان المشائخ نے فرمایا تھا کہ گویہ آثار جہاں سے آتے ہیں، اس کا اصطلاحی نام "عالم ملک" ہے لیکن یہ انوار احوال آثار میں سے آخری چیز چونکہ "جوارح" یعنی بدن اور اعضا، بدن پر نازل ہوتے ہیں، اس لیے اس کا احساس دوسروں کو بھی ہو سکتا ہے آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ

بکائے وحرکتے وجنبشے کہ ظاہر می شود آں را آثار می گویند و آں از عالم ملک ست بر جوارح"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سابقہ ضوابط کے تحت جب قرآن آدمی پڑھتا رہتا ہے تو آخر میں (اعضا ظاہری) پڑھتے پڑھتے اُس پر گریہ طاری ہوتا ہے بدن میں حرکت اور جنبش پیدا ہوتی ہے گویا قرآنی آیت

اللہ انزل احسن الحدیث کتابا	اللہ ہی نے اتاری اچھی بات اس کتاب کی صورت
متشابھا مثانی تقشعر منہ	میں نازل فرمایا جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی ہیں
جلود الذین یخشون ربھم ثم	جو دہرا دہرا کر پڑھی جاتی ہیں جو لوگ اللہ سے ڈرتے
تلین جلودھم وقلوبھم الی	ہیں ان کی جلدیں کانپنے لگتی ہیں پھر ان کی جلدیں
ذکر اللہ	اور قلوب نرم پڑ جاتے ہیں اللہ کی یاد کے لیے۔

کی کیفیت اس پر شروع ہو جاتی ہے لیکن جوارح کے یہ آثار دراصل باطنی انقلابات کے ثمرات ہوتے ہیں، سلطان المشائخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عالم ملکوت سے پڑھنے والے کی روح پر انوار کا نزول ہوتا ہے، انوار کے بعد عالم جبروت سے قلوب پر احوال نازل ہوتے ہیں

سلہ (بر صفحہ ۱۳۷)

آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

"نخست (یعنی تلاوت کے فوائد کا ظہور شروع شروع میں)، انوار از ملکوت بر ارواح و بعد

ازاں احوال از جبروت بر قلوب، بعد ازاں آثار از ملک بر جوارح"

سلطان المشائخ کے مشہور "محبوب ترک" حضرت امیر خسرو جنہیں حضرت نے سلوک بالقرآن ہی پر لگا دیا تھا، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا وہ سات پارے روزانہ تہجد میں پڑھا کرتے تھے، ایک دن مجلس مبارک میں حاضر ہوئے پوچھا گیا۔ ترک! حال مشغولیہا چیست؟

حضرت امیر خسرو نے جواب میں فرمایا:۔

مخدوما! چندگاہ باشد کہ بوقت آخر شب گریہ مستولی میشود" (سیر الاولیاء ص ۳۰۲)

یعنی	اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ عَلَی الرَّسُوْلِ	جب سنتے ہیں وہ چیز جسے اتارا اللہ نے رسول
	تَرٰٓی اَعْیُنَہُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ	پر تو دیکھتے ہو تم اُن کی آنکھوں کو کہ بہہ پڑیں
	مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ	آنسوؤں سے کیونکہ "حق" کو انہوں نے پہچانا۔

کی حلاوت امیر کو ملنے لگی، سلطان المشائخ نے سُن کر فرمایا،

"الحمد للہ اندکے ظاہر شدن گرفت"

آیات قرآنی کی تلاوت حرفاً بعد حرفٍ اس طریقہ سے کہ ان کے معانی کو بھی دل پر گذارا جائے۔ اس سلسلہ میں مشائخ چشت کی فہم قرآنی کا کیا انداز تھا، ہم ان کے اس مذاق کا اندازہ مثالوں سے کر سکتے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآنی علم کو جو "عمل" کی شکل دیتے تھے اس باب میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا، اور عمل سے ان کی غرض کیا تھی

شیخ کبیر شکر گنج سے سلطان المشائخ راوی ہیں، کہ حضرت والا نے ایک دن

[1] بخاری میں ہے کہ بعض صحابی یعنی اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عالم حس میں بھی ان قرآنی انوار کا مشاہدہ ہوتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب اُنہوں نے قصہ بیان کیا کہ میں قرآن پڑھ رہا تھا کہ گھوڑی میری بھڑکی، آسمان کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک "ظلہ" روشنی سے جگمگاتا ہوا آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قرآن کے انوار تھے۔

ارشاد فرمایا کہ۔

"فقیر صابر بر غنی شاکر رجحان دارد"

یعنی مفلس ہونے کے باوجود جو صابر ہو اس کو شکر کرنے والے آسودہ حال مسلمان پر ترجیح ہوگی۔ یہ تو دعویٰ تھا، دلیل میں شیخ کبیر نے جو بات پیش کی اسی سے اس کا سراغ ملتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک قرآن فہمی اور قرآنی آیات پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہوتا تھا؟ سلطان المشائخ ہی راوی ہیں کہ شیخ کبیر نے دعوے کو پیش کرکے دلیل یہ بیان کی کہ

زیراکہ غنی شاکر را بر شکر وعدہ چیست؟

یعنی دیکھنا یہ چاہیے کہ تونگروں کو شکر پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں کس چیز کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت

وَلَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ - اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤنگا

تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ "وعدہ مزید نعمت" ہے لیکن

"در صبر بشارت چیست؟ نعمت معیت"

اور ثبوت میں آیت قرآنی

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

حاصل یہ ہوا کہ شکر میں تو دہی نعمتیں جو آدمی کو ملتی ہیں، اُن ہی کے اضافہ کی بشارت قرآن میں دی گئی ہے، لیکن صبر میں تو نعمت ہی نہیں، صاحب نعمت کی رفاقت اور معیت کا مژدہ سنایا گیا ہے، شیخ کبیر نے اس کے بعد فرمایا۔

"میاں ایں مرتبہ وآں بہ ہیں آں فرق از کجا تا کجاست"

جس وقت سلطان المشائخ شیخ کبیر کے اس قول کو بیان فرما رہے تھے، حضرت کے ممتاز مریدوں میں سے قاضی محی الدین کاشانی بھی موجود تھے، انہوں نے دریافت کیا کہ

هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔

کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابر و غیر صابر ہر ایک کو معیت حق حاصل ہے، پھر صبر کی خصوصیت کیا ہوئی، سلطان المشائخ نے فرمایا کہ صبر میں

"معیت با عنایت است یعنی یحب و یرضیٰ"

یعنی صرف "معیت" ذاتی یا علمی نہیں بلکہ محبوبیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ معیت صابر کو میسر آتی ہے، اور صابر کی محبوبیت کے اس مقام کا قرآن میں جتنی بار اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْن (پیار کرتا ہے قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کو) دھرایا گیا ہے یا اسی قسم کی آیتوں سے قرآن کے پڑھنے والوں میں سے کون ناواقف ہے، نص محکم قطعی کے رو سے صابر محبوب الٰہی بن جاتا ہے۔

بہرحال یہی ایک مثال کافی ہو سکتی ہے، کہ قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب ان بزرگوں کے نزدیک کیا تھا، قرآن پر عمل کرنا چاہیے جو ایک عام بات ہے، جس کا چرچا خصوصاً اس زمانہ میں بہت زیادہ ہے، کیونکہ مغرب نے آج جو ذہنیت ملک میں پیدا کی ہے، اس میں ایمان یا علم صحیح کی کوئی قیمت نہیں، آپ کا علم کچھ ہی کیوں نہ ہو، دس خدا کے آپ قائل ہوں، شرک جیسی بدترین بغاوت کا کوئی مرتکب ہو، لیکن اگر اس کی زندگی کا کوئی عملی پہلو اچھا ہے، تو اس زمانہ میں اس کے عقائد سے قطع نظر کر کے عمل کی صرف اسی خوبی کی وجہ سے اس کا شمار نیکوکاروں، بلکہ بعضوں کے نزدیک تو خدا رسیدوں میں کیا جاتا ہے، اور یہ سارا عارضہ اس کا ہے کہ "الحیوٰۃ الدنیا" کے بعد "الحیوٰۃ الاخریٰ" کے یقین میں ضعف پیدا ہو گیا ہے، جو منکر ہیں وہ تو خیر منکر ہی ہیں، لیکن بظاہر جو اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بھی قیمت صرف ان ہی چیزوں کی ہے، جن سے موجودہ زندگی میں کچھ فائدہ پہنچتا ہو، چونکہ علوم صحیحہ، یا اعتقاداتِ حقہ کے نتائج عموماً دوسری زندگی میں ظاہر ہوں گے اور اعمال صالحہ کے نتائج یہاں بھی ہویدا ہونے لگتے ہیں، جھگڑا فساد مٹتا ہے، امن حاصل ہوتا ہے، عافیت میسر آتی ہے، اس لیے مذہب کا عملی پہلو اب بھی ان تنگ نظر دل کو اپیل کرتا ہے اور یہی راز ہے اس بات کا کہ سارا زور اس زمانہ میں عمل ہی پر دیا جا رہا ہے۔

بربادی و تباہی کے جتنے مراثی خواہ محراب و منبر پر پڑھے جاتے ہوں، یا پنڈال و ڈائس پر ہر جگہ عمل کا رونا رویا جاتا ہے، قرآن پر عمل جاتا رہا، اس لیے مسلمان تباہ ہو گئے، حتیٰ کہ بعض جوشیلوں کا غلو تو اس باب میں اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ یورپ کے ملاحدہ فساق جن کی ساری زندگی جاہلیت کی زندگی ہے، ان کو عموماً عمل بالقرآن کی سند دی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ ان قوموں نے قرآن کو پکڑا، اس لیے آج حکومت و سلطنت کے مزے بھوگ رہے ہیں اور مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا، اس لیے افلاس و نکبت، خواری اور ذلت میں گرفتار ہیں۔

یورپ عامل بالقرآن ہے، اب اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؛

آنکھیں رکھتے ہوئے جو اندھے بنتے ہوں، انہیں کون دکھلا سکتا ہے، لیکن دوسری بات کہ مسلمانوں کا چونکہ قرآن پر عمل باقی نہ رہا، اس لیے وہ تباہ و برباد ہو گئے، اس میں شک نہیں ہے کہ کہنے والے جس معنی میں یہ کہہ رہے ہیں، وہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن واقع کے لحاظ سے اس کا کون انکار کر سکتا ہے، اس لیے میں تو عمل بالقرآن کے عصری مطالبوں کو

کلمۃ حق یراد بھا الباطل سچی بات ہے لیکن اس سے جو مقصد ہے وہ لا حاصل بے نتیجہ غلط ہے

کی ایک مثال سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، اتنا ضرور ہے کہ قرآن پر عمل آج مسلمانوں میں نہیں ہو رہا ہے، مگر سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن پر عمل کیا کیا جائے، قرآن کی حالت تو یہ ہے کہ اسلامی اعمال کے مہمات نماز و روزہ حج و زکوٰۃ تک کے تفصیلات تو اس میں نہیں پائے جاتے[1] بلکہ قریب قریب سب کی حیثیت عنوان اور باب کی ہے، تفصیلات کا علم تو پیغمبر کی زندگی سے حاصل ہو رہا ہے۔

---

[1] اور جن لوگوں نے قرآنی آیات ہی سے تفصیلات کے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اُن کی بوجھ بجھکڑی تفسیر و لا طائل مطالعہ ان کے جنون کی کافی دلیل ہے چکڑالویوں کی تفسیر پڑھیے زعفران زار کشمیر کی سیر سے آپ کو مستغنی کر دیگی ۱۲۔

اور جب نماز و روزہ جیسے امہات الاعمال کا قرآن میں یہ حال ہے، تو پھر اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کرنا چاہیے، میں نے ایک دفعہ نہیں بسا اوقات عمل بالقرآن کے مطالبہ کرنے والوں سے پوچھا ہے، کہ قرآن پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہے، اس میں نہ زراعت کا طریقہ بتایا گیا ہے، نہ صنعت کا، نہ حرفت کا، نہ تجارت کا، ان چیزوں کا اگر ذکر قرآن میں ہے بھی تو محض ضمنی طریقہ سے لفظ دو لفظ میں کسی دوسرے مقصد کے ذیل میں ان کا ذکر بھی آگیا ہے، یہ تو ان اعمال کا حال ہوا جن کا تعلق دنیا سے ہے، اور دینی اعمال کی کیفیت تو آپ سن ہی چکے کہ قریب قریب ان میں اکثر کے عنوانوں کا ذکر ہے تفصیل جیسی کہ چاہیے وہ ان کی بھی نہیں، اگر صرف قرآن ہی کو پیش نظر رکھ کر کوئی نماز کے اجزاء کو مرتب کرنا چاہے تو اس میں شک نہیں کہ قیام رکوع، سجود یہ مختلف اجزاء تو قرآن میں مل جائینگے، لیکن ان میں کس جز کو مقدم رکھا جائے کن کو موخر کیا جائے، قرآن سے اس کا فیصلہ کیا ممکن ہے؟ جب تک کہ پیغمبر کی زندگی سے ہم اس کو نہ سمجھیں پھر عمل بالقرآن کا کیا مطلب؟ میں نے تو نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کا کوئی معقول جواب دیا ہو۔

لیکن شیخ کبیر نے قرآن کی دو آیتوں "لئن شکرتم لازیدنکم" "ان اللہ مع الصابرین" کو جس طرح سمجھایا ہے، اور عمل سے ان دونوں کا جو تعلق دکھایا ہے، اگر آپ اس طرح قرآن کو پڑھنا شروع کریں اور اپنے دیدہ کو نادیدہ اپنے شنیدہ کو ناشنیدہ بنا کر قرآن سے پھر علم لینا شروع کر دیں یعنی آپ سارے دیدوں اور شنیدوں کو باہر نکال کر ان ہی قرآنی علوم کو اپنی فطرت کی گہرائیوں میں یقین واذعان کی بنیادوں پر جمانا شروع کر دیں، صبر کے ساتھ حق تعالیٰ کے جو مواعید ہیں، توکل پر جن ثمرات کی بشارتیں سنائی گئی ہیں، ذات حق کے ساتھ آپ کا تعلق تقویٰ کا جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات و آثار قرآن نے جو بیان کیے ہیں اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر آپ قرآنی آیات کو سکون کے ساتھ حرفاً بعد حرفٍ پڑھنا شروع کیجیے تو یقین مانیے کہ ہر آیت آپ کو عمل کے لیے ایک نیا اور جدید علم دیگی، لیکن جو کچھ

آنکھوں سے کانوں سے خود دیکھا یا سُنا ہی، یا آپ ہی جیسے کسی آدمی نے دیکھ سُن کر جو ناقص معلومات اپنے اندر جمع کئے ہیں،۔۔ ان دیدوں، اور شنیدوں کو دیدہ اور شنیدہ ہی باقی رکھتے ہوئے آپ قرآن سے اگر کچھ لینا چاہینگے تو یقین ملنیے کہ آپ کو کچھ نہ ملیگا، اور اس زمانہ کی محرومیوں کے پیچھے دراصل تنگ نظری، دماغی انحطاط کا یہی زہر چھپا ہوا ہی، وہ پیغمبر کے پاس آتے ہیں کہ عقل وحس کے سوا ان کے ذریعہ سے کچھ جدید معلومات حاصل ہونگے، لیکن جب پیغمبر آپ کے سامنے پیش کرتا ہی، کہ عالم محسوس کے پیچھے غیب کے عوالم ہیں، ان عوالم میں ملائکہ ہیں، جنات ہیں، حور ہیں قصور ہیں، نار ہے، نور ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں تو ہمیں پہلے سے معلوم نہ تھیں، میری آنکھوں نے تو ان کو نہیں دیکھا ہی، پھر ان کو میں کیسے مان لوں آپ ہی غور کیجیے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ آپ کو پہلے سے معلوم ہی اس علم پر آپ بال برابر اضافہ کرنا نہیں چاہتے، ظاہر ہی کہ جس شخص کی دماغی پستی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو، کہ جو کچھ پہلے سے معلوم ہی اُس پر اضافہ کے نام سے کانوں میں انگلیاں ٹھونستا ہو، چیختا ہو، چلاتا ہو، کیا اس کو اس جدید علم کی راہ سے کچھ بھی مل سکتا ہی، ان مسکینوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہی، کہ جب تمہارا یہی حال ہی کہ حس وعقل کے حدود کے آگے قدم رکھنے سے تمہارے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں، بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہی تو آپ پیغمبر کے پاس تشریف ہی کیوں لائے تھے، حسی اور عقلی معلومات کے لیے تو آپ کے پاس پیغام پہنچانے کے لیے آپ کے حواس آپ کی عقل موجود ہی تھی پیغمبر کی پیغمبر کے جدید ذریعہ علم وحی ونبوت کی ضرورت تو ہوتی ہی اس لئے ہی کہ حواس وعقل جہاں جواب دے دیتے ہیں وہاں سے علم کی ایک نئی راہ ہی، جو پیغمبروں کے ذریعہ قدرت نے کھولی ہی، لیکن حواس و عقل کی راہ سے جو کچھ جانا جاچکا ہی، اب مزید جاننے سے جو گھبراتا ہی، بھاگتا ہی، آپ ہی بتائیے کہ خدا کا کلام اُسے کیا دیگا۔ بہرحال اب دنیا جس طرح چاہے قرآن کو استعمال کرے لیکن ہندوستان کے جس عہد کا میں ذکر کررہا ہوں، اس میں ہندی مسلمانوں کو قرآن سے استفادہ

کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس کی ایک معمولی مثال شیخ کبیر شکر گنج کی فرمودہ وہ مثال تھی کہ کتابوں میں ان بزرگوں کے جو اقوال اس سلسلہ میں بکھرے ہوئے ہیں، اگر ان کو کوئی جمع کرے تو وہ اچھی خاصی ایک کتاب بن سکتی ہی، ظاہر ہی کہ میرے لیئے یہاں ان سب کے ذکر کی کیا گنجائش ہی، تاہم خواجہ بزرگ اجمیری کے ایک سلسلہ یعنی قطبی سلسلہ کے بزرگ کا جب نقطۂ نظر آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہی، تو جی نہیں مانتا کہ طریقۂ چشتیہ کی دوسری شاخ حمیدیہ جس کے متعلق گذر چکا کہ صدیوں تک مدارک کا درس طریقۂ سلوک کے ایک جزب کی حیثیت سے انہیں جاری تھا۔ اس سلسلہ کے ذوق قرآنی کا بھی ایک نمونہ تو کم از کم پیش کر ہی دوں، شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں شیخ حمید الدین کے ترجمہ میں ان کے بعض مکتوبات نقل کیے ہیں، ان ہی میں قرآنی آیات کی چند تفسیروں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ چیز قرآن کی مشہور آیت ۔

اَلَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا	اپنے بندوں سے جن لوگوں کو ہم نے چنا
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ	ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اپنے نفس کے
مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ	لیے ظالم ہیں کچھ میانہ رو ہیں کچھ ان میں نیکیوں
بِاِذْنِ اللّٰهِ	کی طرف سبقت کرنیوالے ہیں اللہ کے فرمان سے

کے متعلق ایک لمحظ پیش کیا ہی، تفسیروں میں اس آیت کے مطلب میں لوگوں نے کیا فرمایا ہی، اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں بلکہ شیخ حمید الدین نے جو کچھ او قام فرمایا ہی صرف اس کا خلاصہ پیش کرنا مقصود ہی، ظاہر ہی کہ مذکورۂ بالا آیت میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہی ظالم لنفسہ (اپنے آپ کے ساتھ ظلم کرنے والا) مقتصد (میانہ رو) سابق بالخیرات (نیکیوں کے ساتھ آگے بڑھنے والا)

سوال ہوتا ہی کہ یہ تینوں قسمیں کیا ایسی ہیں جن میں مومن غیر مومن سب ہی شریک ہیں، یا اہل ایمان ہی کے اندر یہ تین طبقات پائے جاتے ہیں۔ شیخ ناگوری نے اس قرینہ سے

کہ ذکران لوگوں کا ہے جو چُنے گئے "یعنی اصطفینا من عبادنا" (ہم نے اپنے بندوں سے جنہیں چن لیا ہے) ان ہی کی یہ تین قسمیں بتائی گئی ہیں، اس لیے غیر مومن عباد ان قسموں کے نیچے داخل نہیں ہو سکتے۔ شیخ نے اس کے بعد اہل ایمان کے ان تینوں طبقوں کی تعبیر اپنے الفاظ میں معذوران، مشکوران، فانیان سے کی ہے۔ گویا ظالم لنفسہ والے ان کے خیال میں "معذوراں اند" کے نیچے داخل ہیں یہ معذوران کون لوگ ہیں:

آنہا کہ بعد ایمان باللہ و اقرار ہم بالتوحید بحضرت حاضر نیامند، دیر آیند و آہستہ آمند و از خطاب سارعوا (تیزی دکھاؤ تعمیل احکام میں) غافل باشند"

گویا ان لوگوں نے اپنے ان فرائض کو جو ان کے نفوس پر عائد ہوتے تھے ان میں ظلم کا ارتکاب کیا ان حقوق کی ادائگی میں کمی کی، اس لیے وہ ظالم لنفسہ ٹھہرے

مشکوران یعنی مقتصد کون لوگ ہیں: ۔ "بایان ہم عنان آنند و باقرار ہم رکاب"

مقتصد (میانہ رو) کا مطلب شیخ کے نزدیک یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے مانا تھا جن باتوں کا اقرار کیا تھا، ان کے ساتھ ساتھ لگے چلے آرہے ہیں)۔ اور یہ ہوا اقتصاد کے معنانی کا مطلب۔

فانیان یعنی سابق بالخیرات کون لوگ ہیں، شیخ نے لکھا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی فطرت میں "الست بربکم" کے سوال کا جواب "بلیٰ" (کیوں نہیں) دب کر اپنے آثار کو کھو نہیں چکا تھا، بلکہ اس کا شعور ان میں باقی تھا، اس لیے۔

"دریں جہاں پیش از دعوت بحکم خطاب ازلی وجواب لم یزلی، اجابت کردہ"

شیخ نے اس قسم کے تمام واقعات یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہم اصحاب سے جو یہ مروی ہے کہ بغیر کسی تذبذب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سننے کے ساتھ ہی ایمان لے آئے، یا اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بے دیکھے پیغمبر کو مان لیا، یا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ تلاش حق میں اس ملک سے اس

ملک، اس راہب سے اُس راہب کے پاس پھرے پھرتے تھے، تا اینکہ مدینہ منورہ پہنچے، اور دولتِ ایمان سے مشرف ہوئے۔

شیخ نے ان تمام بزرگوں کے ابتداء اسلام کے قصوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے، جس سے ان کی اس وسعتِ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو معرفۃ الصحابہ کے فن میں انہیں حاصل تھی لیکن میرا مقصود اس وقت صرف خواجگانِ چشت کے قرآنی ذوق کا ایک دوسرا نمونہ پیش کرنا تھا، میں یہ نہیں کہتا کہ شیخ نے جو مطلب آیت کا بیان کیا ہے، اُس کی طرف دوسری تفسیروں میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن جس خوبی کے ساتھ اُنہوں نے اہل ایمان کے تینوں طبقوں پر ان تینوں لفظوں کو منطبق کیا ہے کم از کم میرے علم کی حد تک اتنی اچھی ستھری سلجھی ہوئی بات کسی اور تفسیر میں نہیں گذری ہے[1]۔

اور یہ تھا اُس زمانہ میں قرآن کی تلاوت کا طریقہ جسے ہندوستان میں بزرگانِ چشت نے جاری کیا تھا، ان ہی بزرگوں سے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ڈھول سارنگی، ستار کے سوا اس ملک میں وہ اور کچھ نہیں لائے۔

گفتگو دراصل اس میں ہو رہی تھی کہ حضرت سلطان المشائخ کو شیخ کبیر شکر گنج نے قرآن کے حفظ کی وصیت فرمائی، اسی سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود تھا، یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حفظ سے ان بزرگوں کی غرض صرف الفاظ قرآنی کا یاد کر لینا تھی، اسی لیے

---

[1] مدت ہوئی دلی میں کسی صاحب کے پاس سلطان التارکین ناگوری کی بعض چیزیں نظر سے گذری تھیں، ایک قرآنی لطیفہ کا خیال بھی آگیا۔ خواجہ بزرگ اجمیری نے ان کو خطاب کر کے کہا کہ جب تک میں متاہل نہ تھا بال بچے نہیں ہوئے تھے، یہ حالت تھی کہ دل میں کسی بات کا خیال آیا اور حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ پوری فرما دیتے تھے، لیکن بال بچوں کے قصوں میں پڑنے کے بعد اب یہ حالت نہیں رہی ہے، دعا قبول تو ہوتی ہے لیکن کچھ تاخیر کے ساتھ سلطان التارکین نے عرض کیا کہ مریم علیہا الصلوٰۃ کے متعلق بھی قرآن میں ہے کہ جب تک عیسیٰ علیہ السلام نہیں پیدا ہوئے تھے، من عند اللہ رزق ان کے پاس آجاتا تھا، لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں تو اسی رزق کے لیے ان کو ھزی الیك بجذع النخلۃ (ہلا اپنی طرف کھجور کے درخت کو) کا حکم دیا گیا یعنی اسباب خواہ جیسے کچھ ہوں ان کی وہ محتاج ہوگئیں، اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان بزرگوں کا طریقہ تدبر فی القرآن

مناسب معلوم ہوا کہ مشائخ چشت میں تلاوت قرآن اور تدبر قرآن کا جو طریقہ تھا، اُس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

اب میں پھر اُسی مضمون کی طرف واپس ہوتا ہوں مطلب یہ ہے کہ یہ تو شیخ کبیر کی وصیت تھی۔

وصیت کی تعمیل

میں نے عرض کیا تھا کہ ۶۶۹ھ سنہ ہجری ۲۵۔ جمادی الاولیٰ نماز جمعہ کے بعد شیخ کبیر نے سلطان المشائخ کو حفظ بالقرآن اور "ہند گیری" کی مہم کی خدمت سپرد کی تھی، اس کے بعد کیا ہوا؟ خوش قسمتی سے اس سلسلہ کی بعض چیزیں میر خورد صاحب سیر الاولیاء کے ذریعہ سے ایسی مل گئی ہیں جو سلطان المشائخ کی خود نوشتہ یادداشت سے ماخوذ ہیں، جمادی الاولیٰ کا مہینہ تو گویا گذر ہی چکا تھا، دو مہینے یعنی جمادی الثانیہ، اور رجب کے بعد پہلی شعبان کو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شیخ کبیر کی خدمت میں میری طرف سے دعا کی یہ درخواست پیش ہوئی؛ میر خورد نے ان ہی کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

"از برائے آں کہ کاتب در بدر خلق نہ گردد" ص ۱۲۳

عجب درخواست! مہم اتنی بڑی سپرد کی گئی ہے، کہ سارے ہندوستان پر قبضہ کرنا پڑیگا، اور شرط یہ لگائی جاتی ہے کہ کسی مخلوق کے دروازے پر مارا مارا نہ پھرنا پڑے، آج اس کا تصور کون کر سکتا ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ اس مہم میں مشغول ہونے کے بعد سلطان المشائخ کے لیے اس کا موقع تو کہاں تھا کہ اب کسی کی وہ ملازمت کرتے، ملازمت کی آمدنی ہو یا کسی اور ذریعہ کی انفرادی آمدنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اتنی بڑی اہم خدمت کی سرانجامی کے لیے جسے بعد کو سلطان المشائخ نے انجام بھی دیا، اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن چندوں کا تو دروازہ کھلا ہوا تھا، سلطان المشائخ اس کو بھی برداشت کرنا نہیں چاہتے، سب کچھ ہو جائے اور کسی مخلوق کے دروازے

پر پھٹکنا بھی نہ پڑے، یہی ان کی درخواست تھی، فرماتے ہیں کہ شیخ نے درخواست قبول فرمائی

"باجابت و فاتحہ مقرون فرمود"

"فاتحہ" یہ اس زمانہ کا دستور تھا، کہ جب کوئی کسی کے لیے دعا، کرتا تھا تو سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعا کی جاتی تھی، اسی بنیاد پر محاورہ ہوگیا تھا کہ کسی دوسرے سے جب کوئی دعا، کی درخواست کرتا تو یہی کہتا کہ "برائے من فاتحہ بخوانید"

بہرحال یہ تو اُس دن کا قصہ ہوا، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ایک خاص موقعہ پر شیخ کبیر نے یہ بھی فرمایا کہ

"من از خدا خواستہ ام کہ ہرچہ از خدائے بخواہی بیابی"

اور اپنی عصا بھی ان کے حوالہ کی، سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شیخ کبیر حجرہ میں چلے گئے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ

"درحجرہ سر برہنہ کردہ و بشرہ متغیر کردہ می گشت"

یعنی سر سے ٹوپی اُتار کر شیخ کبیر حجرہ میں ٹہل رہے تھے چہرہ متغیر تھا۔ فرماتے ہیں کہ اسی خاص حال میں سُن رہا تھا کہ ایک خاص کیفیت کے ساتھ شیخ کبیر کی زبانِ مبارک پر یہ اشعار جاری ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم	خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی	از بہر تو میرم از برائے تو زیم

گویا آیت قرآنی

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ	میری نماز (عبادت) میری قربانیاں میری زندگی
مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔	میری موت، اسی اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پالنے والا ہے۔

کا ترجمہ ہو رہا تھا، سلطان جی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب یہ اشعار ختم ہوگئے تو شیخ کبیر

"سر بسجدہ نہاد، چند کرت (بار) من مثل این دیدم"

جس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ کسی کے قدموں پر بار بار شیخ کبیر سر رکھتے تھے اور اُٹھاتے تھے، یہ کیا ہو رہا تھا، کیا اس کے لیے جس نے دعا کرائی تھی کہ "در بدر خلق نہ گردد" اُسی کو "در بدر گردی" کی جھنجھٹوں سے نجات کی تدبیر بتائی جا رہی تھی!

سیر الاولیاء ہی ہیں دوسری جگہ سلطان المشائخ کے خلیفہ اعظم حضرت چراغ دہلوی کے حوالہ سے شیخ کبیر کے ایک قول کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کبیر کے مشہور وابستوں میں شیخ جمال الدین ہانسوی تھے اُنہوں نے کسی شخص کے ذریعہ سے شیخ کبیر کو کہلا بھیجا تھا کہ آج کل ذرا تکلیف اور ضیق میں گذرتی ہے، شیخ کبیر نے جواب میں کہلا بھیجا تھا

"چوں ولایت بکسے دادہ شود اورا واجب ست استمالت آں ولایت" صہ۱۸۰

جس کا ظاہر مطلب تو یہ تھا کہ آدمی کو جہاں کی حکومت ملتی ہے، چاہیے کہ اُس ملک کے باشندوں کی دل دہی کرے، اور ان کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے۔

چراغ دہلوی سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ تو دنیا کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ ہے تو کیا دین کے بادشاہوں کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ شیخ کبیر کے اس فقرہ کا جو واقعی مطلب تھا چراغ دہلوی نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"استمالت ملوک آخرت توجہ القلب الی اللہ من کل الوجوہ"

یعنی آخرت کے بادشاہوں کو بھی "استمالت" سے کام لینا پڑتا ہے لیکن وہاں کے باشندوں کے قلوب کو نہیں بلکہ قلوب جس کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگانا یہ ہے آخرت کے بادشاہوں کی استمالت کا طریقہ قرآن کا تاریخی بیان ہے کہ

مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (سورۃ الانبیاء)

نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی کی اس رسول کی طرف اس بات کی "نہیں ہے کوئی "الٰہ" مگر میں" تو مجھی کو پوجو

خاتم الرسل اور خاتم الرسل سے پہلے جو بھی آخرت کی بادشاہت کا پیغام لے کر آئے یہی کہتے آئے کہ اللہ سوا کوئی نہیں ہے جسے "اِلٰہ" بنایا جائے۔ من کل الوجوہ قلب کی ساری توجہات کا ساری آرزوؤں کا، ساری تمناؤں کا مرجع خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کی ذات مبارک ہی ہو، اپنی "ہندگیری" کی مہم میں سلطان المشائخ نے دراصل اسی قوت کی درخواست کی تھی، شیخ کبیر اپنے طرز عمل سے بھی بتا رہے تھے کہ اس قوت سے کام لینے اور استفادہ کا کیا طریقہ ہے، سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں نے شیخ کبیر شکر گنج کو دیکھا کہ بار بار وہ سجدے میں سر رکھتے ہیں اور اُٹھاتے ہیں، ان پر ایک خاص حال طاری ہے، تو مجھ سے رہا نہ گیا، اور بے اختیار مضطربانہ حجرہ میں داخل ہو گیا، اور حضرت کے قدموں میں لوٹنے لگا، ایک عجب جلال کا عالم تھا، اُس وقت فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے لیے دعا کی جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کی دعا کی اس وقت درخواست کی تھی فرمایا۔ "استقامت خواستم"

لا الٰہ الا اللہ پر استقامت ہی کا وہ نشہ تھا، جو شیخ کبیر کی صحبت نے سلطان المشائخ میں بھر اتھا۔

ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دلّی کی طرف روانہ ہوتے ہیں، جہاں نیچے سے اوپر تک بے شمار جھوٹے اِلٰہ پر اجائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جس کی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سے سر جدا کر رہی ہے، وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اُٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں، اور جن جن ذرائع سے یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں، سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں، آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دلّی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے، کچھ نہیں تو قضاۃ کے عہدے سے لے کر شیخ الاسلامی اور صدر جہانی کے خدمات تک

کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو اللہ ان کو مل چکا تھا، سینہ اسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی، قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی، جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے

"ایمان کسے تمام نہ شود تا ہمہ خلق در نزدیکی او ہم چو پشک شتر ننماند" سیر الاولیار ص۵۵۱

مجلس مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا، جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لیے ساری ساری رات نمازیں پڑھتا تھا، اپنی ان ہی نمازوں کو نگاہ خلق میں حصول عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا، جامع ملفوظات راوی ہیں کہ

"دریں میان خواجہ ذکراللہ بالخیر چشم پرآب کرد و بر لفظ مبارک راند کہ بسوز اول شیخ الاسلامی را وپس خانقاہ را بعد ازاں خود را" فوائد الفواد ص۲۳

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ کو جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے پہلے بداؤں پہنچے، والدہ اور ہمشیرہ، گھر میں اور جو لوگ تھے سب کو ساتھ لے کر جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایہ تخت میں پہنچ گئے۔

دلی میں جب آپ شروع شروع قیام کے ارادے سے پہنچے ہیں۔ اور اس ارادے سے کہ سب کچھ ہو گا لیکن کسی مخلوق کے دروازے پر جانا نہ پڑے۔ آخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ ۔۔۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے

لہ میں نے بھی مختلف مقامات پر شیخ کبیر اور سلطان المشائخ دونوں حضرات کی طرف خانقاہ کا انتساب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشائخ چشت کی منجملہ اور خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اصطلاحی صوفیوں والی خانقاہ کا نظام ان کے یہاں نہ تھا، فوائد الفواد میں شیخ کبیر کا قول سلطان جی نے نقل کیا ہے "پیران مارا رسم خانقاہ نبود ص۹۷" اس لیے جہاں جہاں میں نے خانقاہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے باضابطہ خانقاہ نہ سمجھا جائے ٹھیک جیسے اس چشتی ملک ہندوستان میں باضابطہ مدارس کم تھے ۱۲۔

لَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ؟

اور تم سے پہلے جو گذرے ہیں ان جیسی باتیں تم پر نہ آئینگی اُن کو سختی اور دُکھ نے چھوا، وہ جھنجھوڑے گئے، خوب اچھی طرح جھنجھوڑے گئے تا اینکہ بول اُٹھے پیغمبر اور ایمان والوں میں جو ان کے ساتھ تھے، کب اللہ کی مدد ہو۔

تفصیلات دیکھنا ہو، تو سیر الاولیاء میں دیکھیے، جس میں میر خورد نے براہ راست اپنے والد میر مبارک کرمانی کے حوالہ سے اس زلزال شدید (سخت جھنجھوڑ) کے ان تفصیلات کو نقل کیا ہی، جن سے حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کو گذرنا پڑا، خلاصہ یہ ہی کہ ابتداءً دلی میں "سرائے نمک" کے نام سے کوئی سرا تھی، وہاں کچھ دن ٹھہرے، پھر امیر خسرو کی کوشش سے ان کا ننہیالی مکان جو راوت[1] عرض کے مکان سے مشہور تھا، یہاں قیام رہا۔ یہ مکان آرام بخش تھا، میر خورد نے لکھا ہی کہ "سہ پوشش داشت" یعنی سہ منزلہ مکان تھا، درمیانی منزل میں سلطان المشائخ کا قیام تھا، باقی اوپر اور نیچے والے حصہ میں آپ کے وابستگان میں سے کچھ لوگ رہتے تھے، جن میں میر خورد کے والد کا خاندان بھی تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد راوت عرض کے لڑکے اضلاع سے آگئے اور اُنھوں نے شباشب مکان خالی کرالیا۔

لکھا ہی کہ سراج بقال کی دکان کے پاس کوئی مسجد تھی، اسی مسجد میں کوئی علیحدہ "چھپرداء" تھا، غالبًا سائبان ہوگا، وہاں رہنا پڑا، وہاں سے اُٹھے تو رکابدار کی سرائے میں کچھ دن قیام رہا، پھر کوئی محمد میوہ فروش کی دکانوں سے متصل کوئی شخص شادی گلابی کا مکان تھا، وہاں رہے، الغرض یونہی آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، دلی میں قیام کی صورت تھی[2] لیکن با ایں ہمہ پراگندہ خاطری، سلطان المشائخ کس مشغلہ میں مصروف تھے، میر خورد

---

[1] واللہ اعلم یہ "راوت" کا لفظ کیا ہی۔ اعظم گڈھ بہار میں "روتاڑا" شیوخ کا ایک بڑا قبیلہ آباد ہی۔ کیا یہ "تاڑا" کا لفظ اسی "راوت" سے بنایا گیا ہی۔ تاڑا تو ہندی میں غالبًا خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں۔ ۱۲۔

[2] دیکھو حاشیہ ۲ بر صفحہ ۱۵۲

نے لکھا ہے

"دراں ایام اتفاق ماندن در شہر نہ بود"

پھر کہاں رہتے تھے، سیر الاولیاء اور فوائد الفواد دونوں ہی میں آپ کا ہی بیان ہے کہ

"بر سر حوض قتلغ خاں بودم"

شہر سے باہر قتلغ خاں کا کوئی تالاب تھا، اسی تالاب کے کنارے زیادہ وقت گذرتا تھا، کس چیز میں گذرتا تھا؛ خود فرماتے ہیں:-

"دراں ایام قرآن یاد می گرفتم" ص ۱۱۰

یعنی سب کچھ گذر رہا تھا، لیکن شیخ کبیر کی وصیت کی تکمیل کی دھن تھی، جو الٰہ آپ کو دیا گیا تھا من کل الوجوہ قلب کو اسی سے متعلق کرنے میں "یقین" کے اس نسخہ سے زیادہ مقوی نسخہ اور کیا ہو سکتا تھا، اور سچ پوچھیے تو گو اپنی جامعیت کے لحاظ سے قرآن میں وہ سب کچھ ہے جس کی تشریحی شکل کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، بار بار قرآن میں جن چیزوں کو دُہرا دُہرا کر بیان کیا گیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں یہی دو مقدمات ہیں۔

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کے دعوے میں سچے ہیں؛

(۲) اور دوسری بات یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، وہی ایاك نعبد (ہم تجھی کو پوجتے ہیں) وایاك نستعین (تیری ہی اعانت ہم چاہتے ہیں) وہی معبود وہی ہر حاجت اور ہر ضرورت کا مستعان ہے۔

پہلے مقدمہ پر یقین اور وثوق کی بنیاد قائم ہے اور اس بنیاد پر جس علم کو بنی آدم کے لیے

(حاشیہ صفحہ ۱۵۱) ؎ ان تفصیلات کا تذکرہ میں نے ایک اور مقصد سے بھی کیا ہے اس زمانہ (یعنی ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی) میں دلّی اور دلّی کی زندگی طریقہ بود و باش و تعمیر وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سہ منزلہ مکانات بھی بن گئے تھے، چھپر کی مسجد بھی ہوتی تھی، مسلمان بھی بقالی، میوہ فروشی، گلاب فروشی وغیرہ کے پیشے اس زمانہ میں کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ ۱۲۔

قدرت سب سے زیادہ یقینی قرار دینا چاہتی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارا الٰہ ہمارا معبود و مستعان اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ساری ضرورتوں ساری حاجتوں کا واحد مستعان کسی مخلوق کی ذات نہیں بلکہ خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی ذات بے ہمتا ہے تو اس کو چھوڑ کر جو اپنی حاجتوں کے لیے جہاں بھی جاتا ہے، قدرت کے قانون سے ٹکرا کر جا رہا ہے، قدرتی قوانین سے ہٹنا اور ٹکرانا اسی کا نام تو ظلم ہے، مقررہ حدود سے تجاوز ہے، یہی مطلب ہے تسبیح یونسی

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ — یعنی الٰہ آپ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، آپ کی الوہیت میں کوئی دوسرا شریک ہو، اس سے آپ کی ذات پاک ہے، تو میں ہی ظالم تھا کہ جو الٰہ تھا اُس کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھٹکتا رہا جو الٰہ نہ تھے۔

کا، اف جن دلوں کو اپنے حقیقی الٰہ یعنی اپنی حاجتوں ضرورتوں اپنے رجحانات و میلانات سب کا مرجع حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی نظر آتی ہے، ایسے سارے فطری مطالبات کی تکمیل کا سرچشمہ صرف اسی علیٰ کل شیٔ قدیر کی قوت بن جاتا ہے، ایسے قلوب میں طلب حق کی جو آگ بھڑکتی ہے، بقول سلطان المشائخ

"بایں آتش جمیع اخلاق رزیلہ و ذمیمہ سوختہ می شود، و صفا پیدا آید و شایان محبت حق گردد" (سیر ص ۴۶)

اسی لیے مشائخ چشت کو آپ جو پلٹتے ہیں، کہ اخلاق اور اس کے اقسام رذائل و فضائل مہلکات و منجیات اور از ایں قبیل تصوف کے دوسرے مسائل پر اُنھوں نے کتابیں لکھی ہی نہیں[1]۔ یا لکھی ہیں تو مختصر اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بات کو طول دینے کی اُنھوں نے

[1] فوائد الفواد میں ہے کہ سلطان جی کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ اودھ میں ایک صاحب نے مجھے کتاب دکھائی اور کہا کہ حضرت والا کی لکھی ہوئی ہے فرمایا "من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام" عجب شان ہے نہ کتاب ہے نہ خانقاہ لیکن کام کتاب والوں اور خانقاہ والوں سے بھی زیادہ کر گیا ۱۲۔

ضرورت ہی محسوس نہیں کی "اِلٰہ" کے لفظ کو سمجھانا، یعنی جیسا کہ مولانا روم نے سیبویہ کے حوالہ سے اِلٰہ کے معنی

یولھون فی حوائجھم — یعنی "الٰہ" اس کو کہتے ہیں جس کی طرف انتہائی ولہ اور وارفتگی

الیہ — کے ساتھ لوگ اپنی حاجتوں میں رجوع کریں۔

نقل فرمایا ہے، بس اسی کا تحقق۔ اسی کی یافت کہ حاجتوں میں جس کی طرف گڑگڑا کر بلبلا کر آدمی ٹوٹ پڑے وہ ارحم الراحمین رب و دود، رحیم کے سوا کوئی نہیں ہے، جس نے اس کو پالیا، سب کچھ پالیا، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ چشتیہ طریقہ کی بنیاد ولہ اور عشق پر مبنی ہے گویا ع

سو علاجوں میں یہی ایک علاج اچھا ہے

بہرحال دلّی میں سلطان المشائخ کی گذر رہی ہے، قرآن ہے، قتلغ خان کا تالاب ہے اور وہ ہیں۔ آئندہ کیا ہوگا "ہندگیری" کی مہم سر کرنے کے اسباب کیا پیدا ہونگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجز ایک الٰہی تدبیر کے اور کسی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زلزال شدید کا یہ زمانہ مہینوں اور دنوں کا تھا۔ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال اس حال میں گذر گئے اور وہ گذارتے رہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان دنوں میں ان پر کیسی کیسی سخت گھڑیاں گذر گئیں۔ میر خورد نے آپ ہی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ

کہ در عہد غیاثی (غیاث الدین بلبن) کہ دراں وقت در دو جیتل[لہ] منے خربزہ بود، لیکن بیش تر از فصل گذشتہ بود کہ من خربزہ نچشیدہ بودم"

اور خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں سننے کی بات تو آگے کی ہے۔

"براں خوش می بودم و آرزو می بردم کہ اگر باقی فصل ہم خربزہ خوردہ نہ شود نیکو باشد"[ص ۱۱۳]

اور جب "ہر اِنچہ ساقیِ من ریخت" میں کسی کو لطف آجاتا ہے تو پھر اس کا یہی حال ہوتا ہے، توحید

لہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے کسی جگہ میں نے جیتل کا ترجمہ دمڑی کیا ہے، اور دمڑی پیسہ کی چوتھائی کو کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کرنا چاہیے کہ اُس وقت کی چیزوں کا بھاؤ کیا تھا ۱۲۔

کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں جن سے موحد لذت گیر ہوتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دل دوز جگر خراش وہ واقعہ ہے جو آپ ہی کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج ہے کہ

"فرمود، یک شبا روز گذشتہ بود و شب دیگر آمدہ نصفے ہم گذشتہ کہ چیزے نخوردہ بودم" ص۱۱۳

اور یہ ارزانی کے کس زمانہ کی بات ہے، خربزوں کا حال تو سُن چکے کہ ڈو جیتل میں ایک من کے حساب سے دلی میں بک رہے تھے، اب جو ایک دن ایک رات اور پھر دوسرے دن کی بھی آدھی رات اس شان سے گذری کہ "چیزے نخوردہ بودم" اس وقت کی ارزانی یہ تھی کہ

"دراں ایام بہ یک جیتل دو سیر نان میدہ می دادند[1]" ص۱۱

جس کے معنی یہ ہوئے کہ پکی پکائی گیہوں کی دو سیر میدہ کی روٹی ایک دمڑی میں ملتی تھی لیکن اس ارزانی کے باوجود جو "الباساء" "والضراء" کی کسوٹی پر چوپر کھا جارہا تھا، اس کا حال یہ تھا کہ

"مرا یک دانگ ہم نہ بودے تا نان ہم بخورم"

اور خود یہ کیفیت اکیلے تنہا آپ ہی کی ذات پر نہیں گذر رہی تھی، بلکہ خود فرماتے ہیں۔

"والدہ و ہمشیرہ من و دیگر آدمیاں خانہ کہ در مؤنت من بودند ایشاں را ہم ہمیں حال بود" ص۱۱۴

(زیر پرورش ۱۲)

اور ظاہر ہے جیسا کہ سلطان المشائخؒ سے ہی سیر الاولیاء میں ان کا یہ قول منقول ہے کہ درویشوں کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے یعنی

"ہر دری معنوی کہ ظاہر خود در الطریق مشغولاں حق می نماید و باطن در بدر می گردد"

قلب کی اس کیفیت کے متعلق جس کا خیال ہو۔

"نعوذ باللہ کہ کسے را ایں معاملہ باشد"

کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی دوسرا خیال قائم کرسکتا ہے، بلکہ جہاں تک واقعات و حالات سے معلوم ہوتا ہے، یہ "عہد زلزالی" عام اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ زیادہ تر شیخ کبیر شکر گنج

[1] عہد اسلامی میں ہندوستان نے کن ارزانیوں کا لطف اُٹھایا ہے، میرے خیال میں اس سے بہتر شہادت کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی ہے۔ شہادت ادا کرنے والے سلطان المشائخؒ ہیں۔ اور جس کتاب سے شہادت نقل کی گئی اس کے مصنف سلطان المشائخؒ کے مرید ہم زمانہ ہیں ۱۲۔

رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کی تکمیل ہی میں گذرتا تھا، غالباً یہ اشتغال بالقرآن ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ آپ پر یہ حال طاری ہوگیا تھا جس کا ذکر بعد کو فرمایا کرتے تھے کہ

"درمبدء حال باخود جزم کردہ بودم کہ نہ کتابے بنویسانم و نہ بہ بہار قیمت) بستانم" سیر[۱۴۵]

گویا قرآن کے سوا نہ کچھ پڑھنا چاہتے تھے نہ کسی سے کچھ سُننا چاہتے تھے۔ شیخ نے یہی کتاب حوالہ کی تھی، اسی کو پی رہے تھے، پیتے جا رہے تھے، بالآخر پیغمبر کے اس نسخہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا، یعنی حدیث میں جو آیا ہے، حدیث قدسی ہے، ترمذی اور دارمی اس کے راوی ہیں۔

من شغلہ القرآن عن	"القرآن" میں مشغول ہونے کی وجہ سے اگر کسی کو
ذکری ومسئلتی اعطیتہ	ذکر یا دعا کا موقعہ نہ مل سکے، تو میں اس کو دعا کرنے
افضل ما اعطی السائلین	والوں اور مانگنے والوں سے (بے مانگے ہی) بہت
	زیادہ کرکے دیتا ہوں

سلطان المشائخ نے اس حدیث کا ایسا زندہ تجربہ پیش کیا ہے کہ جس کے چرچوں سے چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی ہندوستان کے گلی کوچے معمور ہیں، آج بھی ان کے دسترخوان کا تذکرہ لذت بخش کام و دہن بنا ہوا ہے، اور ایک دسترخوان کیا پھر خدا نے ان کو جس جاہ و جلال کے ساتھ اسی دلّی میں رکھا، سب جانتے ہیں کہ سلاطینِ وقت کو بھی اس پر رشک آتا تھا، جس کی تفصیل کا نہ یہاں موقع ہے اور جس مقصد سے میں نے ان کے حالات کے تذکرہ میں ایک خاص قسم کی تفصیل سے کام لیا ہے، اس مقصد کے رو سے نہ اس کی ضرورت ہے۔

بہرحال یہ تو معلوم نہ ہو سکا، کہ حفظ بالقرآن کی وصیت کی تکمیل کا موقعہ آپ کو کتنے دنوں میں میسر آیا، تاہم اس کے تو بیسیوں قرائن ہیں کہ آپ نے کامل قرآن اسی عمر میں زبانی یاد کرلیا، فوائد الفواد میں بچپن کے اُستاد جن کی فیض بخشی مشہور تھی، ان کا ذکر کرتے

ہوئے آپ نے فرمایا کہ

"بہ برکت آں قرآں یاد شد" ص ۱۵۴

اگرچہ اس کے بعد آپ کا وہ ارادہ کہ نہ کوئی کتاب لکھواؤنگا اور نہ خریدونگا باقی نہ رہا، اور نہ اس کو رہنا چاہیے تھا کہ وہ بہرحال ایک کیفیت تھی، جو آتی ہی اور گذر جاتی ہی سلطان المشائخ کا ادبی مذاق فارسی زبان کا طبعی تھا۔ اس لیے علاوہ دینی کتابوں کے کبھی کبھی ادبی کتابیں بھی دوسروں سے سُنا کرتے تھے، اور امیر خسرو کی شاعری کے پیچھے تو سچ پوچھیے سلطان المشائخ ہی کی شعریت چھپی ہوئی ہی جس کا ظہور ان کے "ترک اللہ"[1] کے ذریعہ سے ہوا، میر خورد نے لکھا ہی

"امیر خسرو در ایام آغاز شعر گفتن بود ہر نظمے کہ گفتے بخدمت سلطان المشائخ گذرانیدے تا روزے حضرت سلطان المشائخ فرمود بہ طرز صفاہانیاں بگوی"

کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں امیر نے ایسی شاعری شروع کی جس میں حقیقت کا اظہار مجاز کے پردہ میں کیا گیا ہی، یہ بھی لکھا ہی کہ امیر خسرو نے

دیوان مبتدا و منتہی برابر قاضی معزالدین یا پچہ پدر مولانا رفیع الدین یا پچہ بخدمت سلطان المشائخ بتمام گذرانید، ورموز اشارات آں را تحقیق کرد" ص ۳۰۱

واقعہ یہ ہی کہ سلطان جی سے اگر ہندستان کو اور کچھ نہ ملتا، صرف امیر خسرو ہی ملتے تو اس ملک کی سپاس گذاری اور منت شناسی کے لیے بھی کافی تھا لیکن باوجود ان مشاغل کے بھی قرآن سے جو آپ کا تعلق تھا، اُس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہی کہ آپ جب کبھی حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر کے متعلق اس مشہور قصہ کا ذکر فرماتے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو جن سے بے تعلق ہو چکے تھے ایک دفعہ اُٹھا کر چاہا کہ مطالعہ کریں، غیب سے آواز آئی "ابوسعید عہدنامہ باز دہ" حضرت سلطان المشائخ اس قصہ کا ذکر فرماتے۔ علا سجزی راوی ہیں کہ

[1] امیر خسرو کا یہ مشہور خطاب ہی جو اپنے پیر سے ان کو ملا تھا ۱۲۔

چوں بریں حرف رسید بگریست وایں دو مصرعہ برزبان مبارک راند ؎

توسایہ دشمنی کجا در گنجی　　جائے کہ خیال دوست زحمت باشد　فوائد ص ۹۱

قرآنی ذوق کا یہ حال تھا، کسی طرف سے ذرا خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھنے کی آواز آئی رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے بقول امیر خسرو۔

"از شنیدن آں حالے وذوقے وشوقے پیدا شد" ص ۲۷۶

اسی طرح آپ کے دست گرفتوں میں جن لوگوں کی موزوں طبیعتیں تھیں، آپ شعر گوئی سے ان کو منع تو نہیں فرماتے بلکہ آپ دیکھ چکے کہ امیر خسرو کی شاعری کو تو آپ ہی نے راہ پر لگا دیا۔ خود ان کے دواوین کو سنا اصلاح اور مشورے دیے، لیکن اسی کے ساتھ اس کی کوشش فرماتے تھے کہ شاعری کا ذوق قرآنی ذوق پر جو طریقہ چشت کی خصوصیت خاصہ ہے، اس پر غالب نہ آئے، حسن علا سنجری نے فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ۔

بندہ عرضداشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ قرآن خواندن برشعر گفتن غالب آید" ص ۲۴۹

پھر اپنی حالت عرض کی میری غرض تو یہ تھی کہ ادبی حوصلہ افزائیوں کے ساتھ ساتھ قرآن کے ساتھ جو خصوصی تعلق اپنے وابستوں کا حضرت رکھنا چاہتے تھے، اس کا ثبوت پیش کروں اور یہ بات "بارہا" کے لفظ سے ظاہر ہے۔

اسی "بارہا" اصرار ہی کا نتیجہ وہ تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسا مکثر شاعر جن کی کتابوں کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ ... تک پہنچ گئی ہیں روزانہ تہجد میں سات پارے اس طریقے سے پڑھتے تھے جس سے ان پر تلاوت کے آثار طاری ہوتے تھے۔

ایک غلطی جو غالباً صدیوں سے چلی آتی ہے اس کے ازالہ کے لیے کیا کروں، مجبوراً مجھے طوالت سے کام لینا پڑ رہا ہے، ورنہ لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا، او حضرت نظام المشائخ ہی کے گرد وپیش کے واقعات، ان کی خانقاہ جو جماعت خانہ کے نام سے موسوم تھی،

اگراسی کا حال غور سے پڑھتے تو ان پر کھل سکتا تھا، کہ اس کا سارا ماحول تلاوتِ قرآن سے بھرا ہوا تھا، بلکہ کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے، کہ ان کا جماعت خانہ دراصل ایک قسم کا مدرسۃ الحفاظ تھا واقعہ یہ ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ سلطان المشائخ نے آخر وقت تک تجرد کی زندگی گذاری لیکن مصالح نے ان کو اس مسلک کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا، جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تاہل سے افضل ہے، ظاہر ہے کہ میری بحث سے یہ اس وقت خارج ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بظاہر وقاہل کے جھنجھٹوں سے آزاد تھے، لیکن جس کے دل کا حال یہ ہو جیسا کہ حضرت کے خادم خواجہ عبدالرحیم سحری کھلانے والے صاحب کا بیان ہے کہ باوجود عموماً روزہ رکھنے کے سحری برائے نام ہی آپ کے پاس آتی تھی، خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ

عرضداشت می کردم کہ مخدوم وقت افطار ہم طعام کمتری خورد، اگر طعام سحر ہم اندکے تناول کند حال چہ شود ضعف قوت گیرد"

خواجہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ میری اس عرضداشت پر

دریں محل بگریستے وگفتے چندیں مسکیناں ودرویشاں در کنجہائے مساجد ودکانہا گرسنہ وفاقہ زدہ افتادہ اند ایں طعام در حلق من چگونہ فرو رود (سیر الاولیاء ۱۲۸)

روتے جلتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے، خواجہ عبدالرحیم بیچارے سحری جیسی کی ویسی اٹھا لیتے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس کے سینہ میں ایسا دل رکھا گیا ہو، وہ اصطلاحی تاہل کے خرخشوں سے اگر آزاد بھی رہا تو کیا واقعی اسے آزادی میسر آسکتی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ دلی

لہ عجیب بات ہے کہ دن کے روزے اور رات کے کھانے کا یہ حال، افطار میں سبزی یا تلخ کریلے کے ساتھ روٹی آدھ روٹی پر کفایت لیکن باوجود اس کے عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ

چوں روز شدے ہر کرا نظر بر جمال مبارک سلطان المشائخ افتادے تصور کردے کہ مستی طافح است وچشمہائے مبارک سرخ بودے از بیداری شب" (سیر الاولیاء ص ۱۲۸)

کہتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کا مشہور شعر

تو شبانہ می نمائی بہ برے کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

اسی لاہوتی کیفیت کی تصویر ہے ۱۲۔

ہیں پچاس ساٹھ سال تک جس کا دسترخوان الوانِ نعمت ہزار ہا ہزار انسانوں کو تقسیم کرتا رہا۔ اس تقسیم سے اس کی کیا نیت تھی، یقیناً اس زمانہ کے غربا تک سلطان المشائخ کے ذریعہ سے وہ نعمتیں پہنچائی گئیں جن کا وہ بیچارے تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، اور کیا معلوم کہ اللہ والوں کے کام کے پیچھے کس قسم کی نیتیں پوشیدہ رہتی ہیں، خیر یہ تو ایک طویل قصہ اور مستقل بحث ہے، مجھے اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود غیر متاہل ہونے کے علاوہ ان عام لوگوں کے جو روزانہ بعد مغرب سلطان المشائخ کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے، جن کی تعداد کبھی کبھی سینکڑوں سے متجاوز ہوجاتی تھی، ان عام لوگوں کے سوا آپ کی خصوصی تربیت اور نگرانی میں مختلف خاندانوں کے بچے پرورش پاتے تھے، آپ ہی ان کے قیام وطعام ولباس وتعلیم اور دیگر ضروریات کے متکفل تھے، ان بچوں میں حضرت شیخ کبیر شکر گنج کے نواسے خواجہ محمدؒ خواجہ موسیٰؒ، خواجہ عزیز الدین، شیخ کمال الدین وغیرہ تھے، جن کے والدین کا انتقال کم عمری ہی میں ہوگیا تھا، اور سلطان المشائخ نے سب کو دلی بلا کر اپنے زیر پرورش فرمالیا تھا، یوں ہی، آپ کے بھانجوں یعنی بہن کے بچوں کا ایک گروہ تھا جن میں خواجہ رفیع الدین ہارون، خواجہ تقی الدین، خواجہ ابوبکر مصلیٰ دار، مولانا قاسم، خواجہ عزیز الدین بن خواجہ ابوبکر مصلیٰ دار اور ان کے سوا بھی بعض دوسرے شریف خاندان کے بچے تھے، جن کا اقامت خانہ سلطان المشائخ کا جماعت خانہ تھا۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا، ان سب کی تعلیم وتربیت بھی حضرت والا کی خاص نگرانی میں ہوتی تھی، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا، اور اس سے حضرت سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق اور شغف کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ہر بچے کو التزاماً سلطان المشائخ نے قرآن مجید حفظ کرایا، خصوصیت کے ساتھ حفظ کے اس کام کو آپ نے مولانا علاء الدین اندپتی کے سپرد کیا تھا، میر خورد نے لکھا ہے

مولانا علاء الدین اندپتی کہ در غایت بزرگی بود وعلوم بسیار وفضائلِ بے شمار داشت،

وحافظ کلام ربانی واقربائے سلطان المشائخ بیشترے ازاں بزرگ حافظ شدند

(سیرالاولیا رص ۳۱۶)

سلطان المشائخ کے چھوٹے بھانجے[۱] تقی الدین نوح جب کبھی حضرت والا کی مجلس میں آجاتے تو لوگوں سے فرماتے۔

[۱] ان کے بڑے بھائی کا نام رفیع الدین ہارون تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ "بواسطہ شفقت سلطان المشائخ حافظ کلام ربانی گشتہ" ان کی ایک خاص خصوصیت میر خورد نے یہ بتائی ہے کہ "در تیر و کمان و سباحت (شناوری) و کشتی ہوسے تمام داشت" لکھا ہے کہ ان کے اس رجحان کو پاکر سلطان المشائخ ان کو اس قسم کے ملاعب سے روکتے نہ تھے جیسا کہ کچھ دن پہلے مسلمانوں میں دستور ہو گیا تھا، لیکن یہ دستور عہد موت کا تھا، زندگی کے دنوں میں سلطان المشائخ جیسی ہستی بجائے روکنے اور زجر و توبیخ کے

"از حال ایں ہنرہائے پسندیدہ کہ شرعاً مشروع ست بہ پرسیدے بلکہ غوامض ایں ہنرہا تلقین فرمودے"

سیرالاولیا رص ۲۰۳

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بزرگوں میں اس قسم کی خود ساختہ سختیاں جن کے پچھلے دنوں مسلمان تربیت کے مسئلہ میں عادی ہو گئے تھے بہت کم تھیں، میر خورد ہی نے لکھا ہے کہ ان کے چچا سید حسین کی نوجوانی کا زمانہ تھا، اس خاص وضع میں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں "در آں آوان جوانی در عین کامرانی رد پاک (رومال) کشیدہ در سربستہ و دستارچہ نازنین بر کتف مبارک انداختہ بطریق جواناں خراماں از در آمد" لیکن نوجوانی کی اس ترنگ کو دیکھ کر جو عمر کا اقتضا ہے، کیا سلطان المشائخ نے ان کو سامنے سے نکلوا دیا۔ لکھا ہے کہ

"دریں حال سلطان المشائخ فرمود کہ سید بیا و بہ نشیں و سعادتے بہ بر"

پھر حسب دستور جس قسم کی باتیں فرمایا کرتے تھے ان سے اور چراغ دہلوی سے جو اس وقت سامنے بیٹھے تھے، کرتے رہے، میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ بزرگوں نے نوجوانوں کو نوجوانی کے حقوق عطا کرنے میں بشرطیکہ حدود شرع سے متجاوز نہ ہوں عموماً مسامحت برتی ہے، اصلاح کا یہی طریقہ مفید تھا، یہی صاحب سید حسین کا ایک زمانہ فیشن کا وہ تھا، کہ صرف پان خوری کی حالت یہ تھی۔

"یک ساعت از تنبول دہن خالی نبودے یعنی متواتر تنبول خوردے اگرچہ یک برگ بدہ تنکہ رسیدے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنبول خوری کی عادت مسلمانوں کو ہندوستان پہنچ کر ابتدائی صدیوں میں پڑ گئی تھی اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج بھی پان کھاتے تھے (ص ۱۹۴) سلطان جی بھی عادی تھے، (ص ۱۴۲) بلکہ آپ نے پان کا نام ہی ابوالیاس رکھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ پان کھانے کے بعد پھر کسی چیز کے کھانے کی امید باقی نہیں رہتی، نمک کا نام آپ کے دسترخوان پر ابوالفتح تھا، دستور تھا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے لوگ نمکدانوں سے ایک انگلی نمک پہلے ضرور چکھ لیتے تھے تب کھانا شروع ہوتا تھا

"یاراں ایں را عزیز دارید کہ ایں نیکو کسے ست"

نگران کی "نیک کسی" کی دلیل میں جو بات ارشاد فرمائی جاتی تھی وہ یہ تھی،

"ایں قران یاد دارد، و ہر شب آدینہ (جمعہ) ختم می کند" (سیر الاولیا[۲۰۱] و فوائد الفواد

سلطان المشائخ کے قرآنی ذوق کی یہ حالت تھی کہ آپ کے دسترخوان کا یہ دستور تھا کہ قبل کھانا شروع کرنے کے قرآن مجید کی کچھ آیتیں خوش الحانی سے کوئی قاری سُناتا، عموماً یہ خدمت شیخ کبیر شکر گنج کے نواسوں حافظ محمد و حافظ موسیٰ کے سپرد تھیں، یہی دونوں بھائی نماز میں بھی عموماً امامت کرتے تھے، آواز میں بلا کا درد تھا، لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے جب قرآن پڑھا جاتا تو مسلسل سلطان المشائخ کی زبانِ مبارک سے "رحمت باد رحمت باد" (ص ۱۹۹) کے الفاظ بے اختیار نکلتے رہتے، آپ نے ان وابستگان دامن کے اندر قرآن کا وہ راسخ مذاق پیدا فرما دیا تھا کہ میر خورد کا بیان ہے کہ ان کے پھوپی زاد بھائی خواجہ عزیز الدین جن کی تعلیم و تربیت بھی سلطان المشائخ نے فرمائی تھی، اور دسترخوان کی قرأۃ جس کا نام ہی "دعا رمائدہ" تھا کبھی کبھی یہ بھی فرمایا کرتے، جیسا کہ قاعدہ تھا کہ سلطان المشائخ کی زیر نگرانی تعلیم پانے والے بچوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا، اُن کو بھی قرآن حفظ تھا میر خورد کی شہادت ہے کہ جب مرض الموت میں خواجہ عزیز الدین بیمار ہوئے تو

"دو سہ روز کہ زحمت (بیماری) بود یک ساعت لب مبارک از تلاوت

کلام اللہ بے کار نماندہ ہمدریں زحمت برحمت پیوست" ص ۱۹۹

واقعہ تو یہ ہے کہ سلطان المشائخ کو قرآن کے ساتھ جو غیر معمولی شغف پیدا ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو اپنے ہر ایک مرید پر حفظ قرآن کے مسئلہ کو لازمی قرار دیدیتے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ کام آسان نہ تھا تاہم آپ کی کوشش یہی تھی کہ جس سے جتنا ممکن ہو، سلوک بالقرآن کے لیے قرآن زبانی یاد کرلے، خیال تو کیجیے حسن علا سنجری جو علاوہ شاعر ہونے کے، ایک بڑے فوجی افسر رہتے تھے، اور اسی فوجی سلسلہ میں ان کو

دیوگیر (دولت آباد) آنا پڑا جہاں ان کا اب مزار ہے، عمران کی کافی ہوچکی تھی، جب شرف بیعت سے سرفراز ہوئے، شاعری کا جنون الگ سر پر مسلّط تھا، لیکن آپ پڑھ چکے ہیں کہ حسن علاء کو حکم تھا کہ شعری ذوق کو کم کر کے قرآنی مذاق کو اپنے اوپر غالب کریں، جب یہ مذاق ان کا غالب ہوگیا، تو پھر ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس معمر سن رسیدہ مرید کو بھی آپ نے حفظ قرآن میں لگا دیا تھا، آپ ان سے دریافت فرماتے رہتے کہ "چہ قدر یاد کردہ" حسن کہتے ہیں کہ اس وقت تک ایک ثلث قرآن یاد کر چکا تھا۔ ثلثے یاد گرفتہ ام" ارشاد ہوا

"دیگرہا اندک اندک یاد گیر و یاد گرفتہ پیشینہ را مکرر می کن" فوائد الفواد۔ ص ۹۳

اور اس سے اس طریق کا بھی پتہ چلتا ہے جو حضرت والا نے سن رسیدہ ہونے کے بعد قرآن کو یاد کیا تھا، یہی واقعہ بھی ہے کہ اگر ایک ایک دو دو آیتیں بھی روزانہ آدمی یاد کر لیا کرے، اور اُن ہی کے معانی کو اپنے اندر چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھے، گھلاتا رہے تو حق تعالیٰ کے اس علم مقدس سے بتدریج سینہ میں جو روشنی پیدا ہوتی ہے، شاید کسی ذریعہ سے ممکن نہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے، آدمی کا دماغ بھی سلجھنے لگتا ہے، قرآن کی جو خاص منطق ہے، ذہن کو اس سے مناسبت ہونی لگتی ہے، ہر بات میں جو واقعہ ہے توازن کو قائم کرتے ہوئے آدمی اس میں غور کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، البتہ وہی بات جس کا صحیح حدیثوں میں بھی ذکر آیا ہے کہ محفوظ حصہ کی اگر نگرانی نہ کی جائے تو وہ فوراً نکل بھی جاتا ہے۔ اس لیے "یاد گرفتہ پیشینہ" کو مسلسل مکرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے حساب کیا ہے کہ اگر "اندک اندک یاد گرفتن" کے اصول کے تحت کوئی روزانہ ایک آیت بھی یاد کر لیا کرے، تو سات سال میں پورا قرآن اس کو محفوظ ہو جائیگا۔ بہر حال کچھ میر حسن ہی کے ساتھ یہ خصوصیت نہ تھی، حضرت والا کے دست گرفتوں میں ایک بڑی جماعت حفاظ کی نظر آتی ہے، بعضوں کا تو عمر بھر یہی پیشہ

رہا کہ وہ قرآن لکھ کر زندگی گذارتے رہے، مولانا فخر الدین مروزی کے ذکر میں پہلے بھی اس کا تذکرہ ہوچکا ہی۔

خود امیر خسرو جو تہجد کی نمازمیں روزانہ سات پارے پڑھتے تھے، ظاہر ہے کہ حفظ کے بغیر یہ ممکن نہ تھا لیکن مجھے اب تک ان کے کامل حافظ ہونے کی سند نہیں ملی ہی، بعض قرائن جن کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہی یہ معلوم ہوتا ہی کہ انہوں نے بلوغ کے بعد ہی اپنے محبوب شیخ کی اتباع میں قرآن یاد کیا تھا، ان کا تو عہدہ ہی شاہی دربار میں مصحف برداری کا تھا، گویا قرآن ہی میں معاش اور معاد دونوں کی فلاح حق تعالیٰ نے ان کی بلند قسمت کے لیے مقدر فرمائی تھی۔ امیر خسرو تہجد کی نمازمیں سات سات پارے پڑھتے تھے، اسی سے خیال گذرتا ہی کہ سلطان المشائخ کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہی کہ چوبیس گھنٹوں میں

چہار صد و پانصد رکعت نماز می گذارد (ص ۱۲۸)

گو صراحتاً اس کا ثبوت تو ابھی دستیاب نہیں ہوا ہی، لیکن خیال گذرتا ہی کہ جس قرآن کو سلطان جی نے یاد کیا تھا، اسی کو

"یادگرفتہ پیشینہ را مکرر کن"

کے اصول کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ان سیکڑوں نفلوں میں روزانہ پڑھ لیا کرتے ہونگے، اس سے نمازوں کے ساتھ ساتھ قرآن کی تازگی کا موقعہ بھی آپ کو مل جاتا ہوگا، واللہ اعلم بالصواب

بہرحال اب کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہی، سلطان المشائخ کے عہد میں دلی قرآن ہی قرآن سے بھر گیا تھا، بڑے بڑے شاہی عہدہ دار شتربان بارگاہ حکومت ہمیں اس زمانہ میں حافظ نظر آتے ہیں، امیر خسرو، حسن علا سنجری آخر یہ کون لوگ ہیں؟ انتہا یہ ہی کہ اس زمانہ میں دلی کے کوتوال (کمشنر پولیس) بھی حافظ تھے، امیر خورد نے

لکھا ہے۔

"مولانا ظہیر الدین کو نواں مندہ کہ حافظ کلام ربانی" (ص ۱۷)

اس عہد کے شاہی ولاۃ وحکام چونکہ زیادہ تر حضرت سلطان المشائخ ہی سے ارادت وبیعت کا تعلق رکھتے تھے، تو کیا تعجب ہے اگر طریقہ چشتیہ کا قرآنی مذاق ان حکام و ارباب مناصب امرا تک بھی متعدی ہو گیا ہو۔

اور یہ ذکر تو ان لوگوں کا تھا جو سلطان المشائخ کے عہد میں تھے، حضرت کے بعد یوں تو آپ کا سلسلہ بیسیوں وسائط اور ذرائع سے پھیلا، لیکن آپ کے خلیفہ اعظم سب جانتے ہیں کہ حضرت مولینا نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کے متعلق تو پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی چیز کے آگے سر جھکانے کے لئے وہ تیار نہیں تھے خود سلطان المشائخ کے زمانہ ہی میں لوگوں نے ان پر بھی الزام لگایا، مشہور بات ہے کہ کسی مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع شروع ہوا، چراغ دہلوی اٹھ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا، فرمایا "خلافِ سنت است" لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ مطلقاً سماع سے آپ کو انکار ہے، یہ اعتراض کیا کہ از سماع منکر شدی واز مشرب پیر برگشتی؟ اخبار الاخیار میں شیخ محدث نے نقل کیا ہے کہ اس وقت حضرت نے فرمایا کہ "دلیل از کتاب وحدیث می باید (ص ۸۲) لوگوں نے یہ خبر سلطان المشائخ تک شکایۃً پہنچائی، لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، جب وہاں سے بھی جواب ملا کہ "راست می گوید"

بہر حال چراغ دہلوی کی زندگی تو اتنی عالمانہ تھی کہ ان پر لوگوں کو خشک ملا ہونے کا شبہ اس وقت بھی تھا، اور شاید اب بھی ہو، لیکن آپ کے خلیفہ اعظم حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ صاحب گلبرگہ نے تو صاف لفظوں میں اس مسلک کی تصریح فرمائی ہے، جو طریقہ چشت کی خصوصیت ہے، مولانا آزاد نے اپنی کتاب روضۃ الاولیاء میں حضرت

والا کا یہ فقرہ نقل کیا ہی ۔

فتح کار من بیش تر از تلاوت قرآن و سماع بود (روضہ ص ۲۴)

یہ بھی اسی کتاب میں آپ ہی کے متعلق لکھا ہی کہ حضرت سیدؒ کا معمول تھا کہ

وقت چاشت و بعد از نماز ظہر درس می گفت و بیش تر درس در علم تفسیر و حدیث

و سلوک می گفت و گاہی علم کلام" (ص ۲۳)

قرآن سے آپ کا کتنا گہرا تعلق تھا اس اعتراف کے علاوہ کہ ان کا فتح کار ہی قرآن کی تلاوت سے اور ان اشعار سے ہوا جن کے متعلق جیسا کہ آئندہ ان شاءاللہ معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت نظم کی صورت میں قرآنی آیات کے وہ ترجمے ہیں، ان ہی ترجموں کو نغمہ کے ساتھ سُننا، یہی ان بزرگوں کا سماع تھا۔ اسی لیے میں "قرآن و سماع" کی ترکیب میں معطوف کو معطوف علیہ سے کوئی الگ چیز نہیں قرار دیتا، اور اس پر تھوڑی بہت بحث بقدر ضرورت آئندہ بھی شاید آئے۔ بہرحال اس اعتراف کے سوا، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز نے ایک

(حاشیہ صفحہ ۱۶۵) مولانا غلام علی آزاد جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکن ہی میں گذرا ہی، حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دکن کے عوام جن میں ہندو اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہی ان کی عقیدتمندیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو عجیب باتیں نقل کی ہیں، ایک تو یہ ہی کہ شخصے بہ یکے از اہل دکن پرسید کہ رسول اللہ بزرگ تر است یا سید محمد گیسو دراز۔ جواب داد کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پیغمبر خدا است اما سبحان اللہ مخدوم سید محمد گیسو دراز چیزے دیگرست۔ ص ۲۳۔ دوسرا لطیفہ یہ ہی کہ گلبرگہ کے نواح میں کوئی تالاب ہی از حضرت سید نقل می کنند کہ فرمود کسے کہ دریں تالاب غسل کند سعید می شود یعنی نیک بخت و از گناہاں پاک می گردد" بہرحال روایت جیسی کچھ ہو، لطیفہ میر صاحب نے یہ درج کیا ہی کہ سعید کے لفظ کو بگاڑ کر عوام سادہ لوح گویند کہ حضرت سید فرمود کسے کہ دریں تالاب غسل می کند سید می شود و بہ نیت تحصیل سیادت غسلہا بجامی آرند ص ۲۴۔ اب بھی لوگوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہی یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ دکن میں عموماً ایک عجیب بات یہ پائی جاتی ہی کہ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین طبقہ جس کا کام عموماً خدمتگذاری کرنا جھٹکے ہنکانا ہی ان کی اکثریت سے جب پوچھیے تو اپنے نام کے ساتھ سید کے لفظ کا اضافہ کرتے ہیں، حالانکہ اعلیٰ طبقوں میں بہت زیادہ احتیاط پائی جاتی ہی مشکل ہی سے ان میں کوئی اپنے کو سید کہتا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہی اس طبقہ کی سیادت غالباً اسی تالاب کی کرامت کا نتیجہ ہی، میر صاحب نے یہ بھی لکھا ہی حسن علا سنجری جو خلد آباد میں مدفون ہیں لوگ حسن شیر

ہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی دو دو تفسیریں لکھ کر اپنے اس خاندانی مذاق کا ثبوت پیش کیا ہے جو اکابر چشت سے منتقل ہو کر ان میں پیدا ہوا تھا، مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"تصانیف حضرت سید ملتقط تفسیر قرآن بطور سلوک و تفسیرے دیگر بطریق کشاف پنج جزو" (ص ۲۴)

دکن ہی میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، سلطان المشائخ کے متوسلین و خلفا میں ایک حضرت برہان الدین غریب قدس سرہ صاحب خلد آباد ہیں، ان کے براہ راست خلیفہ اور جانشین مولانا زین الدین شیرازی کے متعلق مولانا غلام علی نے جس قرآنی ذوق کی روداد لکھی ہے، وہ عجیب و غریب ہے، لکھا ہے کہ محمد تغلق نے دلی اُجاڑ کر دکن میں دولت آباد کو بسایا، لیکن جب دولت آباد میں اسماعیل مخ نے بغاوت کی اور سلطان اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے خود دولت آباد آیا، اپنے ساتھ دولت آباد سے لوگوں کو پھر دلی لے گیا تو ان میں مولانا زین الدین بھی تھے۔ دلی میں آپ کو چھوڑ کر خود سندھ چلا گیا، اس زمانہ میں مولانا زین الدین کا مشغلہ دلی میں یہ تھا جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے۔

"دو ماہ شد کہ ہر روز یک ختم کلام اللہ بر روح پر فتوح سلطان المشائخ می کنم"[1]

اس واقعہ کے بعد ہی بادشاہ جو سندھ (ٹھٹھہ) میں تھا، خدا جانے کیا احساس اس کو ہوا اس نے مولانا زین الدین کے متعلق فرمان بھیجا کہ وہ جہاں رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں، لیکن ابھی وہ دلی سے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادشاہ کے مرنے کی

---

[1] اب کوئی اسے مانے یا نہ مانے لیکن سلطان المشائخ کی روح کو مولانا زین الدین کی اس قرآن خوانی سے کتنا سکون حاصل ہوا تھا، اس کے متعلق مولانا آزاد ہی کی کتاب میں شیخ زین الدین شیرازی کے حوالہ سے یہ بیان درج ہے کہ جن دنوں میں اس طرح قرآن خوانی میں ان کے روضہ پر مصروف تھا۔ ایک دن بگوش سر یہ شعر میں نے سنا

بیا سائے ز حسن خود کہ جانم از تو آسودست ۔۔۔ تو حسن من برافزودی خدا حسنت بیفزائد

یعنی تم اپنے حسن کے ساتھ آسودہ رہو، کہ میری روح کو تم سے آسودگی حاصل ہوئی ہے، تم نے میرے حسن کو بڑھایا خدا تمہارے حسن کو بڑھائے مولانا زین الدین کے الفاظ یہ ہیں:۔ "این بیت از مرقد مطہر سلطان المشائخ استماع نمودم" ص ۲۸

خبر سندھ سے آئی اور اسی کے ساتھ فیروز تغلق بھی دلی پہنچ گیا۔ اُس نے مولانا پر اصرار کیا کہ دلی ہی میں قیام کریں، لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا۔

"مرا بگذار بہ آستانہ خواجہ خود یعنی برہان بمیرم"

فیروز نے زیادہ اصرار مناسب نہ خیال کیا، اور سامان زاد راہ نیز بہت کچھ دے دلا کر اس نے دلی سے رخصت کر دیا، لیکن آپ کو خیال ہوا کہ دکن جانے سے پہلے اپنے دادا پیر بابا فرید شکر گنج کی قبر شریف پر فاتحہ پڑھ آؤں، اس لیے اجودھن روانہ ہو گئے۔ اجودھن میں ان کا قیام جس شان سے رہا ہے اسی کا تذکرہ مقصود ہے مولانا غلام علی آزاد کے الفاظ یہ ہیں:۔

"در گنبد شیخ فرید الدین در بستہ مشغول ماند غیر از اوقات نماز بر نمی آمد و شبانہ روز چہار قرآن ختم می کرد، در عرصہ سہ روز مجموع دوازدہ قرآن ختم کرد"

وہاں سے رخصت ہو کر دکن کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں اجمیر[1] میں ٹھہرے اور وہاں

---

[1] اجمیر شریف کے بعد مولانا زین الدین خلد آباد پہنچ گئے، یہاں اس زمانہ میں محمد شاہ بہمنی کی حکومت تھی، لکھا ہے کہ چونکہ شراب نوشی کا عادی تھا اس لیے بھی اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی، اس لیے باوجود سخت آرزو کے آپ نے اس کی ملاقات سے انکار کر دیا، اور غائبانہ طور پر اُس نے چاہا کہ اپنی تحریری بیعت بھیج دیں، اس سے بھی آپ نے انکار کیا، کہلا بھیجا۔

"سزاوار ریاست خلق کسے ست کہ در حفظ شعار ملت محمدی کوشیدہ سرا و علانیۃً پیرامون شاہی نہ گردد"

سلطان بار بار آدمی شیخ کے پاس بھیجتا رہا آخر میں قاضی القضاۃ کو بھیجا کہ بیعت نامہ پر شیخ کے دستخط کرا لاؤ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ قصہ کہلا بھیجا کہ کسی کافر بادشاہ نے ایک مسلمان عالم و سید و ہیجڑے کو گرفتار کر کے بت کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، عالم اور سید دونوں نے اس کو اکراہ قرار دے کر بہ ظاہر سجدہ کی صورت بنائی۔ جب ہیجڑے مخنث سے کہا گیا، تو اس بیچارے نے کہا "تمامی عمر من در ارتکاب ناشائستہ گذشت" بولا کہ بھئی نہیں عالم ہوں نہ سید سرمایہ من لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ست اگر ایں ہم ز دست دہم فردا حال من چہ باشد اگر سر از تن جدا کنند من بت را سجدہ کردنی نیستم" شیخ زین الدین نے اس قصہ کو بیان کر کے فرمایا کہ من مخنث بلکہ بدتر از مخنث اگر مجلس حاضر شوم یا بخلافت تو اقرار نمائم" بادشاہ پھر بھی جبر و اکراہ کرتا رہا، مگر آخر میں خدا نے اُس کے دل میں شیخ کی ہیبت ڈال دی اور پشیمانی کا (بقیہ بر صفحہ ۱۶۵)

بھی وہی "یک ہفتہ در روضہ مقدسہ خلوت گزید و روزے چہار ختم مجموع بست و ہشت قرآن ختم کرد" چونکہ مولانا زین الدین نے قرآن حفظ فرما لیا تھا، اس لیے ان کو پڑھنے میں آسانی ضرور ہوتی ہوگی لیکن روزانہ چار ختم کرنا پھر بھی میں نہیں سمجھتا کہ اسے معمولی بات سمجھی جائے۔ اب لوگوں کو کیا کہیے، طریقہ علیہ چشتیہ کی ایک دوسری شاخ صابریہ ہے، صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے صاحبزادے مولانا رکن الدین سے مناقب العارفین میں یہ روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے:-

"پدر بزرگ من از اولیا بودند، تلاوت قرآن وظیفہ داشتند و مسائل شرعی ہمیشہ مطالعہ کردند۔ ص ۳۵۷۔

بتایا جائے کہ چشتیہ طریقہ کا اب کونسا سلسلہ باقی رہ گیا جس کا قرآن سے وہ تعلق ثابت نہیں ہوتا جس کا میں دعویٰ کرتا چلا آرہا ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہو اب اسے کوئی خوش اعتقادی قرار دے یا جو بات بھی سمجھی جائے مختلف قرائن و قیاسات منتشر معلومات نے مجھ میں یہ حسنِ ظن پیدا کردیا ہے کہ حفظِ قرآن کی دولت ہندوستان میں جو عام ہے، اتنی عام کہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی ملک میں حافظوں کی اتنی تعداد پائی جاتی ہو، جتنی بوقت واحد ہندوستان میں نکل سکتی ہے، ہوسکتا ہے کہ ان میں کچھ دوسرے اسباب کو بھی دخل ہو، لیکن ایک بڑی وجہ اس کی میرے نزدیک خواجگانِ چشت ہی کا وہ مذاق ہے جو حفظ قرآن کے متعلق ہم ان میں پاتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) خط لکھا، حضرت نے کہلا بھیجا کہ سلطان محمد شاہ غازی شریعت محمدی کے مطابق شراب کی دکانیں ممالک محروسہ میں بند کرادے اور اپنے علماء و قضاۃ و صدور کو حکم دیں کو لوگوں کو دین محمدی پر قائم کریں تو زین الدین فقیر دوست ترکسے نخواہد بود" "غازی" کے خطاب پر سلطان بہت خوش ہوا، اور تمام ملک سے یک قلم شراب نوشی کو حکماً بند کرادیا۔ ملک میں ڈاکہ اور چوری کے واردات بکثرت ہو رہے تھے۔ سب کا انسداد سختی سے کیا لکھا ہے کہ چھ سات مہینوں میں اتنے چور ڈاکو ٹھگ مارے گئے کہ بیس ہزار سر گلبرگہ میں جمع ہوگئے اور شہر کے کنارے ان سروں سے ایک چبوترہ بنایا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ اور شیخ میں

اِن مثالی اور جزئی شہادتوں کے سوا جن کا ایک ذخیرہ آپ کے سامنے پیش ہوچکا ہی، ایک عجیب و غریب شہادت اس باب میں ایک غیر چشتی بزرگ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ[ا] مُنیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہی، آپ کے ملفوظات "معدن المعانی" نامی میں براہ راست حضرت والا کا ایک بیان درج ہی، میں بجنسہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں

مخدوم فرمود کہ من از شیخ زادہ شنیدہ ام کہ می گفت پدر مرا ہزار ختم قرآن بودستہ صد در خارج صلوٰۃ و ہفت صد در صلوٰۃ۔

مخدوم نے فرمایا کہ میں نے شیخ زادہ سے سنا ہی کہ وہ کہتے تھے میرے والد نے قرآن مجید کو ہزار دفعہ ختم کیا تھا، تین سو تو نماز سے باہر اور سات سو ختم نماز کے اندر

"معدن المعانی" ہی کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہی کہ "شیخ زادہ" کے لفظ سے مراد خاندان

[ا] آپ کا ذکر پہلے بھی مختلف سلسلہ میں آیا ہی بقول شیخ محدث از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند (اخبار ص ۱۱۷)، لیکن یہاں اتنی بات بتانی ہی کہ آپ طریقہ سہروردیہ کی ایک شاخ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ یاد رکھنے کی چیز ہی کہ حضرت والا کے پیر طریقت شیخ نجیب الدین فردوسی تھے اور ان کے پیر شیخ رکن الدین فردوسی۔ شیخ رکن الدین حضرت نظام الدین اولیاء کے معاصر ہیں، کتابوں سے معلوم ہوتا ہی کہ قطب الدین مبارک خلجی جب سلطان المشائخ سے برسر پرخاش ہوا تو اُس نے حضرت شیخ رکن الدین کو اُن کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، ظاہر ہے کہ بزرگوں میں تو کیا مقابلہ ہوتا لیکن عام مریدوں کو شیخ رکن الدین کے طریقہ چشتیہ سے ایک گونہ رقابت پیدا ہو گئی تھی، اسی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہی جو آپ کو شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیری کے ملفوظات میں نظر آئیگا، کہ وہ سلطان جی کو اپنی مجلس میں مختلف طریقہ سے ستایش فرماتے، فردوسیوں میں خواہ مخواہ جو ایک غلط خیال پیدا ہو گیا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو مٹانا چاہتے تھے، تعجب اس پر ہی کہ حضرت شیخ شرف الدین کو جن لوگوں نے بہار کے قیام پر مجبور کیا ان میں زیادہ تر حضرت نظام الدین اولیاء ہی کے خلفاء ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ عوام میں اگر کچھ لوگوں میں رقابت ان مختلف سلاسل و طرق کے متعلق پیدا بھی ہو جاتی تھی تو اکابر ہمیشہ اس کے ازالہ کے درپے ہوتے تھے کہ سارے راستے اللہ کی طرف لیجاتے ہیں، پھر بھی مذکورۂ بالا شہادت چونکہ کسی چشتی کی نہیں ہی اس لیے اس کو زیادہ وقعت دینی چاہیے ۱۲۔

چشت کے ایک بزرگ ہیں، ملفوظات میں متعدد جگہ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، نام کا تو ان کے پتہ نہ چل سکا، لیکن شیخ زادہ چشتی سلمہ اللہ تعالیٰ کے عنوان سے ان کا ذکر مختلف مقامات میں پایا جاتا ہے۔ ملفوظات کے ص ۲۴۹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے یہ آخر میں بہار پہنچے، اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ سے وہیں ملاقات ہوئی، یہ بھی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان ہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے

"من چندیں زبانہائے می دانستم از ترکی و فارسی و عربی"

بہر حال کچھ بھی ہو، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ان ہی شیخ زادہ چشتی سے ان کے والد کے طریقہ ختم کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

"و ہمہ خواجگان چشت را رحمہم اللہ ہم بریں منوال است" ص ۱۸۶

اس کے سوا اور کیا مطلب اس کا لیا جا سکتا ہے کہ شیخ زادہ چشتی کے پدر بزرگوار کا جو دستور ختم قرآن کے متعلق تھا، وہی دستور "ہمہ خواجگان چشت" میں مروج تھا، اور اسی تنبیہات کا پیش کرنا میرا مقصود تھا۔

بلکہ اسی کتاب کے دوسرے مقام میں ایک اور دلچسپ چیز ملتی ہے، جامع ملفوظ ارقام فرماتے ہیں کہ

"بندگی مخدوم بحاضران مجلس روئے مبارک آورد و پرسید کہ کسے را ایں آیت یاد است کہ در کدام سورہ ست، کسے را یاد نہ بود"

حضرت نے اس وقت عجیب حسرت کے لہجہ میں فرمایا کہ "اکنوں مرا یاد می باید یاد نیست"

پھر اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا،

"در ایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد کرانیدند چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات و جز آں کتابہا، مفتاح اللغات جزوے بستے خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند"

اس سے کم از کم مجھے تو ہندوستان کی آٹھویں صدی کے مکتبی نصاب کے بعض اجزار کا سُراغ ملتا ہی، مصادر سے مراد غالباً کوئی اس قسم کی کتاب ہی جسکو مکاتب میں آج کل بھی "آمدنامہ" یا دکن میں جسے "آمدن نامہ" کہتے ہیں، صفوۃ المصادر یا "مصدر فیوض" وغیرہ مختلف ناموں سے لوگوں نے فارسی کے مصادر ایک جگہ جمع کر دیے ہیں، بچوں کو ابتدا میں وہی کتاب یاد کرائی جاتی ہی، اور کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ زندگی بھر بچپن کی یہ محنت لوگوں کو کام آتی ہی، یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانہ میں علاوہ مصادر کے لغت کی کوئی کتاب بھی زبانی یاد کراتے تھے جس کا اب رواج باقی نہیں رہا" ہر بار یاد تمام شنیدند" سے آموختہ سُننے کا جو قاعدہ تھا اُس کا بھی پتہ چلتا ہی، خیر یہ تو ایک ضمنی بات ہی، حضرت نے مندرجۂ بالا فقرہ کو ختم کر کے پھر ارشاد فرمایا۔

"بایست بجائے اس قرآن یاد می کرانیدند" ص۳۳
اے کاش!

اور اس سے میرے اس خیال کی توثیق ہوتی ہی کہ حفظ قرآن کا مذاق چشتی طریقہ سے کوئی خاص خصوصیت رکھتا ہی، اور آئندہ ملک میں اس کا جو عام مذاق پھیل گیا، وہ ان ہی بزرگوں کے انفاس طیبہ کی برکت ہی، اس کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ایک اور جزء کا اضافہ آپ نے فرمایا، مطلب یہ ہی کہ حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ جو عام طور پر مخدوم الملک کے نام سے کم از کم صوبۂ بہار میں مشہور ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم سنارگاؤں (بنگال) میں ایک عالم علامہ شرف الدین توامہ سے ہوئی تھی، جو دلّی سے بنگال بھیجے گئے تھے کہتے ہیں کہ جہاں پر آج ڈھاکہ شہر کی آبادی ہی، اسی کے قریب کسی جگہ یہ سنارگاؤں آباد تھا حفظ قرآن کا ذکر جب چھڑا تو آپ کو اپنے ان ہی اُستاد شرف الدین توامہ کے حلقۂ درس کا قصّہ یاد آگیا، فرمانے لگے:

درسنارگاؤں برادر مولانا یعنی (شرف الدین توامہ) زین الدین نام داشتند او را قرآن نیکو یاد بود، در وقت سبق خواندن، اگر در سبق کسے آیتے برائے تمسک حکمے آمدے

درآں محل مولانا شرف الدین توامہ محتاج می شدند کہ درکدام سورہ است[1] و مولانا زین الدین نشستہ بودے دریافتے کہ مولانا تتبع می کند ایں آیت درکدام سورہ است"

مخدوم الملک فرماتے ہیں کہ مولانا کے بھائی زین الدین ایسے موقعہ پر

"برائے طیبت و حرکت زمانے خاموش ماندے و دم نزدے و یاراں را چشمک (خوش مزاجی) دادے کہ اکنوں کہ خوار گفت"

گویا سارا مجمع ایسے موقعہ پر اپنے عجز کے اعتراف پر مجبور تھا، فرماتے ہیں کہ تب

"مولانا شرف الدین توامہ روئے مبارک سوئے او می آوردند و می گفتند کہ بس کنید اکنوں بگوئید کہ درکدام سورہ است"

جب مولانا بھائی کو اس لہجہ میں حکم دیتے تب "گفتے کہ درفلاں سورت است"

میری غرض اس تفصیل کے نقل کرنے سے ایک تو یہ ہے کہ کچھ اس زمانہ کے درس و تدریس کے طریقہ کا پتہ اس بیان سے چلتا ہے اور دوسری بات وہی ہے کہ حفظ قرآن کے ساتھ طریقۂ چشت کے بزرگوں کو جو وابستگی تھی، ان واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کوئی خصوصی مذاق تھا، آج ان بزرگوں کو جس نظر سے بھی دیکھا جاتا ہو، جو باتیں بھی ان کی طرف منسوب کی جاتی ہوں لیکن اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ اسلام و ایمان کی روشنی اس کفرستان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پھیلانے میں جن بزرگوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے، وہ

---

[1] اس موقع پر حضرت الاستاذ الامام مولنٰا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کا خیال آتا ہے، ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم ازکم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی، ہزارہا ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے، جس کتاب پر ایک دفعہ نظر پڑ گئی گویا ان کے حافظہ کی الماری میں بند ہو جاتی تھی، جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رُخ کرکے دریافت فرماتے "پوری آیت کیا ہے؟" فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا، پھر یہ کیا بات ہے؟ جواب میں فرمایا کہ قسمت! بخت، واللہ اعلم کیا بات تھی ۱۲

خانوادۂ چشت ہی کے اکابر ہیں، اسلام کی جڑیں جب اس ملک میں مضبوط ہوگئیں، اس وقت تو یقیناً اوروں کو بھی یہاں کام کرنے کا موقعہ ملا، اور بڑی ناشکری ہوگی، اگر دوسرے طرق وسلاسل کے بزرگوں کی عظیم الشان خدمات اور قربانیوں کو بھلا دیا جائے۔

قادریہ، سہروردیہ اور آخر میں جب مغل آئے تو ان کے بعد نقشبندیہ سلسلہ کے جان فروشوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے پرچم کو سربلند رکھنے میں جو مجاہدات کیے ہیں یقیناً وہ بڑے قیمتی ہیں، علی الخصوص عہد اکبری کے فتنۂ ایمان سوز کے مقابلہ میں سرہند کے فقیر بے نوا نے جو کام کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہماری پچھلی نسلیں بحمداللہ اسی جہادِ اکبر کی بدولت آج اسلام صحیح، اور ایمان واقعی سے قریب ہیں، ورنہ اکبری عہد میں اسلام کو مسخ کرکے جس خود ساختہ نئے قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ اگر نام کے ہم مسلمان باقی بھی رہتے، تو کیا واقعی ہمارا اسلام وہ اسلام ہوتا جو اللہ کے آخری رسول علیہ السلام نے ہمیں سونپا ہے۔

لیکن گفتگو آخر میں نہیں اول کار میں ہو رہی ہے، اور اسی لیے ذرا درازنفسی بلکہ تلخ نوائی پر مجھے مجبور ہونا پڑا کہ بعض خاص موثرات وعوامل جن میں بڑا حصہ مغربی دسیسہ . . . کاریوں کا بھی ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ بزرگانِ چشت کی جانب سے قلوب میں عام سرد مہری بڑھتی جا رہی ہے، ان کے کارناموں کی اہمیت گھٹا کر لوگ شدید قسم کی محسن کشی کا ارتکاب کر رہے ہیں، ان بزرگوں کے کام تو کام بتدریج ناموں تک کے بھلانے کی غیر شعوری کوششیں ہو رہی ہیں، ارادہ تو زمانہ سے تھا، اور جو کچھ اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں کہا ہے، لیکن ہندوستان کے تعلیمی نظام کے سلسلہ میں چونکہ ان بزرگوں کا ذکر ناگزیر تھا جن کے دینی اور روحانی دباؤ کے نیچے اس ملک کے خواص و عوام صدیوں دبے رہے ہیں، اس لیے صرف ایک پہلو یعنی ان کا قرآن سے جو تعلق تھا، محض اس کے متعلق ذرا طویل گفتگو سے مجھے کام لینا پڑا، ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے

مجھ پر اپنے موضوع سے ہٹ جانے کا الزام بھی قائم کیا جائے لیکن ہر لکھنے والا اپنے لکھنے کی ایک غرض سامنے رکھتا ہے، مجھے نہ ریسرچ کرنا ہے، نہ اپنی تحقیق کی داد لینی ہے، اپنا ایک فقیرانہ خیال تعلیم کے متعلق جو ہے، جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے اُسے بیان کر رہا ہوں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا خواجگانِ چشت کے متعلق مختلف دائروں میں چونکہ طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور اب وہ بتدریج اتنی گہری ہوتی چلی جارہی ہیں کہ تفصیل سے اگر کام نہ لیا جاتا اور چند سرسری حوالوں کو دے کر گذر جاتا، تو اسے میری ایک نری خوش اعتقادی کے سوا شاید اور کچھ نہ قرار دیا جاتا بلکہ اس حملہ سے تو اب بھی اپنے آپ کو میں محفوظ و مصئون نہیں پاتا، مگر جو واقعات آپ کے سامنے معتبر حوالوں سے پیش کیے گئے ہیں، ان کے بعد اب بھی کیا یہ صرف میری خوش اعتقادی" ہی باقی رہتی ہے۔

کتنا بڑا ظلم توڑا گیا کہ جن لوگوں نے اس ملک میں قرآن کو پھیلایا، اسی کو اپنے طریقہ کا املاک کار قرار دیا، بے دیکھے، بے پڑھے محض افواہی روایات سنے سنائے قصوں، اسلاف کی راہ چھوڑنے والے اخلاف کے غلط نمونوں کو دیکھ کر آج یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ چشتی طریق کے بزرگوں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ اسلام جیسے متین اور سنجیدہ باوقار دین میں اُنہوں نے طبلہ اور سارنگی کو داخل کر دیا، یہ الفاظ ہیں جو میرے سنے ہوئے ہیں، اور اسی زمانہ سے دماغ گھول رہا تھا، قلم جب ہاتھ میں آیا تو اختصار پر صبر نہ کر سکا، افسوس ہے کہ بات بہت طویل ہو چکی ورنہ اس "چنگ و چغانہ" کے قصہ پر بھی تفصیلی گفتگو ہو سکتی تھی جس کا الزام ہم چشتیوں کے اکابر و اسلاف پر بے دردی کے ساتھ لگایا جارہا ہے،

کیسی عجیب بات ہے، اتنے معتبر ذریعہ سے جس سے زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسن علا سنجری براہِ راست حضرت سلطان المشائخؒ سے راوی ہیں کہ ایک دن آپ نے اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے، یعنی امام کو جب نماز میں سہو ہو جائے تو یاد دلانے کا طریقہ جیسا کہ فقہ کا مشہور مسئلہ یہ ہے کہ اگر مرد یاد دلانا چاہتا ہو تو چاہیے کہ وہ "سبحان اللہ" کہے،

لیکن یاد دلانے والی اگر عورت ہو تو مسئلہ یہ ہو کہ بجائے زبان کے وہ تصفیق سے کام لے یعنی بجائے سبحان اللہ کہنے کے "دستک" سے کام لے، مگر فقہ کا مسئلہ یہ ہو کہ دستک کا جو عام طریقہ ہو وہ صورت اختیار نہ کرے، مطلب یہ ہو کہ "کف دست برکف دست نزند" سلطان المشائخ نے اس کے بعد اس امتناعی حکم کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "آں بلہومی ماند" یعنی ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ جوڑ کر پیٹنے میں ایک قسم کے کھیل اور لہو کی صورت پیدا ہو جاتی ہو، اسی لیے فقہا نے لکھا ہو کہ بجائے اس کے "پشت دست برکف دست زند" ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پٹکے، گویا اس شکل میں لہو اور کھیل تماشے والی تالیوں سے یہ صورت جدا ہو جاتی ہو، میر حسن کا اس کے بعد بیان ہو کہ سلطان المشائخ نے اس فقہی مسئلہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ

"تا این غایت از ملاہی (کھیل تماشے) و امثال آں احتراز آمدہ ست، پس در سماع بطریق اولی کہ ازیں بابت نہ باشد"

آگے اپنے مقصد مبارک کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں

"یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است، در منع مزامیر (باجہ وغیرہ) بطریق اولیٰ[1]"

یہ تھا خیال مزامیر و چنگ و چغانہ، دف و نے میں، طریقۂ چشتیہ کے ایک معمار اعظم کا، وہی جسے آج اس مسئلہ میں سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہو، اللہ اللہ جس کے نزدیک ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر پٹک کر تالی کی صورت بنانی بھی ناجائز ہو، ہمیں باور کرایا جاتا ہو کہ اس کی مجلسِ سماع میں ڈھول اور طبلے ٹھنکتے تھے، ستار اور سارنگی، بانسری اور منجیرا بجایا جاتا تھا، ان ہی حسن علا سنجری نے یہ بھی نقل کیا ہو کہ حضرت والا سے کسی نے آکر عرض کیا کہ آج فلاں مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع سُنا جا رہا تھا، سُنتے کے ساتھ ہی حضرت کا چہرہ بدل گیا اور فرمانے لگے "من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نہ باشد"

---

[1] اصل یہ ہو کہ ایران و خراسان سے ہندوستان میں ایک فرقہ قلندروں کا بھی آدھمکا تھا جو ٹاٹ پہنے، چار ابرو کا صفایا کیے اِدھر اُدھر مارا پھرتا تھا، ان کو حیدریان بھی کہتے تھے حیدر کوئی ان کے مرشدوں میں تھے، یہ فرقہ بھنگ بھی پیتا تھا، بے قید تھا، ڈھول ڈھکے میں رہنا ان کی عام عادت تھی، مشائخ چشت نے ہمیشہ ان کو بُری نظر سے دیکھا ہو ۱۲۔

آپ دیکھ رہے ہیں، مزامیر کو جو محرمات قرار دے رہا ہو، کیا ایک لمحہ کے لیے کوئی تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود ان محرمات میں مبتلا تھے، امیر حسن نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

"دریں باب بسیار غلو می فرمود" فوائد ص ۹۵

میں اس وقت مزامیر کے مسئلہ کو نہیں بیان کر رہا ہوں، بلکہ صرف اس ظلم کو دکھانا چاہتا ہوں جو مشائخ چشت کے ساتھ روا رکھا گیا ہے آپ کو بجائے خود اختیار ہے، جو چاہے کیجیے، اور جس قسم کا مسلک اپنے اجتہاد سے یا کسی مجتہد کے اجتہاد سے اختیار کیجیے، لیکن خدارا جھوٹ تو نہ بولیے، جس سلسلہ کے اساطین کا مزامیر کے باب میں اتنا غلو ہو، اسی سلسلہ کی آڑ لے کر تو ان چیزوں کو جائز نہ قرار دیجیے، امیر علا حسن ہی نے ایک دوسرے موقعہ پر لکھا ہے کہ کسی نے حضرت والا سے یہ عرض کیا کہ مزامیر کے ساتھ جو لوگ سماع سُن رہے تھے، ان سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کیا حرکت کی تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ "ماچناں در سماع مستغرق بودیم کہ ندانستیم کہ ایں جا مزامیر ہست یا نہ"

امیر حسن کہتے ہیں کہ "خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چوں آں سخن بشنید فرمود کہ ایں جواب ہم چیزے نیست" صرف یہی نہیں کہ "چیزے نیست" بلکہ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ "ایں سخن در جملہ معصیتہا بباید نوشت" ص ۲۲۷ یعنی ایک گناہ تو مزامیر ہی میں مبتلا ہونے کا تھا اور اس قسم کی لغو توجیہ دوسرا گناہ ہوا، جو سب لکھا جائیگا، یہی میں بھی عرض کر رہا ہوں کہ مزامیر کا سُننا نہ سُننا یہ الگ مسئلہ ہوا، لیکن اس کو سُننا بھی، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا کہ مشائخ چشت کا یہ طریقہ ہے، کیا اپنے گناہ میں مزید گناہ کا اضافہ نہیں ہے، یہ خوب توجیہ ہوئی کہ "ہمیں مزامیر کے ہونے یا نہ ہونے کا پتہ نہ چلا" کیا شراب اس لیے حلال ہو جائیگی کہ پینے والے یہ کہیں کہ ہمیں پینے کے وقت پتہ نہیں چلتا کہ شراب پی رہا ہوں، یا شربت پی رہا ہوں، سلطان المشائخ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا جیسا کہ اسی مجلس کے ملفوظات کے شروع میں امیر حسن نے نقل کیا ہے کہ

"خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود، چیزے کہ حرام ست بحکم کسے حلال نہ شود، و چیزے کہ حلال ست بحکم کسے حرام نشود" ص ۲۲۷

اور حقیقت یہ ہے کہ ایک مزامیر ہی کا مسئلہ کیا، بلکہ ان لوگوں کو جو حضرت والا سے دینی عقیدت رکھتے ہیں، ان کو طریقہ چشتیہ کا یہ کلیہ یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت نے جس چیز کو حرام کیا ہے، کسی امتی کو خواہ وہ کوئی ہوں، صحابی ہوں یا مجتہد ہوں، امام ہوں یا ولی ہوں کسی کو اختیار نہیں ہے کہ اُسے حلال ٹھہرائے، اور جو چیزیں حلال ہیں، کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ اُسے وہ حرام کرے، نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی، شریعت اُسی دن کامل ہو چکی جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" مسلمانوں کے سپرد کر کے رفیق اعلیٰ تشریف لے گئے۔ بالفرض اگر کسی امتی کی طرف ایسی بات کسی نے منسوب بھی کی ہو تو ہم یا اس انتساب ہی کو غلط ٹھہرائیںگے، اگر اس کا انتساب کسی ایسے بزرگ کی طرف کیا گیا ہے جس کی امانت و دیانت، اخلاص و للّٰہیت پر طبقۃً بعد طبقۃٍ مسلمانوں نے اتفاق کیا ہے، یا اس کی تاویل اگر ممکن ہوگی تو کی جائیگی، اور ان باتوں کا بھی امکان نہ ہو تو یہی سمجھا جائیگا کہ ان سے غلطی ہوئی، کیونکہ مسلمان بہر حال مسئول اسی شریعت کا ہے جس کی تعمیل کا مطالبہ حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کیا ہے، قیامت کے دن شریعت کے کسی مسئلہ کی خلاف ورزی کے متعلق یہ جواب قطعاً قابل شنوائی نہیں ہوگا، کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کا یہ طرز عمل یا قول تھا، اب کوئی نبوت نہیں کر سکتا، خدا کی جدید رسالت اب قیامت تک کوئی نہیں لا سکتا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی مرضی کی یافت کا دعویٰ کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے ختم نبوت کی تکذیب ہے، کیا تماشا ہے لوگ کچھ الفاظ بولتے ہیں، اور معنی سے بے تعلق ہو کر بولتے ہیں، گر سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ سمجھ رہے ہیں، کہا جاتا ہے کہ فلاں مسئلہ شریعت کے رو سے، درست

نہ ہو، لیکن طریقت میں اس کی اجازت ہی حالانکہ ان دیوانوں کو یہی معلوم نہیں کہ طریقت سے مراد کیا ہی، کیا محمدؐ کی نبوت کے سوا ان کے لائے ہوئے قرآن کے سوا وہ کوئی اور چیز ہی، طریقت کا مادہ طریق ہی یعنی شریعت کی راہ پر جو عملاً چلنے لگتا ہی، اسی کے متعلق کہا جاتا ہی، کہ وہ طریق اور راہ پر لگ گیا، شریعت تو ان علوم کے مجموعہ کا نام ہی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں کو عطا کیا ہی، ان ہی علوم کے مطابق عمل کرنے کا نام طریقت ہی۔

آخر یہ لفظ بولنے والوں کا تو بنایا ہوا نہیں ہی، یہ صوفیہ کی اصطلاح ہی، ان ہی سے پوچھنا تھا کہ آپ کی کیا مراد ہی؟ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے مزامیر ہی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

اگر یکے از مقامے بیفتد بارے در شرع افتد مبادا اگر از شرع بیروں افتد پس چہ ماند" فوائد الفواد۔ص ۹۵

مطلب وہی ہی کہ طریقت تو شریعت ہی پر اخلاص اور صداقت سے چلنے کا نام ہی، فرض کیجیے کہ کسی بیچارے کو یہ چلنا جس راستبازی، صداقت، اخلاص، جوش و ولولہ کے ساتھ چاہیے میسر نہ آیا، تو کم از کم وہ ان چیزوں کو جو شریعت میں حلال ہیں انہیں حلال ہی مانتا ہی جو حرام ہیں اُنہیں حرام ہی سمجھتا ہی، لیکن جس نے اس ماننے سے بھی بغاوت کی، تو طریقت تو خیر دور کی چیز ہی، وہ شریعت اور اسلام ہی کے دائرہ میں کب باقی رہا۔

بہر حال یہ واقعہ بھی ہی، اور یہی "مشرب ناب" ہمارے خواجگان چشت کا تھا، آپ دوسروں کے تصریحات میں تو ممکن ہی شاخسانے نکال سکتے ہیں لیکن خدا کا بڑا کرم ہوا، ہندوستان کے مسلمانوں پر کرم ہوا کہ اس ملک میں اسلام جن بزرگوں کے ذریعہ سے پہلی دفعہ داخل ہوا، ان ہی میں سے ایک مسلم الثبوت ہستی نظام الاولیا، کے ملفوظات نے

قلم بند ہو کر متواتر کی شکل اختیار کرلی، کہ آج اسی کے ذریعہ سے بیسیوں غلط فہمیوں کے متعلق جو اصل واقعہ ہی، اُس کا سُراغ لگانا ہمارے لیے آسان ہو گیا اور مزامیر کا مسئلہ تو ایسا ہی کہ اس کے متعلق صرف حسن علا سنجری ہی کی یہ روایتیں نہیں ہیں، بلکہ میر خورد [1] جن کی کتاب ظاہر ہی کہ اعتماد و وثوق میں فوائد الفواد کی ہم رتبہ نہیں ہی بلکہ بعض خاص حالات کے تحت اس کی بعض چیزیں محل غور و تامل ہیں۔ میر خوردؒ کی بعض تعبیریں بھی ہوش

---

[1] چونکہ اپنے مقالہ میں میر خورد کی کتاب کے حوالے میں نے بکثرت نقل کیے ہیں، اس لیے میر صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ سادات کے ایک شریف گھرانے کے صاحب علم بزرگ ہیں، میں بتا چکا ہوں کہ حضرت سلطان المشائخؒ سے براہ راست شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہی، اور حضرت کی خانقاہ کے متصل ہی ان کے والد کا مکان تھا، تعلیم بھی ان کی سلطان جی کے خلفاء سے ہوئی ہی، خود لکھتے ہیں کہ نعمت دیدار و مشاہدہ آں بزرگوار (سلطان المشائخؒ) بھی ان کو مسلسل حاصل ہوتی رہی اور ذوق مجالس ارادت و مساس دستِ مبارک سلطان المشائخؒ۔ ص ۳۵۹ سے سرفراز ہوتے رہتے تھے، اسی لیے میں ان کے بیان کو عام تذکروں کے بیان سے خصوصاً سلطان جی اور ان کے خلفاء کے متعلق ایک ایسا تاریخی بیان قرار دیتا ہوں جس کا مقابلہ دوسری تاریخی کتابوں سے مشکل ہی، مگر اسی کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہی کہ حضرت والا کی بیعت ان کو ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی کہ بقول خود "درک معانی دراں ایام چنداں نہ بود" ص ۳۵۹۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت والا کی وفات کے بعد خود ہی لکھتے ہیں کہ معاملہ نفس کہ دشمن دینی ست برحسب مطلوب آنحضرت (سلطان المشائخؒ) نہ بود" اور اس کی وجہ بیچارے نے خود ہی لکھ دی ہی کہ یہ جو کچھ ہوا "از غلبۂ جوانی چنانکہ افتد دانی مزاحم شد" ص ۳۶۳ یہ بھی لکھا ہی کہ اس زمانہ میں سلطان جی کو خواب میں جب دیکھا تو میں قدموں کی طرف بڑھا لیکن "کسانیکہ بودند مانع ایں دولت می شدند" جس سے معلوم ہوتا ہی کہ ان پر حضرت والا کا وہ پختہ چشتی گہرا رنگ نہیں چڑھا تھا جو سلطان جی کے خلفاء اور مریدوں کی خاص شان ہی، اسی لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں، کچھ ان میں ایک رنگ تعصب کا بھی ہی، یعنی حضرت بابا فرید شکر گنج کے دوسرے خلفاء خصوصاً سلسلہ صابریہ کے شیخ حضرت علی صابر صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہی کہ گویا ان کو بابا صاحب کے یہاں چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔ اگرچہ یہ الفاظ بھی لکھے ہیں "شیخ علی صابر در ویشے تندے ثابت و نفسے گیرا داشت ساکن قصبہ ڈکیری بود سے وپیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم داشت اور از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود" یہ بھی لکھا ہی کہ شیخ کبیر سے شیخ علی صابر نے کچھ چاہا تو فرمایا "بھوگا خواہی کرد" بھوگا کا ترجمہ کیا ہی "عیشے خوش خواہد گشت" (بقیہ برصفحہ ۱۸۱)

ہیں، لیکن باوجود اس کے سماع و شرائط سماع کے متعلق حضرت سلطان المشائخ کے مسلک کو ان الفاظ میں درج کرتے ہوئے، کہ

چندیں چیزے می باید کہ تا سماع مباح شود مسمع (سُنانے والا کون ہے) مستمع (سُننے والے کیسے لوگ ہیں) مسموع (جو چیز سنائی جارہی ہے وہ کیا ہے) آلۂ سماع (کن آلات سے سماع ہو رہا ہے)

پھر ہر ہر جزو کی خود تفصیل کرتے ہیں،

مسمع (سُنانے والے کی شرط یہ ہے) کہ کودک نہ باشد، عورت نہ باشد، مستمع (یعنی سُننے والوں کے متعلق یہ شرط ہے) از یاد حق خالی نہ باشد، مسموع (جو چیز سنائی جائے اس کی شرط یہ ہے کہ) فحش و مسخرگی نہ باشد"

آخر میں "آلۂ سمع" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آلۂ سماع مزامیر است چوں چنگ و رباب و مثل آں می باید کہ درمیان نہ باشد" ص ۴۹۲

میر خورد ہی نے حضرت سلطان المشائخ سے نقل کیا ہے کہ گانا سُننے والوں کا

"اگر میل بکلی طرف مجاز است آں حرام است"

یعنی مزامیر ہوں یا نہ ہوں، لیکن جن لوگوں کے قلوب مادی حسن و جمال سے مالوف ہیں، ان کے لیے تو ہر قسم کا گانا سُننا "حرام" ہے۔ یہ سلطان جی کا فتویٰ ہے جو اُنھوں نے نقل کیا ہے، لیکن آج ان مسلمانوں کو کون جا کر سنائے، جو علانیہ بے دھڑک اپنے نوجوان بچوں اور عورتوں تک کو سیناؤں میں بھیجتے ہیں، خود ہر قسم کے گیت جو جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، لوگ سُنتے ہیں، اپنے لڑکوں لڑکیوں، بیویوں کو سنواتے ہیں، اور اس طور پر مسلمانوں میں یہ عمل جاری ہو گیا ہے کہ گویا ان کے مذہب کا اس باب میں کوئی حکم ہی نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۸۰) مگر شیخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جاتے ہیں شیخ محدث بھی متنبہ ہوئے ہیں، لکھا ہے کہ یہ طرز تحریر "خالی از غرابت نیست" بلکہ ان کو یہ شبہ ہے کہ کسی دوسرے علی صابر کا تو یہ تذکرہ نہیں ہے ۱۲ (اخبار الاخیار ص ۶۹)

آج ہمارے صوفیہ اس پر تو آستین چڑھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جو ان کے سماع پر معترض ہو، اور جواب میں بزرگوں کا فعل یا قول پیش کیا جاتا ہے لیکن جن بزرگوں کے قول سے آپ سماع کا جواز ثابت کرتے ہیں اور ان کی نصرت و تائید کی حمیت آپ کو آپے سے باہر کر دیتی ہے، بندگانِ خدا! ان ہی بزرگوں کا تو یہ فتویٰ بھی ہے کہ آج جن خصوصیات کے ساتھ تھیٹروں یا سینماؤں میں گانا گایا جاتا ہے، یہ گانا "حرام" ہے، پھر آپ میں اس فتوے کی تعمیل کا کیوں جوش پیدا نہیں ہوتا؟ اس میں حمیت کی رگ کیوں نہیں پھڑکتی، کچھ نہیں تو جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ان ہی سے جہاں اور امور کا معاہدہ لیا جاتا ہے حرمت غنا کے اس صوفیانہ فتوے کا بھی معاہدہ لیا جاتا، یہ نہیں تو جو لوگ آپ کے زیر اثر ہیں ان کو کم از یہ بھی بتا دیا جاتا کہ غنا کی یہ شکل جو سینماؤں میں مروج ہے، یہ صرف فقہار اسلام ہی نہیں بلکہ صوفیار اسلام خصوصاً ہندوستان کے طریقۂ چشتیہ میں بھی حرام ہے، آخر کچھ تو لوگوں پر اس کا اثر ہوتا اب تو کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سینماؤں کی شرکت ایک قسم کا غیر شریفانہ فعل ہے اور وہ بھی ان لوگوں میں جن میں اسلام کا دباؤ کچھ نہ کچھ ابھی باقی ہے، حالانکہ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ گانے بجانے کے مسئلہ کو جن بزرگوں کی آڑ لے کر ایک حد تک جائز ٹھہرایا جا رہا ہے ان کے نزدیک بھی "سینمائی گانے" حرام ہیں، آج اسلام کے اس حکم کی قیمت لوگوں کو نہیں معلوم ہو رہی ہے لیکن انسانی فطرت کی خصوصیات پر جن کی نظر ہے، جو جانتے ہیں کہ "گانا" اور "نغمہ" کا تعلق آدمی کے جذبات کے ساتھ کیا ہے خصوصاً جب ہیجان انگیز قصوں کی جیتی جاگتی تصویروں کے ساتھ اس کا میل کیا گیا ہو انسان کی نقل اُتارنے والی فطرت ان تماشاؤں سے کن خطرناک عناصر کو چراتی ہے، اور اپنی عملی زندگی میں اس کو شریک کر کے لوگ اپنے آپ پر، اپنی آئندہ نسلوں پر جن کے وہ امین و محافظ ہیں، ان پر کیا کیا مظالم ڈھاتے ہیں، اور ڈھائیں گے، اس کا اندازہ ابھی نہیں اس ملک کو اس وقت ہو گا جب علاج کا بھی وقت باقی نہ رہیگا۔

اور بوالعجبی تو یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کی جو یونیورسٹیاں آج ٹھیکہ دار ہیں جن جوامع و کلیات و مدارس و معاہد کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ "انسانی اخلاق" کے نشوونما اور بالیدگی کے وہ واحد ذرائع ہیں، ان میں خود نوجوان بچوں سے تمثیلی تماشے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے نام سے علانیہ کرائے جا رہے ہیں، خام عمر کے ان بچوں کو جن کی شبابی زندگی بالکلیہ اس وقت جذبات و عواطف کے زیر اثر رہتی ہے، عقل کی خوابیدگی کے ان دنوں میں ان کو تباہی کے جن غاروں میں ڈھکیلا جا رہا ہے اس کی فریاد کس سے کیجیے۔

یقین مانیے کہ اس کا بھی واحد علاج صرف نظامِ تعلیم کی وحدت ہے، کاش! اس مسئلہ کی اہمیت کو جتنا میں سمجھ رہا ہوں، دوسروں کی سمجھ میں بھی یہ بات آجاتی تو مسئلہ کچھ زیادہ مشکل نہ تھا، آخر اتنا مشکل تو نہیں ہے، جتنا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ لیکن زمانہ کو اختیار ہے، جس چیز کو چاہے اہم قرار دے اور جسے چاہے بے معنی، لغو، فضول کہہ کر ٹال دے لوگ "فرعون" سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ "فرعونیت" سے نجات پانے کی کوشش کی جائے۔

یعقوب کی اولاد اور اسرائیل کے بچوں کو فرعون کے پنجہ سے رہائی مل چکی تھی لیکن "فرعونیت" اور اس کے لوازم و شعائر کا بھوت ان پر پھر بھی سوار ہی تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو "مصری تمدن" کے شعار خاصُ البقرہ گائے کے متعلق سوال و جواب کی بھرمار کے ساتھ

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ تو بنی اسرائیل نے گائے تو ذبح کر ڈالی لیکن قریب تھا کہ اس کام کو وہ نہ کرتے۔

کی ہچکچاہٹ میں کیوں مبتلا ہوتے۔

آپ خوش ہیں کہ یہ سارے عوارض صرف ان تعلیم گاہوں تک محدود ہیں جہاں بقول آپ کے صرف "دنیاوی علوم" کی تعلیم دی جاتی ہے، باور کیے بیٹھے ہیں کہ "دینی علوم"

کے مدارس ابھی ان آفات سے محفوظ ہیں، بلاشبہ ابھی ماحول کے سمی اثرات دینی مدارس میں کم منتقل ہوئے ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ دینی مدارس کے بکروں کی ماؤں کو خیر منانے کا موقعہ کب تک ملتا رہیگا۔

پرانی صحبتوں کے دقیانوسیوں کی آنکھوں کو بند ہونے دیجیے اور ظاہر ہے کہ بالآخر انہیں بند ہونا ہی پڑیگا، پھر ہم ہونگے یا نہ ہونگے لیکن دبے پاؤں جو چیز مختلف راہوں سے دینی علوم کے ان قلعوں میں بھی گھس رہی ہے، خصوصاً سیاسی سوراخوں سے نامحسوس لہریں مخفی طور پر پہنچ رہی ہیں، جو آنچ لگ رہی ہے ایسی صورت میں بس ان کا محافظ اللہ ہی ہے!

واللہ خلیفتہ علی امتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کچھ مصر کے عصری تجربات بھی ان امور کی طرف اشارے کر رہے ہیں، جنہیں میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کاش! نہ دیکھتیں کہ اس بصیرت نے جگر کو خون بنا دیا، جنون کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جب اس مستقبل کا دھیان آتا ہے، جن کی طرف سے دیکھ رہا ہوں کہ عام طور پر غفلت برتی جارہی ہے۔

اُف میں پھر بہنے لگا، گفتگو خواجگانِ چشت کے مسلک سماع میں ہو رہی تھی، اور نکل آیا پھر وہی اسکولوں اور کالجوں کی طرف، میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کا ارادہ نہیں ہے، لیکن مزامیر کے متعلق جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس کے متعلق جو صحیح واقعات تھے، شاید اُن کا ذکر نہ کرنا گناہ ہو جاتا، آپ دیکھ چکے کہ "سماع" کے متعلق جس چشتی بزرگ کی سب سے زیادہ شہرت ہے عام تاریخوں میں بھی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے، آج ہی نہیں، خود سلطان المشائخ کے زمانہ میں بھی اس مسئلہ نے مختلف طریقوں سے فتنہ کی صورت اختیار کی، غیاث الدین تغلق کے دربار میں باضابطہ مناظرہ کی مجلس مرتب ہوئی، سوال وجواب ہوا، حالانکہ اس کی کل حقیقت

اتنی تھی کہ کبھی کبھی سلطان المشائخؒ ان خاص شروط کے ساتھ جس کا ذکر میں نے قصداً امیر خورد کے حوالہ سے کیا ہے، اس لیے کہ ان کو "مسئلہ سماع" سے خاص دلچسپی ہے، ان کی کتاب کا ایک بڑا حصہ اسی مسئلہ کے متعلقہ مباحث سے بھرا ہوا ہے۔

لیکن باوجود اس اصرار کے وہی راوی ہیں کہ ان ہی شروط کے ساتھ سلطان المشائخ کبھی کبھی سماع سُن لیا کرتے تھے، ان شروط کے ساتھ بھی ان کے سماع کی کیا کیفیت تھی، اور اس کا مقصد کیا تھا؟ اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمان شعراء نے فارسی میں بہت زیادہ اور عربی میں کم بقول غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بات مے و ساغر کہے بغیر

ایک خاص طریقہ کلام کا اختیار کیا تھا، جو آدمی ان شعراء کی اصطلاحوں سے ناواقف ہے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو نہ مسلمان ہیں اور نہ ہماری شاعری کی اس خصوصیت سے واقف ہیں، ان کو اس پر حیرت ضرور ہوتی ہے کہ "مے و ساغر" سے "مشاہدۂ حق" کی گفتگو کا کام مسلمان کیسے لیتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ تقریباً تیسری چوتھی صدی سے اسلامی شعراء کے کلام میں یہ رنگ پیدا ہوا، ہمارے شاعروں نے اپنی کثرتِ مشق سے مسلمانوں کو ان الفاظ سے اتنا مانوس کر دیا ہے کہ حقیقی معانی کی طرف ذہنوں کا منتقل ہونا گویا دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے سوا بھی، صوفیہ اسلام نے اس کے دائرہ کو یوں وسیع کر دیا کہ بولنے والے کی خواہ کچھ ہی مُراد ہو، ہمیں اس سے بحث نہیں، انہوں نے ان الفاظ کا جو عام طور پر شعراء استعمال کرتے ہیں خاص خاص مطلب طے کر لیا تھا، اور ان مطالب کے ساتھ ان کی مشق اتنی بڑھ گئی تھی کہ گویا وہی مطالب ان کے نزدیک ان الفاظ کے حقیقی مطالب اور معانی ہوتے تھے، اور یہ کوئی چھپی ڈھکی راز کی بات نہ تھی، سلطان المشائخ کی مجلس کے محدث و عالم مولانا فخرالدین زرادی نے تو صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ

"اگر مستمع (سننے والا) سماع حمل کند بر صورت مخلوق معین یا غیر معین، ایں سماع حوا بالِ ذی شہوت بود"

الغرض سماع میں بڑی شرط یہ تھی کہ الفاظ کو ان معینہ مطالب پر محمول کرنے کی صلاحیت و مشق پیدا ہو چکی ہو، جو صوفیہ میں معین ہیں مثلاً۔

"مستمع (سننے والا) سماع را حمل کند بر احوال نفس خود، بہ تقلیب احوالے کہ با خدا تعالیٰ دارد"

کیونکہ ظاہر ہو کہ ایک بندے کا تعلق اطاعت و نافرمانی کے حساب سے حق تعالیٰ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہو، جس کا احساس خود اس شخص کو ہو سکتا ہو جس کا خدا سے معاملہ ہو، اسی لیے صوفیہ اشعار کو

"در سلوک احوالے کہ پیش آید از قبول ورد و وصل و ہجر طمع و نومیدی"

ان ہی باتوں پر حمل کرتے ہیں، اور سلطان المشائخ سے اشعار کے محمول کرنے کے متعلق جو بیان سیر الاولیاء میں منقول ہو، یعنی

"از زلف قرب خواہد بقولہ تعالیٰ لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی و از لون جنت و از چشم نظر رحمت و لتصنع علی عینی و کفر پوشیدن باشد... یعنی تا ہستی و اعمال و صدق بر تو پوشیدہ نشود دعویٰ عشق از تو درست نیاید" ص ۹۲ ۴

اور یہی میرا خیال ہو کہ در اصل قرآنی آیات کے ترجموں کو ایک خاص طریقہ سے یہ حضرات خوش الحانی کے ساتھ کبھی کبھی سن لیا کرتے تھے، میں نے کسی جگہ شیخ کبیر کا حال نقل کیا ہو کہ حجرہ مبارک میں ٹہلتے اور کبھی کبھی سر بسجود ہو کر یہ اشعار پڑھتے۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم | خاکے بشوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی | از بہر تو میرم از برائے تو زیم

میں نے بتایا تھا کہ یہ آیت قرآنی ان صلوٰتی و نسکی کا حاصل ہو، جسے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہو میر خورد نے بعض ان اشعار کو بھی نقل کیا ہو جس سے سلطان المشائخ کبھی کبھی بہت متاثر

ہوئے تھے مثلاً

رخ جملہ رانمود ومرا گفت تو مبیں ‏ ‏ ‏ ‏ زین ذوق مست بے خبرم کیں سخن چہ بود

آپ ہی بتائیے کہ اگر اس شعر کو سن کر کسی کا ذہن

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ‏ کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہونگے اپنے رب کے نگراں

یا

کَلَّاۤ اِنَّہُمۡ عَنۡ رَّبِّہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ‏ ہاں! وے لوگ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہونگے

کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور اسی کیفیت میں وہ ڈوب جائے۔ تو وہ قرآن میں ڈوبا، یا کسی اور چیز میں ڈوبا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ اپنے ان تعلقات کو جو قرآن نے عبد ومعبود یا امتی ورسول میں پیدا کیے ہیں، اسی کو ذرا بیدار اور زندہ کرنا چاہتے تھے، اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ خاص احباب کا مجمع ہو، ہم مذاق لوگ ملے جلے بیٹھے ہیں، کسی نے چند اشعار گا کر سُنا دیے، اس میں کچھ خاص پیشہ ور قوالوں کی بھی حاجت نہ تھی، بہ کثرت آپ کو واقعات سلطان المشائخ ہی کے حالات میں ملینگے کہ امیر خسرو نے یا ان کے صاحبزادے امیر حاجی نے پڑھنا شروع کیا، کبھی شیخ نظام الدین پانی پتی جو قوال نہ تھے، وہ سُناتے تھے، انتہا تو یہ ہے کہ حضرت شیخ کبیر کے حقیقی نواسے خواجہ محمد جو سلطان المشائخ کے باضابطہ پنجوقتہ نماز کے امام بھی تھے، وہی سُنا دیتے، کچھ اشعار کی بھی ضرورت نہ ہوتی، اگر ان میں لطف آتا تو فرما دیتے کہ

---

[1] شیخ العلماء سیدنا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے فرماتے تھے کہ دھمکی آدمی کو اسی چیز کی دی جاتی ہے جس کا خواہشمند ہو، قرآن کی ایسی دھمکیاں کہ حق تعالیٰ ان کی طرف نگاہ نہیں کرینگے یا قیامت کے دن اپنے رب سے وہ محجوب ہونگا یہ دھمکی اسی وقت ہو سکتی ہے جب مانا جائے کہ آدمی کی فطرت میں اس کی تڑپ موجود ہے، فرماتے تھے اوروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن میرے لیے تو جہنم اور اس کے عذاب کی دھمکیوں سے لَا یَنْظُرُ اِلَیْہِمْ کی دھمکی زیادہ زہرہ گداز ہے ۱۲

"سماع را بدارید، وبہ حکایات و مآثر بزرگاں مشغول شوید" ص ۲۰۱ سیرالاولیاء

اور اب تو اس کا دستور نہ رہا، لیکن خواجگانِ چشت کے ایک مشہور رکن رکین خواجہ ممشاد علو دینوری کے زمانہ سے یہ روایت چلی آتی تھی، ان کا بیان تھا، کہ خواب میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو زیارت ہوئی تھی، اس وقت اُنہوں نے سماع کے متعلق دریافت کیا کہ حضور کو ہمارا یہ طریقہ اشعار سُننے کا ناپسند ہے؟ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں ناپسند تو نہیں کرتا لیکن

قل لھم یفتحون قبلہ بالقرآن و یختمون بعدہ بالقرآن (سیرالاولیاء ص ۴۹۳) لوگوں سے کہو کہ وہ قرآن سے آغاز کریں، اور قرآن ہی پر ختم کریں۔

لیکن افسوس کہ بہ تدریج یہ رسم غالباً مٹ گئی، اور اب تو سماع کی مجلسوں کا جو حال ہے، اچھا ہی ہوا کہ قرآن کو ایسی مجلسوں سے الگ کر دیا گیا۔

بہرحال جس قسم کے سماع کا رواج خواجگانِ چشت کے معماران اولین میں تھا، اس کی تو یہ حالت تھی اور مقصود اس کا وہی تھا، جو میں نے عرض کیا، حسن علا سنجری نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ

"مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر است اگر روزے وقتے خوش وقت دریافت ہمہ اوقات متفرقہ آں روز پناہ آں وقت باشد" فوائد الفواد ص ۹۶

اسی کے ساتھ ظاہر ہے کہ خوش الحانی کے ساتھ اشعار سُننے کو صرف جائز سمجھتے تھے، نہ کہ فرض و واجب، یا سنت و مستحب آپ کا یہ ضرور خیال تھا کہ جو لوگ اس طریقہ سے بھی اشعار سُننے کو حرام سمجھتے ہیں، تو ان لوگوں کو بھی اس پر اتنا اصرار نہ کرنا چاہیے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ

"خود نشنود اما با دیگراں خصومت نکند" فوائد ص ۲۲۸

اور یہ منافع تو وہ تھے جو اشعار سننے سے ان بزرگوں کے پیش نظر تھے، لیکن اوروں کا تو میں

نہیں کہتا، البتہ سلطان المشائخؒ نے جس طریقہ سے اس سماع کو سنا ہی، جو کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہی کہ وہ ان ہی تک محدود نہیں رہتی تھی، واللہ اعلم بالصواب کیا حال تھا، لوگوں کا بیان ہی کہ

"دراں ایام ہر بیتے و صوتے کہ حضرت سلطان المشائخؒ را در سماع ذوق دادے آں صوت، وآں بیت مدتے مدید در میان خلق مشہور شدے، خورد و بزرگ، وضیع و شریف در مجمعہا و محلتہا و محفلہا و کوچہا ذوقہا می کردند"

اسی کے بعد لکھا ہی کہ

"کارِ محبت و عشق را روز بازارے در جہاں پیدا آمدہ" (سیر الاولیاء ص ۵۱۰)

یہ اس شخص کا بیان ہی جو اس زمانہ میں خود موجود تھا، آپ اس کے ساتھ علاء الدین خلجی کے اس مشہور فقرہ کو ملائیے جس کے ناقل بہت سے لوگ ہیں، یعنی سلطان المشائخؒ کی دن دونی مقبولیت کو دیکھ کر گو دوسروں کے اشارے سے ہی لیکن اس کو خطرہ ہوا کہ سلطان المشائخؒ کی موجودہ مقبولیت عامہ روز سے از روزے کوئی سیاسی کروٹ نہ لے علاء الدین کے یہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

"مقربان، دلوازم و جوانب تخت من و سائر خلق بندہ و مرید او (سلطان المشائخؒ) شدہ اند حیلہ باید انگیخت تا از ضمیر او چیزے مارا روشن شود" (سیر الاولیاء ص ۱۳۳)

علاء الدین نے اس کے لیے جو حیلہ کیا مجھے اس سے بحث نہیں ہی، بلکہ بتانا یہ ہی کہ عہد علائی کے اکثر امراء وملوک و عمائد سلطان المشائخؒ کے مرید ہو گئے تھے، حتیٰ کہ خود علاء الدین کا ولی عہد خضر خاں، جسے دیول رانی کے قصہ کی وجہ سے امیر خسرو نے ذکر دوام کی زندگی دی ہی، وہ بھی حضرت کے خاص مریدوں میں تھا، میر خورد، اسی زمانہ کے آدمی ہیں، ان کی بھی یہی شہادت ہی۔

"خلق از علماء و مشائخ و امراء و ملوک مریدِ آں حضرت گشتند"

بہرحال اتنا تو سب ہی کو مسلم ہے کہ عہد علائی وہ زمانہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی طرف سے سلطان المشائخ کے حسنِ قبول کا آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا، عموماً مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی طرف تھا، ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمومی پیشہ فوجی خدمت ہی تھا حضرت والا کے دونوں مشہور شاعر مرید امیر خسرو اور امیر حسن علا، ان دونوں بزرگوں کو بھی ہم مختلف فوجی مہموں میں شریک پاتے ہیں۔

ان واقعات کے بعد ایک تاریخی سوال ہے جو آج ہی نہیں جب سے واقع ہوا ہے، اٹھایا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ مسئلہ مخفی نہیں ہے، جیسا کہ طباطبائی نے بھی لکھا ہے۔

فتوحاتیکہ در اطراف ممالک ہند و دکن، سلطان را میسر آمد و احداث عمارات و ادخار خزائن در کمال وفور، در عہد او صورت گرفت ہیچ یک از سلاطین ہند را دست نداد سیر ۱۱۹ جمع کرد ۱۲

واقعہ یہ ہے کہ علاء الدین ہی کے زمانہ میں اسلام کی راہ دکن میں کھلی، اسی نے چتوڑ، رنتھنبور کے ناممکن التسخیر قلعوں کو فتح کیا، جنوبی ہند میں، نہ صرف دیوگڑھی کے مشہور قلعہ کو اس نے فتح کیا، بلکہ ورنگل کی حکومت بھی اسی کے ہاتھ سے مسخر ہوئی، اور بقول بداؤنی

در سنہ ولایت معبر (مدراس)، تا دہور سمند[1] در حوزہ تصرف اہل اسلام در آمد ص ۱۸۷ جلد

حتیٰ کہ اپنی اسی فوجی قوت پر اس کو اتنا ناز ہوا کہ پہلے تو دماغی فتور میں مبتلا ہوا کہ کوئی نیا مذہب ہی جاری کرے، لیکن جب علاء الملک نے اس کی تفہیم کی تو اس سے باز آیا، پھر اس کا خیال جمانے لگا کہ

مانند سلطان سکندر رومی بہ تسخیر اقالیم سبعہ پردازد و فرمود تا او را سکندر ثانی در خطبہ خوانند و در سکہ نیز ہمیں لفظ داخل کرد" سیر المتاخرین ص ۱۱۷

گو علاء الدین اس ارادہ سے بھی باز آگیا، اور اسی کے مقابلہ میں ہندوستان کے باقی ماندہ حصوں کے فتح کا عزم کیا جس میں وہ کامیاب ہوا۔ لیکن علاء الدین تو خیر مر گیا، اور

---

[1] اب میسور کا ایک مشہور قصبہ یہ "دہور سمند" کا شہر ہے کسی زمانہ میں اس علاقہ کا یہی مرکزی مقام تھا ۱۲

اس کی موت کے بعد حکومت کا نظام کچھ درست نہ ہو سکا لیکن علاء الدین کی موت کے کل نو سال بعد اسی فوجی قوت کے بھروسہ پر جو اس زمانہ میں ہندوستان میں مہیا ہو گئی تھی، محمد تغلق بھی وہی "چوں سکندر رومی اقالیم سبعہ را تسخیر نماید" (ص ۱۲۵) کا قصد مصمم کرنے لگا۔

یقیناً سوال ہوتا ہے کہ آخر ہندی فوجیوں میں یہ بے نظیر طاقت جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے، اور نہ اس زمانہ کے بعد، اس کے اسباب کیا تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندی حکومت کی قوت اس زمانہ میں اتنی قوی نہ ہوتی، تو تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ تاتاریوں کے مسلسل حملوں کی مدافعت ناممکن تھی، ہر برس دو برس کے بعد ٹڈی دل شکلوں میں چنگیز خانی تاتاری کفار ہندوستان کے اسلامی ملک میں سر نکال لیتے تھے، لیکن ہر بار ان کو بُری طرح ہزیمت اُٹھا کر واپس جانا پڑا، تاتاریوں کا یہ ہجوم جب آتا تھا تو لاکھ دو لاکھ سے کم نہ ہوتا تھا، تفصیلات کے لیے اس عہد کی قدیم تاریخیں پڑھیے، میں نے جیسا کہ عرض کیا، یہ سوال نیا نہیں بلکہ پُرانا ہے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، یعنی عہد علائی کے حیرت انگیز فتوحات اور مدافعات دونوں کے متعلق جو تعبیر کی جاتی تھیں وہ یہ تھیں، ملا صاحب کے بجنسہ الفاظ یہ ہیں۔

"ایں فتوحات را بعضے حمل بر استدراج (یعنی ظالم کی خدا نے رسی دراز کی ہے) و بعضے بر کرامات سلطان علاء الدین می کردند و بعضے امن و امان عہد را از برکات بے نہایات سلطان المشائخ نظام الاولیاء قدس سرہ می دانستند۔"

ظاہر ہے کہ علاء الدین نے اپنے مربی و سرپرست چچا و خسر سلطان جلال الدین[1] خلجی جیسے نیک،

---

[1] اصل قصہ تو تاریخ میں پڑھیے لیکن اس لیے کہ بسا اوقات معمولی عورتوں کے خاندانی جھگڑے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں، اتنا ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ سلطان جلال الدین خلجی بڑے دیندار مسلمان تھے، انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی علاء الدین اپنے بھتیجے سے کر دی تھی، لیکن علاء الدین کی ساس اور اس کی بیوی دونوں کی علاء الدین سے نہیں بنتی تھی، اسی خانگی زندگی کی تلخیوں سے مجبور ہو کر اپنے علاقہ کڑہ مانک پور سے گویا اچانک تھوڑی سی فوج لے کر جنوبی ہند کی طرف غائب ہو گیا، جس کی جلال الدین کو کبھی خبر نہ تھی (بقیہ برصفحہ ۱۹۲)

دیندار بادشاہ کو انتہائی سفاہت کے ساتھ ضرور قتل کیا تھا، لیکن

لیس ہذا اول قارورۃ انکسرت فی الاسلام — لیکن یہ پہلا شیشہ نہ تھا جو اسلام میں ٹوٹا تھا۔

کوئی پہلا آبگینہ نہیں تھا، جو اسلام میں ٹوٹا تھا، پھر علاء الدین ہی کے ساتھ استدراج کے کیا معنی ہو سکتے تھے، نیز فوجی طاقت کا یہ ناز تو محمد تغلق تک باقی تھا، اگر قوت محسوس نہ ہوتی تو ہفت اقلیم کی فتح کا غلط ارادہ بھی کیوں پیدا ہوتا، رہی علاء الدین کی کرامت سو ظاہر ہے کہ گو بعد کو وہ تائب ہو گیا تھا، شراب بھی اس نے چھوڑ دی تھی لیکن با ایں ہمہ ایک معمولی دنیادار بادشاہ سے زیادہ حیثیت اس کی کبھی نہ رہی۔

پھر آپ کو خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس عہد کے مسلمانوں میں جاں فروشی، جانبازی کی ایسی بے پناہ قوت کہاں سے آ گئی تھی، کہ بڑے سے بڑے قلعے جو برسوں میں فتح نہیں ہو سکتے تھے ہفتہ دو ہفتہ میں ان کا سقوط ہو جاتا تھا، حوصلوں کی وہ بلندی کہ آج دلی میں ہیں، کل لکھنوتی، پرسوں دیوگڑھی، چوتھے دن کھمبائت، معبر، ورنگل کے قلعوں کے نیچے ان کے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں، رعب کی یہ حالت کہ آنکھ ملانے کی ہمت بھی دشمنوں کو نہیں ہوتی، ایک طرف یہ حال ہے، دوسری طرف تاتاریوں کا سیلاب آتا ہے اور سرحد ہی پر یا جس مقام پر وہ ظاہر ہوتے ہیں، وہیں روک دیے جاتے ہیں۔

یہ واقعات ہیں خیالات نہیں ہیں، پھر انقلاب کی وجہ کیا ہوئی؟ یہ قوت مسلمانوں میں کس سرچشمہ سے بھری گئی؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱) اب خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد: علاء الدین کے ساتھ جو فوج تھی وہ زر دوستوں کا ایک مجمع تھا، دکن میں جو بھی ان کے سامنے آیا ٹھہر نہ سکا، اس غیر متوقع کامیابی کے بعد علاء الدین کڑہ کے علاقہ میں واپس آیا، اور فاتح تلنگیوں کے مٹانے کی کوئی تدبیر اب اس کے سامنے نہ تھی بجز اس کے کہ اس نمک حرامی اور سنگدلی پر آمادہ ہو جائے، جس کا ذکر عام تاریخوں میں ہے، یعنی سلطان جلال الدین کو بڑی بے رحمی کے ساتھ اس نے قتل کر دیا اور خود تخت ہند پر متمکن ہو گیا۔"

بات یہ ہے کہ یوں کہنے کو تو جو کچھ کہا جائے اور کہنے والوں نے جب علاء الدین کی کرامت ہی کا دعویٰ کیا ہے، تو ظاہر ہے اور جو توجیہ بھی کی جائیگی وہ اس سے زیادہ کیا تعجب انگیز ہو گی ؟

جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس میں سلطان المشائخ کے وجود کو جیسا کہ اُس زمانہ میں بھی محسوس کیا گیا تھا، ہندوستان کی "فوجی قوت" کی اس خاص کیفیت کے پیدا کرنے میں ان کو بالکل بے تعلق نہیں کہا جا سکتا، اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جسے ہم ماورار عقل قرار دیں، بلکہ واقعہ وہی ہے جس کا ایک دفعہ نہیں، متعدد بار تجربہ کیا گیا ہے اور جس کا جب جی چاہے، تجربہ کرے، وہ قرآنی آیات، اور اس کی تعلیمات کا بے پناہ زور ہے، آپ سُن چکے کہ سلطان المشائخ جس شعر سے خاص ذوق و مستی کی حالت میں آجاتے تھے اور وہ زیادہ تر

- فاعلم انہ لا الہ الا اللہ ۔ پس جان لے کہ نہیں ہے "الہ" مگر اللہ ہی

کا فارسی ترجمہ ذرا شاعرانہ رنگ میں ہوتا تھا، اُسی وقت وہ شعر سارے شہر بلکہ ملک میں مشہور ہو جاتا تھا، گلیوں میں کوچوں میں، لوگ اسی کو دہراتے پھرتے تھے، سلطان المشائخ کے جن حالات کے ساتھ ان خاص اشعار کی شہرت مسلمانوں میں ہوتی رہتی تھی کیا یہ ممکن تھا کہ جس دل میں ایمان کا حبۂ خردل بھی ہوتا ہوگا، اس کا سینہ سلطان المشائخ کی اس بھڑکائی ہوئی آگ سے بھبھکانہ اُٹھتا ہوگا، سلطان المشائخ کے زمانہ میں فراخنائے ہند کے قدیم جغرافیہ میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا، ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے، کاش! اس پر کچھ لکھا جاتا، صورتِ حال کے اندازہ کے لیے میں "چندیری" کی فتح کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتا ہوں، جسے یہ خورد نے خود سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے، یعنی

"در عہد علائی والی از بادشاہ برائے فتح چندیری با لشکرہا تعین شد و او (والی) از معتقدان حضرت سلطان المشائخ بود"

میر خورد نے لکھا ہے کہ والی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور التماس کیا۔

"اگر یارے (خلفائے خاص میں سے کوئی خاص خلیفہ) از حضرت سلطان المشائخ
نیز بر ما نامزد شود"

حضرت والا نے مولانا وجیہ الدین یوسف کو لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔

"و در ولائت چندیری رواں کرد"

اب خدا ہی جانتا ہے کہ حضرت کے یہ خلفا، فوج میں کس قسم کے جذبات پیدا کرتے تھے کہ

"دراندک روز فتح آں مقام شد"

آج اس غریب چندیری کا تو بہتوں کو نام بھی معلوم نہ ہوگا لیکن جس زمانہ میں مسلمانوں کو اس علاقہ پر کشمکش کرنی پڑی تھی اس کا حال تاریخوں میں پڑھیے، ہر ہر پرگنہ جس کا سنگین اور خشتین قلعوں سے پٹا ہوا تھا، ابوالفضل نے صرف اس علاقہ کا جس کا نام اس زمانہ میں بارہ تھا، لکھا ہے۔

"محل، دہ ہر پنج پرگنہ قلعہ دارند ازاں جملہ چہار سنگین و پرگنہ مال خشتین"

خود چندیری خاص اور اس کے قریب للت پور بھنوارہ ہر جگہ "قلعہ سنگیں" بنے ہوئے ہیں، لیکن اس علاقہ کی قلعہ کشائیوں کا جو کام برسوں میں بھی انجام نہیں پاسکتا تھا، بلبن کی قاہرہ حکومت بھی چندیری کی فتح سے مایوس ہو چکی تھی، آپ سن چکے کہ "دراندک روز فتح آں مقام شد" اور کیا صرف فتح کر کے ہی یہ سرزمین چھوڑ دی گئی؟ مجھے ذاتی علم تو نہیں ہے لیکن ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس علاقہ کے صرف ایک مرکزی شہر چندیری کے متعلق لکھا ہے کہ

از بزرگ شہرہائے پاستانی (قدیم ہند) قلعہ سنگین دارد و درو چہار دہ ہزار[۱۴۰۰۰] سنگین خانۂ
بزرگ و سہ صد و ہشتاد[۳۸۰] بازار و سہ صد و شصت[۳۶۰] فراخ سرا و دوازدہ ہزار[۱۲۰۰۰] مسجد

آپ چودہ ہزار سنگین کوٹھیوں، اور تین سو اسی بازار تین سو ساٹھ سراؤں کے متعلق پڑھ چکے،

رائے قائم کیجیے، خواہ انہیں قبل الاسلام یا بعد الاسلام کے کارناموں میں شمار کیجیے لیکن اس گمنام شہر کی بارہ ہزار مسجدوں کی توجیہ میں بھی کیا اس کے سوا کچھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد یوسف وجیہ الدین کے سوا یہ مسجدی مذاق کسی اور کا پیدا کیا ہوا تھا؟ تاریخ نہیں جب، یہ بتاتی ہے کہ

"خلق چندیری بخدمت مولانا محمد یوسف توجہ کرد" سیر الاولیا ص ۲۸۷

میر خورد اپنی چشم دید گواہی کا بھی اضافہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

کاتب حروف ایں بزرگ را دریافتہ بود، ذوق مجلس او گرفتہ بیشترے خلق چندیری مریدان اواند" ص ۲۸۰

سچی بات یہی ہے کہ حضرت سلطان جی کے زمانہ میں ایمانی عواطف و جذبات کو بیدار کر کے جب قرآنی یقین کے قابو میں ان جذبات کو کر دیا جاتا تھا، "از بہر تو میرم از برائے تو زیم" کی ٹھوکر سے جو آگ پیدا ہوتی تھی، اسے عقل

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ — میری نماز میری قربانی میری زندگی میری موت سب کچھ جہانوں کے پالنے والے اللہ ہی کے لیے ہے۔

کے قطعی یقین کی گرفت میں دے دیتی تھی، اور گو "قرآن" کی یہ "روح" بظاہر چند لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن سارے مخلوقات سے ٹوٹ کر واقعی اپنی پرورش کرنے والی لامحدود قوت کے ساتھ جو جٹ جاتا ہے، کیا دنیا بھر کی پھر کوئی طاقت اس کو نیچا دکھا سکتی ہے۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَہَا۔ — اور جس نے طاغوت (خدا سے ہٹانے والی قوتوں سے رشتہ توڑا یعنی لا الٰہ کا مقام طے کیا، اور اللہ کو اس نے مان لیا (الا اللہ پر ڈٹ گیا) تو اس نے ایک ایسے مضبوط کڑے کو تھاما ہے جس میں مسک بھی پیدا نہیں ہو سکتی

میں یہ نہیں کہتا کہ حضرت سلطان المشائخ جان بوجھ کر اس ذریعہ سے ہندوستان کی فوجی قوت

کو بڑھانا چاہتے تھے، میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ
ان کے عشق جہاں سوز کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، جس قوت سے انہوں
نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھاما تھا، یقین کے جس نہ سرکنے والی چٹان
. . . . پر انہوں نے قدم جمایا تھا، ان کے زمانہ میں انسانیت کو اپنے مالک
کے قدموں پر جس اضطراب و بے تابی سے تڑپتے ہوئے ہندی مسلمانوں کی شکل میں پایا
گیا تھا، ایمان کا یہ ذوق، یہ وارفتگی، یہ شوق یہ ولولہ، شائد اس ملک کو نہ اس سے پہلے
نصیب ہوا، اور نہ بعد، پھر اگر اس کے نتائج بھی بے مثال ہیں تو آخر آپ ہی بتائیے کہ
اور ہوتا ہی کیا؟

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ○ (آل عمران) — اگر تم مر گئے یا قتل ہو گئے، تو اللہ ہی کی طرف اُٹھائے جاؤ گے۔

کے غیر مشتبہ علم کا دباؤ، بھڑکے ہوئے جذبات پر پڑ جاتا تھا، تو کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ

سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ . (آل عمران) — لپکو اپنے مالک کی آمرزش اور بخشائش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی فراخی آسمانوں اور زمین کی فراخی جیسی ہے۔

کی تعمیل میں پھر کوئی پس و پیش کر سکتا تھا،

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ) — مول لے چکا ہے اللہ ایمان والوں سے ان کی جانوں کو اس معاوضہ میں کہ انہیں "الجنت" ملیگی۔

کے "وعدہ" کے متعلق کسی مومن کا ایمان مجمل مفصل بن بن کر اگر ان خوارق و نوادر کا ظہور ان سے
کراتا تھا جن کا مشاہدہ ہم اس زمانہ میں کر رہے ہیں تو جذبات و عقل و ایمان تینوں کے
باہمی اجتماع کا ہمیشہ لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ بعد کو صرف جذباتی ہیجانات تو رہ گئے
لیکن عقل "یقین" کے جس لازوال سرچشمہ سے سیراب ہو کر ان جذبات کو عملی پیکروں میں جلوہ گر

کرتی تھی، بہ تدریج اس کا قرآن سے تعلق ٹوٹتا چلا گیا، اور آخر میں وہی سماعی اشعار جن سے
عمل پیدا ہوتا تھا، صرف ایک وقتی ہیجان اور کیفیت پیدا کر کے عمل کے میدان میں
اپنے سارے زور و شور کھو بیٹھے تھے، اور وہی بات صادق آتی تھی، جو ابن مسعود رضی اللہ
تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

الغناء ینبت النفاق گانا نفاق اگاتا ہے

وجد و حال کی مجلسوں کے سارے دعوے اعمال کے حلقوں میں پہنچ کر ایسی صورت میں
جھوٹ بن جاتے ہیں اور ع فی الشمس ما یغنیك عن زحل۔ اور یہ تو آپ دیکھ رہے
ہیں، جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اسے دیکھ کر آپ جو چاہیں رائے قائم کیجیے، لیکن آپ جو کچھ سن
رہے ہیں، آپ کو جو کچھ اب تک سنایا گیا ہے کیا ان شنیدوں پر اپنے دیدوں کا قیاس
کرنا صحیح ہوگا، کسی نے شیخ کبیر شکر گنج سے ذکر کیا کہ مشائخ چشت کے طریقۂ سماع پر بعض
علماء کو اعتراض ہے، فرمانے لگے:۔

"سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد، و دیگرے ہنوز در اختلاف ست"

آج کیا دیکھا جا رہا ہے، اور کل کیا دیکھا گیا تھا، دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے، پچانوے سال کے
بعد شیخ کبیر شکر گنج کی اس ناسوتی دنیا میں آخری رات تھی، سلطان المشائخ راوی ہیں۔

نماز خفتن (عشاء) بجماعت بگذارد، بعد ازاں بیہوش گشت ساعتے بہ ہوش آمد
پرسید کہ نماز خفتن گذاردہ ام گفتند آرے، گفت یکبار دیگر بگذارم کہ داند چہ شود،
دوم کرت نماز بگذارد باز بے ہوش شد ایں بار بے ہوش بیش تر شد باز بہوش آمد
پرسید کہ من نماز خفتن گذاردہ ام گفتند دوبارہ بگذارم الخ (سیر الاولیاء ص ۸۹)

الغرض یوں ہی پچانوے سال کی مشق سجدہ گزاری انہیں ہوش آنے کے بعد پھر اسی کام
پر مجبور کرتی تھی جس کے لیے عمر بھر جیتے رہے، غالباً تین دفعہ یہ صورت پیش آئی، بعد ازاں
برحمت پیوست" اور اسی سیرت فریدی میں فانی ہو کر جس نے بقا حاصل کی تھی، ایک کم

نوے سال (۸۹) کی عمر پائی تھی، ان ہی سلطان المشائخ کا بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں یہ حال تھا:

شیخ وقت نماز بجہت جماعت از بالائے بام جماعت خانہ کہ عمارتے بس رفیع است

فرود آمدے و با درویشاں و عزیزاں کہ دراں جمع ملکوت حاضر می شدند نماز

گذاردے۔ (سیر الاولیاء ص ۱۲۴)

اور "عمارتے بس رفیع" سے پانچوں وقت نیچے اُتر کر جماعت کی شرکت عموماً روزہ کی حالت میں ہوتی تھی، کیونکہ یہ تو صحیح نہیں ہے کہ آپ ایام محرمہ کے سوا ہمیشہ روزہ دار رہتے تھے؛ لیکن یہ صحیح ہے کہ مہینے کے زیادہ دن روزوں ہی میں بسر ہوتے تھے، علاوہ ان خاص مُریدوں کے جن کا لقب آپ کے حلقہ میں "یارانِ نظام الدین" تھا، اور جن کی تربیت کی شرط حضرت کے نزدیک

"در صحبت ما باش، یا ما در صحبت تو باشیم" ص ۳۲۱

ان یارانِ خاص کے سوا، آپ نے بیعت کے دائرہ کو جب بہت زیادہ وسعت دے دی تو مولانا ضیاء الدین برنی جو آخر میں حضرت ہی کے آستانہ پر آکر پڑ گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ حضرت نے ایک دن مجھ سے اس بیعت عام کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا، آپ نے پہلے تو اس مسئلہ کی ایک مختصر تاریخ بیان کی، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابتدا میں مشائخ طریق اُن ہی لوگوں کی تربیت فرماتے تھے، جو بالکلیہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اللہ اور رسول کے دین، اور دین کی خدمت میں مستغرق ہونا چاہتے تھے، لیکن شیخ شہاب الدین سہروردی شیخ ابو سعید ابو الخیر سیف الدین باخرزی کے زمانہ سے بیعت توبہ او تبرک کا رواج بھی جاری ہوا، شیخ کبیر شکر گنج نے بھی یہی مسلک اختیار فرمایا، اس کے بعد سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ کی اتباع میں اب یہی کرنے لگا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ

بہ تواتر می شنوم کہ بسیاراں از درآمدن ارادت من، دست از معصیتے میدارند و نماز

بجماعت می گزارند وبا وراد و نوافل مشغول می باشند"

درد بھرے لہجے میں اس کے بعد ارشاد ہوا۔

می بینم مسلمانے بعجز و اضطراب و مسکنت و بیچارگی بر من می آید و می گوید کہ از جملہ گناہاں توبہ می کنم من بر نیت آں کہ شاید سخن او راست باشد دست بیعت می دہم" (ص ۳۴۷)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان بزرگوں کی اصلی غرض عام پیری مریدی سے کیا تھی؟ ہا! جن کی ساری عمر اسی سوز و ساز درد و تپش میں گذری کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پیغمبر کی اُمت کو پیغمبر کے قدموں تک پہنچا دیا جائے، سلطان المشائخ عموماً فرمایا کرتے کہ ہمارے طریق کی پہلی شرط یہ ہے کہ "طلب جاہ و کرامت نباشد" صرف توبہ اور استقامت مطلوب ہے، پھر استقامت کا مطلب خود ہی یہ فرماتے کہ

"استقامت می باید کہ بر متابعت رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد و ہیچ مستحبے و آدابے از وفوت نہ شود" (سیر الاولیاء ص ۳۲۸)

یہی طریقہ میں داخل ہونے کی غرض تھی، لوگوں کو "مرگ" کے ساتھ پکڑا جاتا تھا، تب جا کر کہیں "فرائض" نماز باجماعت وغیرہ کی "تپ" پر راضی ہوتے تھے، لیکن آج اُمت کی پچھلی نسلیں پہلی نسلوں پر لعنت کرتے ہوئے جسے پیغمبر ہی نے قیامت کے ہولناک علامات میں شمار کیا ہے، ان ہی بزرگوں پر خلاف سنت، بلکہ بعض تو خلاف اسلام تک چلنے کا فتویٰ لگا رہے ہیں، گذر چکا کہ آج اس کی ریسرچ ہو رہی ہے کہ مسلمان صوفیوں نے افلاطن جدید مصری سے کیا لیا، یونانیوں سے کیا سیکھا، ایران کے آتش پرستوں سے کون کون سی چیز اخذ کی، ہندوستان کے جوگیہ کے کن کن اشغال و اعمال کو اپنے طریقہ میں داخل کیا، گویا اسلام کا خود اپنا کوئی سرمایہ کسی باب میں کچھ نہیں ہے، فقہ رومیوں اور ایرانیوں سے لی گئی، تصوف، اشراقیوں اور جوگیوں سے چرایا گیا، ظاہر و باطن کی

تعمیر ان ہی دونوں چیزوں سے ہوتی ہے جب دونوں ہی میں ہمارے اکابر العیاذ باللہ منتحل اور سارق نکلے، تو پھر اپنا ہمارے پاس کیا رہ گیا، قرآن نے ہمیں کیا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا ملا؟ مگر میں کیا کروں، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گیا۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور مرکزی صوفی سلطان المشائخ کا مطالعہ ایک زمانہ سے کر رہا ہوں، اب تک ان کے متعلق ہمیں اس کا بھی ٹھیک طریقہ سے پتہ نہیں چلا کہ وہ ذکر اور مراقبہ کے عام طریقہ کے سوا کسی خاص طریقہ ذکر یا مراقبہ کی بھی تعلیم دیتے تھے، مثلاً فلاں رگ دبائی جائے، فلاں عضو کو فلاں جگہ رکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ چیزیں اگر ملتی بھی ہیں تو اسی قسم کی، مثلاً ذکر ہو رہا تھا کہ مربع طریقہ کی نشست بنا کر یعنی آلتی پالتی مار کر اگر کوئی بیٹھے، اور ذکر کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس طریقہ سے بیٹھ کر ذکر کرنے کی ایک صورت جائز ہے اور ایک ناجائز، جائز صورت کے متعلق الفاظ مبارک یہ ہیں۔

"جائز خلاف نشستن جوگیان است کہ ہر دو قدم زیر ہر دو زانو باشد" (ص ۲۴۴)

ظاہر ہے کہ اُٹھنے بیٹھنے کا معاملہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا، اسی لیے جواز و عدم جواز کے الفاظ کو اولیٰ اور خلاف اولیٰ ہی پر محمول کیا جائیگا ہمیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی بات یعنی بیٹھنے کی ہیئت تک کے متعلق بھی ان کا خیال تھا کہ جوگیہ کی چونکہ وہ نشست ہے، اس لیے مسلمانوں کو یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، انہی بزرگوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے اپنا سارا طریقہ جوگیہ یا اشراقیہ کو دیکھ کر مرتب کیا ہے؛

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کثرت ذکر کا ظاہر ہے بار بار مطالبہ کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اپنے پہلوؤں پر) میں ہر طریقہ سے ذکر کی عام اجازت دی گئی، اب اگر بزرگوں کو کسی خاص طریقہ نشست یا طریقہ ادا وغیرہ سے تجربۃً وہ بات مفید معلوم ہوئی اور لوگوں سے ذکر اسی طریقہ سے کرانے لگے، تو کیا وہ قرآن سے باہر گئے، سچ یہ ہے کہ قرآن نے جسے مطلق چھوڑا ہے آپ اس میں تعیین کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ ۱۲

کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے، پہلے بھی بعض اجزار کا اس کے متعلق ذکر آچکا ہے، کیا تماشے کی بات ہے جس کے تربیت یافتوں کی یہ ذہنیت ہو، اور جس کی مجلس مبارک ہیں، اس حدیث کے متعلق جس میں ہے کہ کوئی مسافر اگر بیابان ٹاپو میں تنہا پڑ جائے، یا ایسی حالت میں کسی کی سواری کا جانور بھاگ جائے، تو ایک صحابی سے نہیں، ابن مسعود، ابن عباس، عقبہ بن غزوان، تین تین صحابیوں سے مروی ہے کہ ایسے وقت میں مسافر کو چاہیے کہ

اعینوا یا عباد اللہ رحمکم اللہ — مدد کرو اے اللہ کے بندو، اللہ آپ پر رحم کرے

یا بعض روایتوں میں ہے۔

یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی۔ — اے اللہ کے بندو، میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔

حصن حصین میں مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی کے حوالہ سے اسے نقل کیا ہے نووی نے کتاب الاذکار میں مسند بزار اور ابن السنی کا بھی حوالہ دیا ہے، محدثین کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تحسین و توثیق کی ہے، اگرچہ بعضوں کو روایت کے بعض راویوں کے متعلق شک بھی ہے، تاہم شراح حدیث میں سے بعض معتبر لوگوں نے لکھا ہے مثلاً نووی ارقام فرماتے ہیں:-

حکی لی بعض شیوخنا الکبار فی العلم انفلتت بہ دابۃ اظنہا بغلۃ وکان یعرف ھذا الحدیث فقالہ فحبسہا اللہ علیہم فی الحال وکنت مرۃ مع جماعۃ فانفلتت بھیمۃ فعجزوا عنہا فقلتہ فوقفت	میرے بعض کبار اساتذہ نے مجھ سے بیان کیا یعنی علم میں جن کا مقام بڑا تھا، انھوں نے بیان کیا کہ ان کا جانور سواری کا چھوٹ پڑا، میں خیال کرتا ہوں کہ خچر تھا، ان بزرگ کو یہ حدیث معلوم تھی، وہی الفاظ انھوں نے دہرائے جو حدیث میں آئے ہیں، معاً جانور وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا خود میں بھی ایک دفعہ لوگوں کے ساتھ تھا کہ جانور چھوٹ پڑا پکڑنے والے عاجز ہو گئے میں نے اس وقت حدیث کے الفاظ کا استعمال کیا

فی الحال بغیر سبب۔ جانور وہیں کھڑا ہو گیا اور کوئی سبب اس کے کھڑے ہونے کا

سوی ھذا الکلام ۔ پیش بھی نہ آیا بجز اس کے کہ حدیث والے الفاظ استعمال کیے گئے تھے

گر باوجود ان تمام باتوں کے آپ اندازہ کیجیے اس ذہنیت کا جو سلطان المشائخ کی صحبت مبارک میں پیدا ہوتی تھی، یعنی اسی "أعینونی یا عباد اللہِ" والی روایت کا ذکر کر کے کوئی خارجی آدمی نہیں، بلکہ مقربین خاص میں جن کا شمار تھا، اور جو از سرتا پا سلطان المشائخ کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا، میری مراد خود جامع ملفوظات امیر حسن علا سنجری سے ہے وہی لکھتے ہیں کہ۔

بندہ عرضداشت کرد کہ این دعا چگونہ است کہ مردمان می خوانند اعینونی یا عباد اللہ رحمکم اللہ"

پوچھنے کی کیا غرض تھی خود ہی لکھتے ہیں

"مقصود بندہ این بود کہ معونت از غیر خدا خواستن چگونہ بود" (فوائد الفواد ص ۱۲۶)

"معونت از غیر خدا خواستن چگونہ بود" بس مجھے صرف اسی فقرہ کی طرف توجہ دلانی ہے، باوجودیکہ دعا حدیث کی ہے، ایسی حدیث بھی نہیں جو موضوع اور بالکلیہ بے سروپا ہو بلکہ گذر چکا کہ محدثین ثقات کا ایک طبقہ اس کی تحسین کرتا ہے، بلکہ اپنے مختلف تجربات سے اس کی تصدیق بھی کرتا ہے، خود طبرانی نے بھی اس حدیث کی روایت کے بعد

وقد جرب ذٰلك اس کا تجربہ بھی کیا گیا ہے

لکھا ہے یوں بھی کسی خاص شخص کو پکارا نہیں جاتا، بلکہ اللہ کا کوئی بندہ ہو، ملائکہ میں ہو، جن میں ہو، انسان میں ہو، کوئی بھی ہو اگر یہاں موجود ہو تو میری مدد کرے، اور پکارا بھی جاتا ہے تو معبود بنا کر نہیں بلکہ عباد اللہ (اللہ کے بندوں) کے الفاظ سے پکارا جاتا ہے رحمکم اللہ (اللہ تم پر رحم کرے)۔ کے الفاظ سے اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کہ ہماری طرح تم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے محتاج ہو، اب اس کے ساتھ اس کو ملا لیجیے کہ قرآن مجید کے

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۔ ہر شخص پر ایک نگران یقیناً ہے۔

اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ۔ تم پر نگران قطعاً ہیں

وغیرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ کچھ فرشتے بھی رہتے ہیں، حدیثوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ملائکہ اطراف ارض میں گھومتے رہتے ہیں، نیز روایتوں کا ایک مجموعہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جن سے ابدال کے نظریہ[1] کی تائید ہوتی ہے، عام طور پر جنہیں رجال الغیب کہتے ہیں اور ان سب کو بھی جانے دیجیے، پکارنے والا تو پکارتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں کوئی ہو تو آکر میری مدد کرے، کون جانتا ہے کہ کسی چلنے پھرنے والے یا جھاڑ جنگل میں کوئی آدمی ہی ہو، جس کے کان میں آواز پہنچ جائے۔ جب عباد اللہ کا لفظ عام ہے تو سب ہی کی اس میں گنجائش ہے، اور شراح حدیث نے عموماً ان سارے احتمالات لکھے بھی ہیں، خود سلطان المشائخ نے امیر حسن علاء کو جو جواب دیا کہ

"دریں عباد اللہ مسلمین ومخلصین مضمر ست"

یعنی اللہ کے نیک اچھے مخلص بندے مقصود ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کا اشارہ ابدال والے رجال الغیب کی طرف ہو، یا یہی بات کہ ادھر اُدھر کوئی اللہ کے اچھے نیک بندے ہوں

---

[1] ہر زمانہ میں طبقہ صالحین کے بعض افراد کو ابدالیت کے مقام سے حق تعالیٰ سرفراز فرماتے ہیں، یہ ایک ایسا خیال ہے، جو سلف سے خلف تک مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس باب میں حضرت انس رضی ابن مسعود، ابو درداء، معاذ بن جبل، عوف بن مالک صحابیوں، اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وعنہن سے حدیث کی کتابوں میں روایتیں بھی نقل کی گئی ہیں، گو محدثین وائمہ نقدان کی سندوں سے مطمئن نہیں ہیں، لیکن شارحین حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کا بطور قدر مشترک جو مفاد ہے، اس کا انکار مشکل ہے، یوں بھی امام بخاری امام شافعی امام احمد بن حنبل جیسے کبار ائمہ حدیث اپنی کتابوں میں اس قسم کے الفاظ کہ فلاں بزرگ کا شمار ابدال میں تھا، یا مسلمانوں کا فلاں طبقہ ابدال کا طبقہ ہے پائے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں چالیس افراد کا مردوں اور چالیس ہی کا عورتوں میں سے اس روحانی خدمت کے لیے انتخاب ہوتا ہے، کوئی ایک ان میں جب مرجاتا ہے تو اسی وقت کسی دوسرے سے اس جگہ کو معمور کر دیا جاتا ہے ابدال کہنے کی یہی وجہ بھی ہے کہ ہمیشہ ایک کی جگہ بطور بدل کے دوسرے کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۲

وہ اس آواز کو سُن کر پہنچ جائیں، بہرحال اس طریقہ سے عباد اللہ کو عون اور مدد کے لیے پکارنا ظاہر ہی کہ ایسی نامحسوس غیبی ہستیوں کا بھی پکارنا نہیں ہی جن کے وجود کا کوئی ثبوت[1] نہ ہو مگر آپ دیکھ رہے ہیں، توحیدی معرفت کے احساس کی نزاکتوں کو دیکھ رہے ہیں، کہ اس میں بھی سلطان المشائخ کے صحبت یافتوں کو "معونت از غیر خدا خواستن" کا شبہ ہوتا ہی۔

اللہ اللہ جس کے حلقۂ اخلاص و صفا میں وحدت کا یہ رنگ پیدا ہوتا تھا، اسی شاہباز فضاء تفرید، و یکہ تاز میدان تجرید پر آج الزام لگایا جا رہا ہی کہ قرآن کے نص محکم

مَا كَانَ اللهُ لبشرٍ ان يؤتيه خدا ایسا نہیں کرتا کہ کسی آدمی کو کتاب اور "حکم" والنبوت

[1] مثلاً اصنامی نظام والے بت پرستوں کا جو حال ہی کہ خود ہی کسی پتھر یا مٹی کے تودہ کو فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ فلاں روح کا تعلق ہو گیا، اور اپنی ساری اُمیدوں آرزوؤں کا ماویٰ ملجا اب اسی پتھر یا تودۂ خاک کو بنا لیتے ہیں، لیکن یہ بات کہ واقعتہً اس روح کا اس پتھر یا تودۂ خاک سے تعلق ہی بھی یا نہیں، حسّاً یا عقلاً یا کسی اور ذریعہ سے ان کو اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا، اس لیے بت پرستی علاوہ اس ناقابل عفو جرم کے جس کا نام شرک ہی یوں بھی وہ ایک بے بنیاد وہم ہی، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان خود تراشیدہ فرضی پتھروں یا خود ساختہ مٹی کے تودوں کے ساتھ کسی زندہ وجود کا جو یہ تعلق مانتے ہیں، آخر اس کی بنیاد کیا ہی۔ جہاں چاہا ایک پتھر رکھ دیا، گویا یہ پتھر ایک قسم کے الٰہ دین الف لیلہ والے کا چراغ ہی کہ جلا نہیں کہ موکلین حاضر ہو گئے۔ یوں ہی جہاں کہیں ذرا چھیل چھال کے کوئی پتھر جما دیا، یا پتھر نہیں مٹی ہی کو پانی میں سان کر کہیں تھوپ دیا، اور روح مخفی کا اس کے ساتھ تعلق ہو گیا، بخلاف خالق تعالیٰ اجل مجدہ کے کہ گو بظاہر حواس سے اس کا وجود بھی مخفی ہی، لیکن کائنات نام ہی ہی ان کی کارفرمایوں کی جلوہ گاہ کا ہر ذرہ اس عالم کا اپنے خالق کے افعال کا صفات کا وجود کا آئینہ بردار ہی، خالق قیوم کے تصور کے بغیر کسی قسم کی مخلوق کا وجود ناقابل تصور ہی، دھوپ کا تصور آفتاب کے بغیر ناممکن ہی، انفس و آفاق اس کے آیات و نشانیاں اور اس کے پتے ہیں اسی لیے وہ علیٰ کل شیءٍ شہید، بکل شیءٍ محیط، ہو معکم اینما کنتم ہی، لیکن تراشیدہ پتھر اور روح جن میں نہ کوئی کسی کا خالق ہی نہ کوئی کسی کا مخلوق، ان دو مخلوقوں میں آخر رشتہ کس بنیاد پر قائم کر لیا جاتا ہی، اور ایسا رشتہ کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے جُدا نہیں ہو سکتا، پتھر کے سامنے کھڑا ہونا گویا اسی روح کے سامنے کھڑا ہونا ہی، اس سے مانگنا اسی مخفی روح سے مانگنا ہی، جو اس حجری عمل تسخیر سے حاضر کی جاتی ہی ۱۲

الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون الناس ۔ — عطا کرے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے نہیں بلکہ میرے بندے تم لوگ بن جاؤ۔

کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے فرمان ربانی

وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ — اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اُسی کو پوجتے ہو۔

کے علی الرغم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی امتیوں کو جن کے نزدیک غیر اللہ کی عبادت انسانیت کی سب سے بڑی تباہی اور جہنم کے ابدی عذاب کا مستحق بناتی ہی، ان ہی لوگوں سے اپنے آگے سجدے کراتا تھا، ان کو بجائے اللہ کے "عباداً لی" (اپنا بندہ بناتا تھا) اور دلیل میں کیا پیش کیا جاتا ہی؟ چند مشتبہ الفاظ یعنی جہاں دست بوسی، پائے بوسی کے الفاظ کی صراحت پائی جاتی ہی، وہیں بعض عبارتوں میں "سر بر زمیں نہادن" کے الفاظ بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، لیکن سوال یہ ہی کہ اس "سر بر زمین نہادن" کا کیا مطلب ہی، کیا واقعۃً لوگ سلطان المشائخ یا شیخ کبیر شکر گنج کے سامنے سجدے کرتے تھے؟ اب میں لوگوں سے کیا کہوں، مختلف زمانوں میں مختلف محاورات چل پڑتے ہیں لغوی معنی ان الفاظ کے اور ہوتے ہیں اور اصطلاحی دوسرے، سارا فتنہ محض اس پر مبنی ہی کہ اُس زمانہ کی جو اصطلاح تھی، جو دستور تھا، اُس سے قطع نظر کرکے حریفوں نے ان الفاظ کے معانی لغت کی کتابوں میں دیکھنے شروع کیے؛ حالانکہ کچھ نہیں تو کم از کم یہ لوگ اسی کو دیکھتے کہ اس فعل کے جواز میں جو دلیل سلطان المشائخ سے منقول ہی، وہ کیا ہی؟ وہی دلیل بتا سکتی تھی کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہی، میر خورد تو عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں سمجھے جا سکتے، وہی یہ لکھنے کے بعد کہ "کاتبِ حروف بخط مبارک سلطان المشائخ نوشتہ دیدہ است" ارقام فرماتے ہیں کہ اس فعل کے جواز کی دلیل یہ ہو سکتی ہی کہ

قال صہیب رأیت علیاً یقبل ید العباس ورجلہ (ص ۳۴۰) — حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت علی کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ

یعنی حضرت علیؓ اپنے چچا عباس کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں کو بھی احتراماً چومتے تھے، اب آپ خود غور کیجیے اس سے کیا ثابت ہوا، صرف یہی نا کہ پاؤں چومنے کے وقت چومنے والے کا سر چونکہ بالکل زمین سے قریب ہو جاتا ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ پاؤں چومنے کی وجہ سے اگر سر کسی کے سامنے اتنا جھک جائے کہ پاؤں سے اور زمین جس پر پاؤں عموماً رکھے رہتے ہیں، قریب ہو جائے۔ تو صہیب کی اس روایت سے اتنے انحناء اور جھکاؤ کا جواز نکلتا ہے، مقصد یہ ہے کہ پائے بوسی کی وجہ سے سر میں اتنا جھکاؤ جو پیدا ہو جاتا ہے کہ قریب قریب سر زمین ہی پر چلا جاتا ہے، اس لیے ایک صورت سجدے کی سی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے چاہیے تو یہی تھا کہ جب غیر اللہ کے سجدے کو اسلام میں حرام کر دیا گیا ہے، پائے بوسی بھی جس میں سجدے کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے، ناجائز ہو جاتی لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے، پائے بوسی کا ثبوت ملتا ہے تو پائے بوسی کے جواز کی ایک صورت نکل آتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اس سے زیادہ تو کوئی اور بات اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتی، پھر کیا ہوا؟ یہی بات کہ لوگ قدم بوسی پر اس زمانہ میں معترض ہوتے تھے کہ اس میں سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، ایک شخص کا قصہ بھی فوائد الفواد میں منقول ہے کہ روم و مصر و شام کی سیاحت کر کے آیا تھا کسی کو قدمبوسی کرتے ہوئے اس حال میں جو اُس نے پایا تو اُس نے منع کیا کہ سجدہ اسلام میں ناجائز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ بذاتِ خود اس طریقہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ لوگ ہاتھ کے سوا قدم چومنے کے لیے بھی میرے سامنے سر جھکائیں، خود سیر الاولیاء میں میر خورد نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"در پیش من کہ روئے بر زمین می آورند من کارہ ام" ص ۳۴۱

اور وہ چاہتے تھے کہ قدم بوسی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ لوگوں کے سر زمین کی طرف چلے جاتے

ہیں، ایک گونہ سجدے کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اس کو منع کر دیں، لیکن ان کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ بھی قدم بوسی سے لوگوں کو منع نہیں فرماتے تھے، اس لیے منع کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، عجب جملہ لکھا ہے کہ

"از دو چیز یکے لازم آید یا تجہیل مشائخ یا تفسیق ایشاں"

یعنی یہ سمجھا جائے کہ شیخ کبیر اس حکم ہی سے ناواقف تھے کہ قدم بوسی جائز نہیں ہے، یا عدم جواز کے علم کے، باوجود شریعت کے حکم کی خلاف ورزی العیاذ باللہ کرتے تھے، جو ظاہر ہے کہ فسق ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت علیؓ کے اس اثر سے بھی ان کو گونہ مدد مل گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ باوجود "کارہ" ہونے کے لوگوں کو انہوں نے اس فعل سے منع نہیں کیا، لوگوں کو فقہاء کا مسلک چونکہ معلوم نہیں ہے، اس لیے سمجھتے ہیں کہ اگر صرف "قدم بوسی" ہی کا مسئلہ تھا حالانکہ قدم بوسی کی وجہ سے سر گویا زمین ہی سے آلگتا ہے، ورنہ آخر قدم بوسی کی صورت ہی کیا ہوگی، کیا جس کے قدم چومنا چاہیگا اس کی ٹانگ اٹھا کر اوپر کر لیگا، مقصود جب اعتراف فضل اور اظہار احترام ہے تو ظاہر ہے کہ چومنے والے ہی کو جھکنا پڑیگا، اور اتنا جھکنا کہ جہاں قدم رکھے ہوئے ہیں، وہیں تک اپنا منہ لیجائے، ایسی صورت میں سر یقیناً زمین سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور گونہ سجدہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے بعض فقہانے علماء، ادبا، صالحین بلکہ سلاطین کی دست بوسی کی اگر اجازت بھی دی ہے تو قدم بوسی کو ناجائز ٹھہرایا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ جب مخلوق کے ہاتھ چومنے کی اجازت دے رہے ہیں تو اسی مخلوق کے پاؤں چومنے میں کیا خرابی ہو سکتی تھی مگر وہی بات کہ قدم بوسی میں سر زمین تک آجاتا ہے، عدم جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے، عالمگیری میں ہے۔

طلب من عالم اوزاهد ان یدفع اليه قدمه ليقبله لا یرخص فيه

کسی عالم یا زاہد سے کوئی استدعا کرے کہ اپنے قدم اس کی طرف بڑھائیں تاکہ وہ ان کو بوسہ دے اس کی اجازت نہیں دی جائیگی۔

حتیٰ کہ اسی انخنا، اور جھکاؤ کی وجہ سے فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلام کرنے کے وقت آدمی کو بالکل سیدھا رہنا چاہیے، بدن یا سر میں کسی قسم کا جھکاؤ نہ پیدا کرنا چاہیے، عالمگیری میں ہے۔

یکرہ الانحناء عند التحیۃ وبہ ورد النہی کذا فی التمرتاشی۔	سلام کے وقت بھی جھکاؤ مکروہ ہے، اس سے منع کیا گیا ہے، التمرتاشی میں مسئلہ یونہی ہے۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی فقہی عبارتوں کی وجہ سے سلطان المشائخ کا دل اس جھکاؤ کو پسند نہیں کرتا تھا جو قدم بوسی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا تھا۔ مگر ان کی یہ قلبی ناپسندیدگی عملی شکل اختیار نہ کر سکی جس کے اسباب اُنہوں نے خود ہی بیان بھی فرما دیے ہیں کہ اپنے اسلاف کی تجہیل یا تفسیق کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ سلطان المشائخ کا یہ فعل یعنی قدم بوسی اور قدم بوسی کے انخناء مفرط کی وجہ سے سر بر زمین نہادن کی جو شکل پیدا ہو جاتی ہے واقع میں یہ جائز ہے یا ناجائز اس کا فیصلہ تو علماء ہی کر سکتے ہیں، فقہ کی عبارت آپ دیکھ چکے، ایک طرف یہ قصہ ہے، دوسری طرف حضرت علی کا یہ اثر امام بخاری کی کتاب الادب المفرد باب (۱۵۴۴) میں ہے اسی باب میں وفد عبد القیس کے ایک رکن الوازع بن عامر سے روایت ہے کہ ہم جب خدمت میں آئے تو آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا بوسہ ہم نے دیا۔ مشکوٰۃ کی کتاب الایمان میں روایت ہے کہ دو یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کی "نو آیات" کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں نو چیزیں جو شریعت موسوی میں ممنوع تھیں، جن میں بجز سبت کے حکم کے اسلام میں بھی ممنوع ہیں ان کا ذکر فرمایا، دونوں یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جواب کو جب سُنا تو حدیث میں اس کے بعد ہے کہ

فقبلا یدیہ ورجلیہ وقالا	پس ان دونوں یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نشہد انک نبی کے دونوں ہاتھوں اور پائے مبارک کو بوسہ دیا اور بولے کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔

آگے اور باتیں ہیں، مجھے یہ کہنا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ والا اثر معلوم نہیں کس کتاب میں ہے لیکن یہ حدیث تو صحاح ستہ کی مشہور حدیثوں میں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی ان یہودیوں نے کی۔

بہرحال اہل علم کا فتویٰ جو کچھ بھی ہو، لیکن میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں، ان لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں جنہوں نے اسی قدم بوسی والی انحنا مفرط والی شکل کو باضابطہ سجدہ بنالیا، اور دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹ دیا کہ سلطان المشائخ کا مذہب تھا کہ مرید پیر کو سجدہ کرسکتا ہے، العیاذ باللہ بات کہاں سے کہاں پہنچا دی گئی۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے بجائے قدم بوسی کے واقعی وہی نماز والا سجدہ کرایا کرتے تھے تو جن فقہا نے ان پر سماع کا الزام لگا کر طرح طرح سے بدنام کیا تھا تاآنکہ بات حکومت تک پہنچی، خود غیاث الدین تغلق کو اپنے شاہی دربار میں مجلس مناظرہ منعقد کرانی پڑی، دونوں طرف کے علماء جمع ہوئے، وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ آج چھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اس مجلس مناظرہ کا شور و غوغا گونج رہا ہے، حالانکہ جو کچھ بھی ہو، سماع وہ بھی بغیر مزامیر والا کیوں کہ گذر چکا کہ مزامیر کو تو خود سلطان المشائخ محرمات میں شمار فرماتے تھے، اس غیر مزامیری سماع کا مسئلہ اتنا اہم تو نہیں تھا، جتنا کہ سجدہ والا مسئلہ سجدہ کا حال کہ غیر اللہ کے سامنے بہ نیت عبادت تو کفر ہی، شرک ہے میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کے کسی فرقہ کو بھی اس کے کفر و شرک ہونے میں اختلاف ہوگا، رہ گیا وہ سجدہ جس میں ساجد اپنی عبدیت اور بندگی اور غایت فقر و تذلل کو نہیں، بلکہ جسے سجدہ کیا جائے یعنی مسجود لہ کے احترام اور عظمت کا اظہار اپنے سجدوں سے کرنا چاہتا ہو، وہی جسے عموماً سجدہ تعظیمی کہتے ہیں، چونکہ کسی دوسرے کی عظمت

یا فضل کا اعتراف جو سجدہ تعظیمی کی روح ہوتی ہی، یہ ناجائز نہیں ہی، اس لیے بظاہر اس سجدہ میں وہ خرابی جو سجدۂ عبادت میں پائی جاتی ہی نہیں پائی جاتی ہی، اسی لیے فقہاء اسلام تعظیمی سجدہ جو غیر اللہ کو کیا جائے اس کو کفر و شرک تو نہیں قرار دیتے، لیکن چونکہ حدیثوں میں آیا ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے بھی صحابہ کو سجدہ کی اجازت نہیں دی، تو ظاہر ہی کہ اور کسی کو کب، اس کی اجازت ہوسکتی ہی خود قرآنی آیت

وَاسْجُدُوا لِلّٰہِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ — اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہی کہ جو اللہ ہی کی عبادت کرتا ہی، اسے چاہیے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرے بہر حال ان ہی وجوہ سے سجدہ تعظیمی کے متعلق فقہاء کا فیصلہ یہ ہی کہ غیر اللہ کے لیے وہ بھی جائز نہیں ہی، عالمگیری میں تو لکھا ہی۔

لا یکفر ولکن یاثم لارتکابہ الکبیرۃ وھو المختار ص ۳۶۹ — غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی جائیگی لیکن گنہگار ٹھہرایا جائیگا اس لیے کہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

جس سے معلوم ہوا کہ مذہب مختار فقہا کا یہی ہی کہ سجدۂ تعظیمی کفر تو نہیں ہی، لیکن کبیرہ گناہ ہی۔

یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہی کہ العیاذ باللہ اگر فی الحقیقت سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے سجدہ کراتے تھے، خواہ تعظیمی ہی سہی، تو فقہ کی کتابوں میں جسے "کبیرہ" قرار دیا گیا ہی اس الزام کو چھوڑ کر غیر مزامیری سماع کا الزام ان پر کیوں لگاتے، اس قسم کے سماع کا مسئلہ اتنا تو سخت نہ تھا، جتنا کہ سجدہ کا مسئلہ، سماع میں تو بہت کچھ گفتگو ہوسکتی تھی، دیگر ائمہ کے سوا غیر مزامیری سماع کی حد تک تو فقہ حنفی میں بھی گنجائش پیدا ہوسکتی تھی، بخاری اور مسلم کی حدیثوں سے اس قسم کے سماع کا جواز پیدا کیا جا سکتا تھا[1] مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت صحابہ کا رجز پڑھنا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ساتھ

---

[1] حتی کہ مشہور عالم حدیث جو اپنی سخت گیری و ظاہریت میں شہرت عام رکھتے ہیں یعنی علامہ ابن حزم جیسی ہستی مزامیری و غیر مزامیری ہر قسم کے غناء کی اباحت و جواز کے مدعی ہیں ۱۲۔

دیتا" البینا ابینا" کے لفظ کو ذرا بلند آواز کے ساتھ ادا فرمانا انجشہ والی روایت، جواری مغنیات کی روایت عبداللہ بن رواحہ سے "ھات من ھنیاتک" وغیرہ وغیرہ بیسیوں صحیح آثار اس کے ثبوت میں پیش ہو سکتے تھے، لیکن سجدہ کے جواز کی کیا صورت تھی، ان کو گرفت کرنی تھی، تو سب سے آسان بات تو یہی تھی خدانخواستہ اگر واقعی ان کے سامنے لوگ سجدے کرتے تھے، تو سلطان المشائخ کے پاس اس کے جواز کی کیا سند ہوتی، نہ کوئی قرآنی آیت، نہ حدیث، نہ فقہ، میرے نزدیک یہ خود دلیل ہے کہ وہ سجدہ ہی نہ تھا بلکہ وہی قدم بوسی کی شکل تھی، جس میں انحناءِ مفرط کا پیدا ہو جانا لازمی ہے، آپ فوائد الفواد اٹھا کر پڑھیے میر حسن علا سنجری عموماً یہی لکھتے ہیں۔

"سعادت پائے بوس بدست آمد" "سعادت پائے بوس حاصل شد"

"بہ سعادت پائے بوس رسید" "دولت پائے بوس حاصل آمدہ"

میں نے یونہی کتاب کھولی اور صفحہ ۱۵۲ صفحہ ۱۵۵ صفحہ ۱۵۶ سب ہی جگہ یہی الفاظ نظر آئے، اگر یہ لوگ سجدہ کرتے تھے تو پھر وہی لکھتے، ہو سکتا ہے کہ اسی کیفیت کی تعبیر کبھی انھوں نے "سر بر زمین آورد" وغیرہ الفاظ سے کی ہو، گو مجھے خیال نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب بھی وہی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے، مجھے تو حضرت والا کے دوستوں اور دشمنوں دونوں سے شکایت ہے، دوست تو اس کے درپے ہیں کہ عیاذاً باللہ ان کی تفسیق کا سامان مہیا کریں، اور دشمن شاید تجہیل کے، درپے ہوں لیکن مسلمانوں نے کابراً عن کابر اباً عن جد مسلسل جن کے صلاح و تقویٰ کی روایتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچائی ہو، کیا یہ مناسب نہ تھا کہ ہم ان اکابر کی تفسیق یا تجہیل، کی جگہ اگر کوئی بات ایسی نظر آئے تو اس کی تاویل کریں، اور میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، یہ تو تاویل نہیں، بلکہ ان شاءاللہ یہی واقعہ ہے اور اسی کی واقعیت پر مجھے اصرار ہے[1]۔

[1] پہلے کسی موقعہ پر ذکر کیا جاچکا ہے کہ سجدۂ تحیت کا رواج بادشاہوں کے سامنے بھی ہندوستان میں اکبر

(بقیہ نمبر ۲۱۲)

حضرت سلطان المشائخ پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہی کہ باوجود ان گراں قدر فتوحات اور "لامحدود آمدنی" کا ذکر کر کے یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہی کہ ان پر حج فرض ہو گیا تھا، اور باوجود فرض ہونے کے اُنھوں نے اعراض کیا یہ صحیح نہیں ہی۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کا "زلزالی عہدِ ابتلا" جب ختم ہو گیا، تو ان پر فتوحات کے دروازے ضرور کھُلے اور خوب کھُلے، لیکن اغنیاء سے جو کچھ لیا جاتا تھا، لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ خود اپنے لیے لیا جاتا تھا، ان کے محبوب رسول (علیہ السلام) کا تو حکم تھا کہ

تؤخذ من اغنیائھم و تقسم علیٰ فقرائھم — لیا جائے امیروں سے اور بانٹا جائے مسلمانوں کے غرباء اور فقراء پر۔

جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی "قاسم" ہونے کی حیثیت سے گذاری، دیوانوں نے سمجھ لیا کہ وہ ان آمدنیوں کے مالک تھے، مالک ہوتے تو چوبیس گھنٹوں میں اپنے لیے "صرف چند پرکالہائے نان و سبزی و کریلۂ تلخ" کی افطاری اور کھچڑی کی سحری، جو کبھی کھائی جاتی تھی اور کبھی یوں ہی واپس کر دی جاتی تھی کہ بہت سے لوگ دکانوں میں اور سڑکوں پر بھوکے پڑے ہیں۔

صرف پنڈالوں اور تقریر کے اسٹیجوں تک غرباء کے حقوق کے محافظوں کو کون سمجھا سکتا ہی کہ جن غریبوں کی صورت دیکھنی بھی تمھیں ناگوار ہو، کاش! تم دیکھتے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ان ہی بزرگوں کے دسترخوان پر ان بیچاروں کو وہ سب کچھ ملتا رہتا تھا جس کے نام سے بھی امراء نے ان کو محروم رکھا تھا، کیا ان بزرگوں کے دسترخوان پر صرف امراء بیٹھتے تھے؟ اب میں کیا بتاؤں سلطان المشائخ ہی ایک شخص کی تصویر ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۱) سے پہلے نہ تھا، بلکہ اکبری عہد میں ایک شرار الناس شرار العلماء کی شرارت تھی، اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا انسداد ہو گیا، جیسا کہ تمام تاریخوں میں لکھا ہی، پھر جب سجدۂ تحیت کا رواج بادشاہوں میں بھی نہ تھا تو فقراء میں کیا ہوتا، لوگوں کو اکبری عہد کے سجدۂ تحیت سے مغالطہ ہوا کہ شاید یہ سجدہ بادشاہوں کے سامنے ہندوستان میں پہلے سے چلا آتا تھا، اور ان ہی کی دیکھا دیکھی جیسے "شاہ" کا لفظ صوفیوں نے اپنے متعلق استعمال کیا اس سجدہ کو بھی اپنے سامنے کرانے لگے ۱۲۔

"مرئے ژندہ پوشے گلیمے سیاہ در بر، و سر بندے رنگیں بر سر" (سیر الاولیا، ص ۱۱۵)

پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔

"درجماعت کندوری[1] (دسترخوان) کشیدہ بودند او آمد سلام کرد در مائدہ (خوان) نشست"

صرف کھانے ہی کی اجازت نہ تھی کہ جو کچھ دسترخوان پر موجود ہو، آزادی کے ساتھ کھا سکتے ہو، بلکہ اس کی بھی کہ لیجانے کی خواہش ہو، تو لے بھی جا سکتے ہو، اسی خستہ حال فقیر ہی کے ذکر میں ہی کہ جب دسترخوان بڑھایا جا چکا تو سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ

"بعد فراغ طعام او را ندیدم پرسیدم کہ آں درویش چیزے خورد"

سُنیے نظار دسترخواں کیا جواب دیتے ہیں:-

"گفتند چہار نان و قدرے شوربا در کاسۂ چوبیں انداخت و پیشِ خانقاہ مقابل بلندی بود بہ نشست و نان بخورد و رفت" (ص ۱۱)

یہ ایک جزئی واقعہ ہی، اسی سے آپ کو ان بزرگوں کے دسترخوان کا قانون معلوم ہو سکتا ہی کہ کس کس قسم کے لوگوں کو اس "خوانِ یغما" پر بیٹھنے کی اجازت تھی، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہی، کہ شناسائی کی بھی ضرورت نہ تھی اور جن کا حال یہ ہو، جیسا کہ میر حسن علاء نے فوائد الفواد میں نقل کیا ہی کہ

"دولت پائے بوس بدست آمد طعام پیش آوردند، خوردن گرفتند"

کھانا شروع ہو گیا، اس وقت سلطان المشائخ ایک قصہ کسی بزرگ کا ان الفاظ میں بیان فرمانے لگے۔

"بزرگے گفتہ است کہ خلق پیشِ من طعام می خورند من آں طعام را در حلق خود یابم یعنی گوئی آں طعام من می خورم" (ص ۷۷)

---

[1] اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار میں شادیوں میں رواج "کندوری" کا ہی، لوگ عموماً اس کو ہندوؤں سے ماخوذ کوئی رواج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ترکی لفظ ہی معنی دسترخوان ہیں۔ جو کھانا برادری کو کھلایا جاتا ہی اس کو کندوری کہتے ہیں۔

ظاہر ہی کہ اگر کسی بزرگ کا یہ حال ہوگا، تو خود کہنے والا اس قصّہ کو اپنے کسی تجربہ کی بنیاد پر اس وقت دہرا رہا ہوگا، جب اس کے دسترخوان میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

آج جن میزوں پر الوانِ نعمت کے لقموں کے ساتھ غریبوں کا دُکھڑا رو دیا جاتا ہی، گویا یہ بھی ایک قسم کا حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہی، ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیہ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا، جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے، خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا، علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا؛ لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا، جس میں اسے بھی مالگذاری داخل کرنی پڑتی تھی، اسی بادشاہ کے ذکر میں طبا طبائی نے لکھا ہی۔

"شیخ نظام الدین معروف باولیاء درزمانِ او (علاء الدین) بود اگرچہ سلطان در ظاہر باشیخ ملاقات نمی کرد، امابارسال رسل ورسائل وتحائف وہدایا رسم اخلاق می سپرد" (ص ۱۱۹)

علاء الدین کو جتنا بھی بے شعور قرار دیا جائے لیکن آخر دور والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہی تو کیا اتنے قریب سے بھی اپنی فوجی قوت کے حقیقی مخزن کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک دلیل ہی کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی فوجی قوت نے غیر معمولی طور پر جو اہمیت حاصل کرلی تھی، اس کی تہ میں حضرت سلطان المشائخ کے توحیدی جوش و خروش کا زور چھپا ہوا تھا، خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غرباء فقراء تک ان کا حصّہ پہنچایا جاتا تھا، اور یہی مطلب ہی، اس مشہور فقرہ کا کہ "نان صوفی سبیل ست" (فوائد الفواد ص ۹۵) یعنی راستوں پر پانی پلانے کی جو سبیلیں لوگ کھولتے ہیں، اور ہر آنے جانے والے کو اختیار ہی کہ بغیر کسی معاوضہ کے پانی

پیسے، صوفیہ کے پاس جو آمدنی آتی ہی، اُس کا بھی یہی حال ہی، فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالہ سے بھی یہ فقرہ نقل کیا گیا ہی، خود سلطان جی نے وفات سے پہلے حکم دیا کہ جو کچھ غلہ ساز و سامان میری خانقاہ میں ہی، اُسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور وفات ہی کے وقت نہیں، یوں بھی عام دستور ساری زندگی میں یہی رہا کہ جو کچھ آمدنی ہفتہ بھر میں ہوتی، وہ تقسیم ہوتی رہتی تھی اور

درہر جمعہ تجرید فرمودے و حجرہا و انبار خانہا خالی کنانیدے چنانکہ جاروب می کردند بعدہ در مسجد جمعہ رفتے"

میر خورد نے لکھا ہی کہ اگر کسی دن اتفاق سے غیر معمولی آمدنی آجاتی یعنی

وقتے اگر فتوحے گراں رسیدے گریہ بیش تر کردے و جہد بیش تر فرمودے کہ زود تر تفرقہ (جلد تقسیم کرو)

کنید و ساعۃً فساعۃً کساں می فرستاد کہ تفرقہ کردند؟"

گویا مسلسل آدمی پر آدمی بھیجتے چلے جاتے پوچھتے کہ سب خرچ ہوگیا۔ (تھوڑی تھوڑی دیر سے آدمیوں ۱۲ — تقسیم ۱۲)

چوں می شنیدند کہ درحال قسمت کردند و بمحتاجاں رسانیدند خاطر مبارک قرار گرفتے (ص ۱۳۱)

میر خورد نے یہ بھی لکھا ہی کہ علاوہ دستر خوانی طعام کے سلطان جی کا قاعدہ تھا کہ افطار اور نماز مغرب کے بعد بالا خانہ پر تشریف لے جاتے، مغرب اور عشاء کے وقت، ہر قسم کے لوگوں کو آنے کی اجازت تھی، اس وقت بھی

"از ہر جنس میوہائے، خشک، و تر و ماکولات و مشروبات لطیف و لذیذ پیش می آوردند

آں عزیزاں تناول می کردند و ایشاں را دلداری می فرمود، و از عالم ہر یکے پرسش می کرد"

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ معاملہ صرف واقعی کھلانے پلانے ہی کی حد تک محدود تھا، خدا ہی جانتا ہی کہ کتنے غریبوں کو کپڑے، لباس، جوتے اور دوسری ضرورت کی چیزیں ملتی رہتی تھیں، میر خورد نے ایک موقعہ پر لکھا ہی

"آئندہ و روندہ از غریب و شہری ہر کہ بیامدے و سعادت پائے بوس حاصل کردے

ہیچ کس را محروم نگذاشتے از جامہ و جیتل و تحف و ہدایا کہ از عالم غیب رسیدے ہمہ

بمصرف رسانیدے وہر کہ آمدے بہر وقت کہ آمدے توقف نہ نمودے در حسال

پیش می فرمودند"

یعنی ملنے کے لیے جو بھی جس وقت آتا حکم تھا کہ فوراً اُس کو خدمتِ اقدس تک پہنچا دیا جائے
میر نے لکھا ہی کہ ایک دن سلطان المشائخ دوپہر کو قیلولہ فرما رہے ہیں، کوئی حاجتمند کسی ضرورت سے آیا
اخی مبارک حضرت کے خادم نے اسکو ٹال دیا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے ہیں، ادھر یہ واقعہ ہوا اور دوسری طرف نیند میں سلطان جی شیخ کبیر گنج شکر

اگر در خانہ چیزے نیست بقدر وسع حسن رعایت آئندہ واجب است ایں کجا آمدہ

ست کہ چنیں خستہ دل را باز گردانید"

یعنی آنے والوں کے ساتھ برتاؤ تو اچھا ہونا چاہیے، نیند سے چونک پڑے، اخی مبارک بلائے
گئے، پوچھا کہ کوئی آیا تھا، بولے کہ ہاں میں نے حضرت کے آرام کا خیال کر کے واپس کر دیا
میر نے لکھا ہی۔

"سلطان المشائخ بر و تفت کرد (گرم ہوئے) کہ خدمت شیخ المشائخ را در غضب دیدہ ام مرا عتاب می کرد"

اسی کے بعد عام حکم ہو گیا تھا کہ میں جس حال میں بھی رہوں آنے والوں کی فوراً خبر ہونی چاہیے
"اگر در قیلولہ باشم مرا خبر کنی" قیلولہ سے اُٹھنے کے بعد اسی لیے عام عادت یہ تھی کہ دو سوال کرتے
"یکے آں کہ سایہ گشت" یعنی زوال ہو گیا، ظہر کی نماز کے متعلق سوال تھا، اور دوسرا یہ کہ "آئندہ
آمدہ ست نباید کہ منتظر باشد" (ص ۱۲۹)

فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ قصہ میر حسن علاء نے نقل کیا ہی، کہ

در بغداد درویشے بود کہ ہر روز یک ہزار دوست کاسہ در مائدہ او خرچ شدے و اورا

ہیژدہ مطبخ بود" ص ۱۱۸

مگر اٹھارہ باورچی خانوں والے خود ان درویش صاحب کا کیا حال تھا جن کے یہاں سے
اتنا کھانا پک پک کر لوگوں میں تقسیم ہوتا تھا، اسی کے بعد ہی کہ ایک دن لوگوں سے درویش
صاحب نے پوچھا کہ کوئی کھانے والا رہ تو نہیں گیا، نظم کرنے والوں نے کہا کہ

"خیر ما ہمہ را یاد می کنم وہمہ را طعام می دہم"

درویش صاحب بار بار یہی پوچھے جاتے تھے کہ کسی کو فراموش تو نہیں کیا گیا ہے، ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ "ملک کسے را فراموش نمی کنیم ہمہ را وقت طعام حاضر کنیم" آخر میں اُنھوں نے کہا کہ "امروز سہ روز است کہ مرا طعام نداده اید" وجہ یہ تھی کہ "مطبخ بسیار بود مطبخیاں می دانستند کہ از دیگر مطبخ رسیده باشد" حقیقت جب معلوم ہوئی تو لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا،

اور خیر یہ تو ایک قصہ ہے، معلوم نہیں بغداد کے کس بزرگ کا ہے، لیکن یہ واقعہ تو آپ کو ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں ملیگا کہ جلال الدین خلجی کے عہد میں مولہؔ[1] نامی دلّی میں ایک درویش تھے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ ان کی خانقاہ میں

"ہزار من میده و پانصد من مسلوخ (گوشت بنا بنایا) و سہ صد من شکر خرچ یومی شیخ بود کہ در لنگر بکار می رفت" (ص ۱۷۰)

اگر من سے وہی چالیس سیر والا ہندستانی من مراد ہے، اور غالباً وہی مراد ہے بھی کہ اور جہاں کہیں بھی من کا لفظ اس زمانہ کی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے اُس سے وہی ہندوستانی من مقصود ہے، سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں ہزار ہزار من آٹے کی روٹیوں اور پان پان سو من گوشت کے روزانہ کھانے والوں کی تعداد کیا ہوگی، اور واقعہ تو یہ ہے کہ بجائے خود یہ اس اولوالعزمی کی دلیل ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر پائی جاتی تھی؛

[1] ظفر الوالہ جو گجرات کی عربی زبان میں ایک مبسوط تاریخ ہے اس میں اس لفظ "مولہ" کا تلفظ درج کرتے ہوئے لکھا ہے، بتشدید اللام المفتوحہ ہے یعنی "مولّہ" اس کا صحیح تلفظ ہے، اس میں شیخ مولہ کے متعلق لکھا ہے کہ کان سیدی مولہ مع سعۃ تصرفہ یقتصر فی الملبوس علی رداء من قطن وازار وفی المأکول علی قرص خبز من دقیق الارز وقلیل الادم من جنس البقول المحب کثیر الریاضۃ والمجاہدۃ لا زوجۃ لہ ولا غلام یخدمہ ولا یقبل الفتوح ص ۷۶۶ ج ۲ یعنی سیدی مولّہ ان تصرفات کے باوجود خود سادہ لباس رکھتے تھے، ایک سوتی چادر ایک لنگی، کھانے میں چاول کی روٹی کسی ترکاری کے ساتھ جس میں گوشت وغیرہ کچھ نہ ہوتا؛ مجاہدہ اور ریاضت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ ان کی نہ بیوی تھی نہ کوئی غلام خدمت کرنے والا، لوگوں سے نذر نذور فتوحات بھی نہیں لیتے تھے پھر یہ خرچ کہاں سے مہیا ہوتا تھا؟

اللہ اللہ ہم آج جس چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے، حکومت نہیں، بلکہ مسلمانوں کے عام افراد اسے انجام دیتے تھے، آخر روزانہ اتنی بڑی مقدار میں کھانا پکوانا اور کھلانا بغیر کسی معمولی سلیقہ نظم کے ممکن ہے؟ لیکن قومیں جب زندہ ہوتی ہیں، تو ان پر ایسی باتیں بلکہ ان سے بھی عجیب تر باتیں آسان ہو جاتی ہیں[1]۔ اور جب مُردنی چھا جاتی ہے، تو دو آدمی کے کھانے پینے کا انتظام بھی دشوار ہو جاتا ہے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ رفتہ رفتہ جب سیدی مولہ کے اس "خوانِ یغما" کی خبر بادشاہِ وقت (جلال الدین خلجی) کے کانوں تک پہنچی تو خود اسے بھی تعجب ہوا، اور شاید کچھ خطرہ بھی، آخر

"شبے بہ لباس ناشناس در خانقاہ او رفتہ تصرف او را انچہ شنیدہ بود زیادہ یافت"

---

[1] مآثر الامراء میں الہ وردی خاں ایک جہانگیری امیر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے شکاروں کو گھیرنے اور پھنسانے کے لیے ایک خاص قسم کا جال بنوایا تھا، مآثر الامراء میں اس جال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ "دامے ست درکمال استواری بارہشتاد شتر" ایک جال تھا اور اسی اونٹوں پر لد کر شکار گاہ پہنچتا تھا، لکھا ہے کہ طول دہ ہزار ذرعہ بادشاہی وارتفاع شش" اللہ اکبر دس ہزار گز بادشاہی طوالت ملاحظہ فرمایئے۔ اسّی اونٹوں پر اگر جاتا تھا تو کیا تعجب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ٹکڑوں میں منقسم تھا جب اس سے شکار کا کام لینا چاہتے تو "بساں سراپردہ بہ ستونہا سترگ برپا کنند وانواع سباع (درندے) و وحوش درآں گرد آوردہ صید نمایند" ص ۲۵۸ ج ا۔ گویا وہ سارے جانور جو اس جال کے احاطہ میں آجاتے تھے خود بخود شکار ہو جاتے تھے میں نے یہ اس لیے نقل کیا ہے کہ شکار جو صرف دل بہلانے کی ایک چیز ہے، لیکن اتنی غیر اہم چیزیں بھی زندگی کے دنوں میں قوموں سے کیسے عجیب کارنامے صادر کرا لیتی ہیں، سیر المتاخرین وغیرہ میں اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے جشن منانے کا حکم دیا حسب دستور بارگاہ شاہی نصب ہوا جس میں "دوازدہ ہزار کس در سایہ آں تواند گنجید" یعنی دس بارہ ہزار آدمی کی گنجائش اس بارگاہ میں تھی، اتفاق سے اس میں آگ لگ گئی لکھا ہے کہ "اندازہ ایں نقصان ہیچ محاسبے نتواند یافت" مگر قلوب میں جب قوت اور زندگی رہتی ہے تو جس نقصان کا حساب کوئی محاسب نہیں کر سکتا تھا، اس کی پروا بھی نہیں ہوئی، اسی کتاب میں ہے کہ "بعد اطفائے التہاب آتش مذکور (یعنی آگ کے بجھ جانے کے بعد) حکم شد کہ بجہت بزم شرف کہ نزدیک رسیدہ بود از سر نو بارگاہ والا درست گردد در اندک روز بارگاہِ فلک اشتباہ صورت انجام یافت" (سیر المتاخرین ج ا ص ۲۰۳)
کسی جگہ میں نے شیخ محدث کے حوالہ سے بنگالی بادشاہ غیاث الدین خلجی کے متعلق نقل کیا ہے کہ بنگال میں اتنا بڑا پل بادشاہ نے بنوایا تھا جس پر بارہ دن تک لوگ چلتے رہتے تھے ۱۲۔

مُلّا عبد القادر نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ سیدی مولہ کا دسترخوان سب کے لیے کشادہ تھا، عامی اور خاصی کی کوئی خصوصیت نہ تھی

"مردم نامی وسرداران معتبر[1] وسائر خواص وعوام پیوستہ ملازم خانقاہ او بودندے"

شیخ محدث نے بھی اخبار الاخیار میں سیدی مولہ کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے کہ

"اتباع ومریداں بسیار داشت وبمردم طعام می داد" ص ۷۳

جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنی مقدار و وسعت کے لحاظ سے سیدی مولہ کا دسترخوان جو کچھ بھی خصوصیت رکھتا ہو، لیکن خانقاہی لنگر خانوں کے دروازے عموماً ہر کہ و مہ خاص و عام کے لیے کھلے رہتے تھے، اس میں ان کی کوئی خصوصیت نہ تھی، اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ فخر الدین نامی ایک بزرگ تھے ملا عبد القادر ہی نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سماع کے بعد دستور تھا کہ

"سفرہ (دسترخوان) می کشیدند وشاہ و درویش گرد او برابر بود"

---

[1] ان سرداران معتبر میں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ "ملوک وامرا معزول بلبنی" بھی شریک رہتے تھے، غالباً ان ہی لوگوں کی شرکت جلال الدین خلجی کی غلط فہمی کا باعث ہوئی اس کو خطرہ ہوا کہ شاید سیدی مولہ کے اس خانقاہی کاروبار کے پیچھے کوئی سیاسی سازش تو پوشیدہ نہیں ہے، خود جا کر خانقاہ اور لنگر خانے کی جو حالت اس نے دیکھی، اس سے بدگمانی میں اور اضافہ ہو گیا، بالآخر اس نے سیدی مولہ کو پا بزنجیر دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ پوچھ گچھ ہوئی، شیخ نے قسمیں کھا کر باور کرایا کہ میری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔ دربار کے امرا اور علما سبھوں نے سلطان کو سمجھایا اور شیخ کی طرف سے صفائی پیش کی، لیکن اس کے دل سے کانٹا نہ نکلا، قاضیوں سے اس نے چاہا کہ شیخ پر کوئی شرعی الزام قائم کریں، لیکن بالاتفاق سبھوں نے اظہار کیا کہ ہمارے نزدیک شیخ پر کوئی شرعی الزام عائد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے بعض علما بادشاہ کے زیر عتاب بھی ہوئے مجبور ہو کر جلال الدین نے اس زمانہ کے بعض آزاد منش قلندروں کو جنہیں "حیدریہ" کہتے تھے شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا، اور ان ہی بدبختوں کے ہاتھ شیخ کو شہید ہونا پڑا، بدائونی شیخ محدث دونوں نے لکھا ہے کہ جس دن سیدی مولہ شہید کیے گئے سخت آندھی آئی طوفان کا سماں قائم ہو گیا، شیخ محدث کا تو بیان ہے کہ گویا قیامت برپا شد، عالم تاریک گشت" بدائونی کا بیان ہے کہ قحطے چناں واقع شد کہ ہندواں از غائت گرسنگی ومخمصہ جاعہ جاعہ دستہائے یک دیگر را گرفتہ خود را در آب جون انداختہ (باقی بر صفحہ ۲۲۰)

انتہا اس عمومیت کی یہ تھی کہ بیرم خان خاناں جو اس زمانہ میں وزیر ہی نہیں بلکہ مدار کل اور حقیقی معنوں میں شاہی حکمراں تھا، لکھا ہی کہ

"بیرم خاں نماز جمعہ اکثر در مسجد ادا می گذارد ...... و در تناول طعام و سائر آداب مجلس ہیچ امتیاز از سائر الناس نداشت" (ص ۸ ج ۳)

غربت و امارت کا یہ سنگم، یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امرا و غربا، دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس نظم سے غریب حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں واقعہ یہ ہی کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہوگا، جہاں

توخذ من اغنیا ئھم و تقسم علی فقرائھم	امیروں سے ان کے لیا جائے اور غریبوں پر بانٹ دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا خصوصاً جن بزرگوں کو کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یوں سمجھیے کہ غربا کی قسمت جاگ اٹھتی تھی، گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں کے آغاز میں ایک مشہور ہستی حضرت شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جن کا اصلی نام سید محمد سعید تھا، لیکن عوام میں آپ کا یہ عرفی ہی نام مشہور ہوگیا، اور اب تک اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں، ہمارے مخدوم و مکرم جناب مولوی غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل انبالہ کے نام کا انتساب

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۹) طعمۂ نہنگ فنا می شدند و مسلمانان نیز بآتش گرسنگی سوختہ غریق بحر عدم بودند" عام خیال یہی تھا کہ شیخ مولہ کے خونِ ناحق کا یہ اثر ہی، لیکن بقول عبدالقادر" بریں طور چیزہا مدار ہم نتواں نہاد کہ شائد از جملہ اتفاقیات باشد" بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہی کہ قتل ہونے سے چند دن پیشتر سیدی مولہ کی زبان سے یہ اشعار سُنے جاتے تھے۔

در مطبخ عشق جز نکو را نکشند — لاغر صفتاں زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مردار بود ہر آنچہ او را نکشند

آپ ہی کے اسم گرامی کی طرف ہے۔

یہ شاہ بھیک قدس سرہٗ حضرت شاہ ابوالمعالی (انبیٹھا) ضلع سہارنپور کے ارشد خلفا میں ہیں، بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جب معز الدین جہاندار شاہ دلّی کے تخت پر قابض ہو گیا، تو اُس زمانہ کا ایک امیر ظفر خاں حضرت سے مشورہ گیر ہوا کہ جہاندار شاہ کے مقابلہ میں فرخ سیر جو اٹھ کھڑا ہوا ہے، میں کس کا ساتھ دوں، آپ نے فرخ سیر کی رفاقت کا مشورہ دیا، وہ اپنی فوج کے ساتھ فرخ سیر سے جا ملا، جیسا کہ معلوم ہے قسمت نے دلّی کے تخت کا فیصلہ فرخ سیر کے لیے کیا، ظفر خاں پنج ہزاری بن آئی اور نواب روشن الدولہ ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، سہ ہزاری کا منصب بخشی گیری کا عہدہ فرخ سیر کی طرف سے ان کو عطا ہوا، چونکہ یہ کامیابی حضرت والا کے مشورہ کی راہ سے روشن الدولہ کو حاصل ہوئی تھی، قدرتاً وہ شاہ بھیک صاحب کے انتہائی عقیدت کیشوں میں تھا، اور نواب روشن الدولہ کی وجہ سے فرخ سیر خود اور اُس کے دربار کے امرا حضرت کے معتقدوں میں شریک ہو گئے، ان کے تذکرہ میں جس کا نام "ثمرة الفوائد" ہے، اور اُن کے براہِ راست مرید مولوی محمد لطف اللہ مرحوم کی تصنیف ہے، اس کتاب میں حضرت شاہ بھیک کے داد و دہش کے قصّوں کی ایک طویل فہرست درج ہے، مولوی لطف اللہ نے لکھا ہے، حضرت کی خانقاہ میں ذاکرین و شاغلین کی تعداد "پانصد کس در اوائل حال بدائرہ (خانقاہ) شریف ...... بیاد الٰہی مشغول می بودند" ان کے سوا "ہمیں قدر مجمع صادر و وارد ہر روز تا ہزار کس بودہ باشد" ص ۱۷۲۔ اور دونوں وقت انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو حضرت کی خانقاہ سے کھانا پہنچایا جاتا تھا۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ روشن الدولہ خود حضرت والا کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ حضرت کی خانقاہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائے، اپنے ساتھ "مبلغ ہفتاد ہزار روپیہ بجہت روضہ شریفہ آوردہ" اور عرض گذار ہوا کہ "ایں قدر زر ہمراہ آوردہ انچہ دیگر

مطلوب خواہد باشد طلبیدہ می شود"

شاہ بھیک نے روشن الدولہ سے یہ سُن کر فرمایا کہ

بالفعل مبلغ را یک جا جمع دارند شما آرام کنید بوقت سہ پہر تنبیہ آں نمودہ معماراں را

طلبیدہ شروع عمارت کردہ خواہد شد"

روشن الدولہ ستر ہزار کی ان تھیلیوں کو حضرت کے پاس چھوڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف آرام کے لیے چلا گیا، ادھر شاہ بھیک صاحب نے

"درویشاں را طلبیدہ زرِ مذکور خانہ بخانہ بیوہ زناں و محتاجاں و مسکیناں ساکنانِ انبالہ و تھانیسرو سرہند و پانی پت وغیرہ تقسیم نمودند کہ یک حبہ باقی نگذاشتند" ص ۱۱۹

روشن الدولہ بیچارہ سہ پہر کے وقت حاضر ہوتا ہے، اور آپ فرماتے ہیں۔

"بنارہ خانقاہ راچہ قبولیت شدہ کہ بچندیں گوشہ نشیناں و محتاجاں رسیدہ ......

ما فقیر را عمارت عالی چہ کار است"

روشن الدولہ نے یہ سُن کر عرض کیا "بسیار مستحسن و بجاشد خزانہ دیگر ہم موجود است"

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

"روزے قاصد مرسلہ بادشاہ محمد فرخ سیر و نواب روشن الدولہ و نواب عبداللہ خاں مع عرائض و ہندیات مبلغ سہ لک روپیہ رسید"

شاہ صاحب کو خبر ہوئی، ارشاد ہوا کہ حسب استحقاق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے

"بموجب امر عالی قصبہ پانی پت و رام پور و کرنال و انبیٹھ و گنگوہ وغیرہ قسمت نمودہ" ص ۱۱۶

اسی میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ بھیک کا

"معمول چنان بود کہ در سفر و حضر تا نصف اللیل دروازہ باز می ماند و سائلے کہ می آمد محروم نمی رفت از نقد و جنس و طعام و پارچہ ہر چہ میسر و موجود بودے انعام می فرمودے" ص ۱۱۵

اس کتاب میں آپ کے داد و دہش اور عام بذل و کرم کے جو نقشے درج ہیں اگر ان کو جمع

کیا جائے تو ایک مستقل مضمون بن سکتا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادیاں حضرت نے کرائیں، کتنوں کو ان امیروں کے پاس نوکریاں دلوائیں، کتنے مظلوموں کو ظالم حکام کے پنجوں سے اپنے اثر سے کام لے کر آپ نے خلاصی دلوائی جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کسی ایک شخص کا حال نہ تھا، ان بزرگوں کے دیگر مشاغل و مکاسب میں ایک اہم چیز یہ بھی تھی، ان ہی دنوں میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شیخ سیف الدین بن عروۃ الوثقیٰ شیخ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا قیام عموماً دلی میں رہتا تھا لکھا ہے کہ

"محمد اورنگ زیب و شاہزادگان و امراء راجدمت ایشاں ارادتے پیدا شد در امر معروف و نہی منکر کوشش بلیغ می داشتند"

لیکن امراء کی ارادت سے جو نفع اُٹھایا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ

یک ہزار و چہار صد کس را موافق رغبت و فرمائش ہر یک از خانقاہ ایشاں ہر روز دو وقت طعام عنایت می شد" (مناقب العارفین)

ہر شخص کی رغبت اور فرمائش کے مطابق ہزار ہزار چودہ چودہ سو آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلانا کوئی معمولی بات ہے، لیکن وہ بیٹھے اسی لیے تھے کہ منجملہ دیگر مہمات کے ایک مہم ان غریبوں تک روزی پہنچانے میں ذریعہ بننا بھی تھا۔

ایک دلچسپ کیہیے یا دل دوز واقعہ اسی سلسلہ کا یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے ایک بزرگ جن کا عرفی اور مشہور نام شاہ بولن تھا، سہوارہ کے رہنے والے تھے، صاحب مناقب العارفین جو ان کے دیکھنے والوں میں ہیں انہوں نے لکھا ہے

"در خانقاہ خود وارد و صادر را طعام می دادند، گویا لنگر خانہ وے حضرت سفرہ عام بود چہ دشمن و چہ دوست، دریغ نمی داشتند"

اتفاق سے اسی زمانہ میں غدر کا فتنہ ہندوستان میں شروع ہوا لیکن اس زمانہ میں بھی

شاہ بولن کا لنگر خانہ جاری رہا اسی کتاب میں ہے

"در ایام غدر ہندی در لنگر خانہ وے حضرت دوست و دشمن می آمدند و طعام می خوردند و می رفتند"

انگریزی حکومت اور اس کے ارباب حل و عقد اسلامی فقراء کے اس طرز عمل سے واقف نہ تھے، ان تک یہ خبر پہنچی کہ شاہ بولن نامی فقیر سرکار کے باغیوں کو کھانا کھلاتا ہے، حالانکہ ان بیچارے کو کیا خبر کون باغی ہے اور کون غیر باغی بقول صاحب مناقب "وے حضرت با کسے حاجتے و کارے نداشتند" لیکن حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ امیروں سے بے نیاز ہو کر مفت غریبوں میں کھانا بلا وجہ تقسیم کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، شاہ صاحب پر بھی بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا، اور

"بجرم آں کہ دشمنان حاکم را مدارات می کردند و طعام می دادند . . . باعث گرفتاری و رسانیدن وے حضرت در جزیرہ مذکور (انڈمان) شدہ بود۔ (مناقب ص ۵۴۷)

زندگی کا آخری حصہ عبور دریائے شور کی اسی سزا کی وجہ سے انڈمان ہی میں گذرا، اور

"در جزیرہ انڈمان مدفون گشتند" ص ۱۱

اپنے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے نمونے تکسب[1] المعدوم وتحمل الکل وتعین الاخرق" کی اتباع میں ان کو جو لذت ملتی تھی، درد نا آشنا قلوب اس کی حلاوتوں کو کیا محسوس کر سکتے ہیں، ملا عبد القادر نے شنیدہ نہیں بلکہ اپنی یہ دیدہ شہادت شیخ عزیز اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق نقل کی ہے، کہ ان کا عام حال یہ تھا۔

[1] یہ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں کا وہ مشہور فقرہ ہے جسے خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین علیہا السلام نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اس وقت فرمایا تھا جب غار حرا سے آپ پہلی دفعہ تشریف لائے۔ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جن مشاغل میں گذری تھی گویا اس کا اظہار تھا مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ناداروں کو کموا دیتے ہیں، دوسروں کا بار خود برداشت کرتے ہیں جو اپنا کام اچھی طرح انجام نہیں کر سکتے تھے ان کی مدد فرماتے ہیں، صوفیۂ کرام میں عبادت کے اس طریقہ کو یعنی برادرش

(باقی صفحہ ۲۲۵)

از جہت شفاعت ہر فقیرے بیچارۂ کہ رجوع باو کردے ہر چند در اعتکاف اربعین ہم بودے اگرچہ بخانہ بیگانہ از دین بائستے رفت مسافت بعیدہ را پیادہ طے می نمود و بعد از انجاح حاجت آں محتاج باز بحجرہ اعتکاف رفتہ مشغول می شد۔

جو کوئی محتاج بے وسیلہ آدمی ان کے پاس سفارش کے لیے حاضر ہوتا، شیخ خواہ چلّہ ہی میں کیوں نہ بیٹھے ہوں اور کسی ایسے شخص کے پاس ہی سفارش نہ کرنی پڑتی ہو، جو دین سے بیگانہ ہوتا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے شیخ پیدل اس شخص کے گھر جاتے مکان اس کا جتنے فاصلہ پر بھی ہو، ضرورت مند کی حاجت جب پوری ہو جاتی تب پھر چلّہ کے حجرہ میں واپس ہو کر اپنے اشغال میں مشغول ہو جاتے۔

ملّا صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ سفارش کے لیے چلّہ کے اعتکاف سے باہر ہونے کو چلّہ کشی کے منافی نہیں خیال کرتے تھے ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

گویا شکستے در اعتکاف واقع نہ شد

گویا سمجھتے تھے کہ ان کے اعتکاف کا تسلسل اس سے نہیں ٹوٹتا تھا۔

واللہ اعلم اعتکاف کو پھر نئے سرے سے شروع کرتے تھے، یا نفلی اعتکاف ہونے کی وجہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴) کار اُمیدوار" کو جو اہمیت حاصل تھی، یہ کسی خاص بزرگ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کو ان بزرگوں کے حالات میں بکثرت اس کی مثالیں ملینگی، ان کا امراء اور سلاطین پر جو اثر تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشکل ہی سے ان کی سفارش رد ہو سکتی تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار رؤسا طریق میں ہے، حلب کا بادشاہ الملک الظاہر بامر اللہ حضرت کے عقیدتمندوں میں تھا فتوحات میں ایک موقع پر شیخ نے لکھا ہے۔

لقد کلمت الملک الظاہر بامر اللہ صاحب حلب فی حوائج کثیرۃ فقضاہا لی فی یوم واحد مائۃ حاجۃ و ثمانیۃ عشر حاجۃ للناس ولو کان عندی فی ذلک الیوم اکثر من ذلک لقضاہ لطیب النفس (ج ۳، ص ۱۹۶)

میں نے حلب کے بادشاہ ملک ظاہر بامر اللہ سے مختلف امور کے متعلق سفارش کی بادشاہ نے میرے کہنے سے ایک سو اٹھارہ حاجتیں لوگوں کی ایک دن میں پوری کیں، اور اس وقت اگر میرے پاس کچھ اور ضرورتیں ہوتیں تو اسے بھی بخوشی وہ پوری کرتا۔

اس قسم کے اربعینات میں وہ اس لیے باہر نکلنے کو جائز سمجھتے تھے، خیر یہ تو فقہ اور تصوف کا علمی مسئلہ ہے، امام محمد وغیرہ کی جو رائے نفلی اعتکاف کے متعلق ہے اس کے لحاظ سے گنجائش بھی پیدا ہوتی ہے مجھے اس وقت ان بزرگوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرنا ہے، قومی ہمدردیوں کے مدعیوں کے لیے اس میں کتنی بصیرتیں ہیں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ

ایں عبادت متعدی	یعنی ان کا خیال تھا کہ کسی غریب آدمی کی حاجت براری کا کام چونکہ
راتقدم بر عبادت	ایسی عبادت ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچتا ہے یعنی متعدی ہے، اس لیے
لازم نہادے۔	لازمی عبادت پر جس کے منافع صرف اپنی ذات کی حد تک محدود
	رہتے ہیں، اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اسی لیے سفارش کو چلہ کشی کی عبادت
	سے مقدم خیال کرتے تھے۔

ذرا ان بزرگوں کی نگاہ کی بلندیوں کو دیکھیے، صرف یہی نہیں کہ اعتکاف اور چلہ کو توڑ دیتے تھے بلکہ ملا صاحب کا جیسا کہ بیان ہے، کسی قسم کا آدمی ہو، دین سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو، فاسق ہو، فاجر ہو، لیکن غریب مسلمان کا کام نکلتا ہے اس لیے ان کو ایسوں کے پاس جانے میں بھی عذر نہیں ہوتا تھا کل کیا دن تھے اور آج ان ہی کے اخلاف کا کیا حال ہے، اور بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی ہے ملا صاحب نے اس کے بعد جو یہ اضافہ کیا ہے کہ

گاہے چناں بودے کہ اگر کافرے یا ظالمے	کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اگر کسی کا فریا ظالم حاکم کے پاس
مرتبہ اول شفاعتش قبول نہ کرد، یا عمداً	شیخ کی سفارش کارگر نہ ہوتی، اور وہ اس کو قبول
از خانہ بدر نیامدہ شیخ تمام روز بر خانہ	نہ کرتا، یا قصداً گھر سے باہر نہ نکلتا تو دن دن بھر شیخ
او نشستہ	اس کے دروازہ پر بیٹھے رہتے۔

سُن رہے ہیں، فاسق اور فاجر ہی نہیں کافر اور ہندو عہدہ داروں کے پاس بھی اس غرض کے لیے جانے میں نہیں ہچکچاتے تھے۔ نفس ۔۔۔ کا یہ حال ہے کہ قصداً عہدہ دار باہر نہیں

نکل رہا ہے، لیکن وہ ہیں کہ اس کے دروازے پر اس لیے دھونی رمائے بیٹھے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کا کام نکلتا ہے نہ عزت کی پروا ہے اور نہ پوزیشن کی کیونکہ شیخ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کے علمی وقار کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ ملا عبد القادر جیسے آدمی ان کے شاگرد ہیں، اور اس تلمذ پر ان کو فخر ہے خود لکھا ہے کہ

اس باکمال بزرگ کی خدمت میں تصوف کے چند رسالوں کے پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملا ہے، الحمد للہ

در درس آں صاحب کمال بعضے کتب رسائل تصوف استفادہ نمودہ الحمد للہ

علاوہ علوم باطنی کے ملا صاحب کا بیان ہے۔

"در علوم ظاہری ہم کامل و مکمل بود و تفسیر عرائس، و عوارف و فصوص الحکم و شرحش بہ طلبہ درس گفتے، صاحب تصانیف مشہور داشت"

بہرحال اگر عہدہ دار اس دن ہاتھ نہ آتا، یا شیخ کی سفارش نہ سنتا تو شیخ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ

دوسرے دن پھر (اسی کا فریاد ظالم عہدہ دار) کے دربار میں جاتے اور کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرتے نہ ان کے دل میں اس طرز عمل سے کوئی کدورت پیدا ہوتی۔

روز دیگر بدربار او مکرر رفتہ و دم نزدہ وازیں معنی ہیچ رنگ کدورتے بر آئینۂ خاطر غبار نمائش نشستہ

کچھ اس طرح لپٹ جاتے تھے کہ بالآخر

(حاشیہ صفحہ ۲۲۶) لے کسر نفسی اور تواضع کے سلسلے میں ملا عبد القادر ہی نے ان کا ایک عجیب قصہ نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی خانقاہ میں سماع کی مجلس تھی شیخ عزیز اللہ بھی اس مجلس میں موجود تھے، اتنے میں کسی قلندر آزاد نے ایک چیخ ماری اور "دست بزانوے شیخ بردہ و برداشتہ ادر اسرنگوں بر زمین زد تا دستارش پریشاں شد دلطمہ نیز رسید" بھری مجلس میں ان کو پٹک دیتا ہے، پگڑی بکھر جاتی ہے، تکلیف بھی پہنچتی ہے لیکن شیخ نے خود ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید وجد اور حال میں اس قلندر سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے مگر دراصل اس نے شرارۃً یہ حرکت کی تھی، تھوڑی دیر بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کیا، حاکم شہر بھی مجلس میں موجود تھا اسے بڑا غصہ آیا "وارادہ زجر و ضرب تہدید آں پریشاں کرد" مگر جانتے ہو شیخ نے کیا کہا "شیخ عذر خواہی او بسیار نمود دست و پائے او (یعنی اس قلندر کے دست و پا کو) بوسیدہ در حمایت خویش نگاہ داشت و نہ گذاشت کہ عرض باو برسانند" (ص ۱۰ ج ۳)

تا آنکہ مشفوع عنہ خود شرمندہ و خجلت زدہ
درپائے او می افتاد و حاجت آں فقیر
راسماً و طاعةً برمی آورد۔

وہ شخص جس سے سفارش کی جاتی تھی، خود شرمندہ اور خجل
و نادم ہو کر شیخ کے پاؤں پر گر پڑتا اور یوں بخوشی و رضا
اس بیچارے غریب کا کام نکل جاتا۔

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھیے، اور اس پر غور کیجیے، آپ کو نظر آئیگا کہ امراء اور غرباء کے درمیان، ان ہی بزرگوں کا وجود باجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا، اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسرے اغراض رکھتے تھے، ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، مسافروں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں، جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو،

مسلمان جس ملک میں بھی پہنچے تھے، اس کے طول و عرض میں آپ کو اس قسم کی خانقاہوں کا جال بچھا ہوا نظر آئیگا، خیال تو کیجیے عہد التمش و بلبن یہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کا زمانہ ہے، لیکن دلی ہی میں نہیں، پایۂ تخت سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ہم دیکھتے ہیں کہ غرباء کے لیے ان ہی خانقاہوں کے ذریعہ سے لنگر جاری ہیں، سیر الاولیاء میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے "دراوائل از آئندگان می شنیدم کہ شیخ خضر پارہ دوز در بہار خانقاہے دارد و درویشاں را خدمت می کند" (ص ۱۱۲) سلطان المشائخ کا ابتداء میں ان ہی کے پاس بہار جانے کا خیال تھا "نیت جزم کردم کہ بروم و غلام بچگاں او را تعلیم بکنم"

غور کرنے کی بات ہے کہ یہ زمانہ ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کی نوعمری کا زمانہ ہے غالباً ناصر الدین بن التمش کا زمانہ ہوگا، اور اسی زمانہ میں دلی سے اتنی دور بہار میں درویش کی خانقاہ جاری ہے، اور درویشوں کی خدمت ہو رہی ہے،

بہرحال "فتوحات" "نذور" شکرانوں کی آمدنیاں ان خانقاہوں میں ضرور ہوتی تھیں

لیکن جب تک ہماری خانقاہیں واقعی خانقاہیں تھیں، دکانوں کی شکل اُنھوں نے نہیں اختیار کی تھی، تو اُس وقت خانقاہ کے درویش کی حیثیت مالک کی نہیں صرف قاسم کی رہتی تھی،

فتوحاتی آمدنیوں کے مالک نہیں، بلکہ قاسم، اور صرف قاسم ہونے پر جن خانقاہوں میں اصرار کیا جاتا تھا، اور اتنا شدید اصرار کہ شیخ کبیر شکر گنج خواب میں آکر سلطان المشائخ کو تنبیہ کرتے ہیں، کیا اس کے بعد بھی ان بزرگوں کے متعلق حج کی فرضیت اور عدم فرضیت میں کسی کو شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ ہا! جن دینی بادشاہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دین کی خدمت میں صرف کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر بنائے رکھا، آج اُن پر زبانیں کھل رہی ہیں، ان لوگوں کی جن کا سرمایہ دینی جدوجہد کی راہ میں زبان سے نکلنے والے چند تقلیدی الفاظ، یا قلم سے بننے والے چند فرسودہ پامال حروف کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جن سے بمشکل پانچ وقت کی نماز بھی ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں ہو سکتی، خدا کی شان ہے وہی آج ان بزرگوں کو ٹوکنے کی ہمت کر رہے ہیں، جن کی زندگی میں "دین" اور دین کی حقیقی سچی خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا،

اللہ کے ان دوستوں کے معاملہ میں اپنے عزیزوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا کی غیرت کو حرکت میں نہ لائیے، تنقید و تحقیق، ریسرچ و تنقیر کے کھیل کھیلتے رہیے لیکن خدارا ریش باباتک تو آپ کی یہ بازیاں نہ پہنچ جائیں۔

من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب۔ — میرے کسی ولی سے جو دشمنی کرتا ہے میں اس کو جنگ کا اعلان دے دیتا ہوں

کی حدیث اگر آپ نے سنی ہوگی تو بیٹھے بٹھائے اس اعلان جنگ کو کیوں دعوت دیتے ہیں، جس کا جواب تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

کیا آپ واقعات کا انکار کر سکتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے "محمد تغلق" اور اس کی بے نظیر خونیں داستانوں، بے مثال مجنونانہ افسانوں کے نقوش کیا مٹائے جا سکتے ہیں؛ دولت آباد بسانے کے لیے دلی اُجاڑی گئی، اس حد تک اجاڑی گئی کہ کسی گوشہ کے کسی گھر سے دُھواں بلند نہیں ہو رہا ہے۔

عجیب بات ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی کی بعض معمولی باتوں کو تو لوگوں نے اہمیت دی کہ غیاث الدین تغلق پر جب نو تعمیر دعوتی مکان گرا، تو کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ کے ستانے کا چونکہ ارادہ رکھتا تھا، حضرت سے لوگوں نے عرض کیا کہ اب تو وہ جمنا کے ساحل پر آگیا، دُو ایک روز میں دلی پہنچ کر معلوم نہیں کیا مصیبت پیدا کرے، بیان کیا جاتا ہے کہ اسی وقت زبانِ مبارک سے "ہنوز دلی دور است" کا فقرہ نکلا، جو نسلوں اور پشتوں سے منتقل ہوتے ہوئے آج تک زبان زد عام ہے، عموماً تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اسی طرح خلجی فاسق سیہ کار بادشاہ قطب الدین مبارک جب اپنے غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے مارا گیا، تو عموماً اس موقعہ پر بھی مورخین ذکر کرتے ہیں، کہ جس رات کو مارا گیا، اُس کی صبح کو وہ سلطان المشائخ کے ساتھ گستاخی کا عزم کیے ہوا تھا کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ ہی کی بد دعاء کا شکار ہوا[1]۔

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ یہ خسرو خاں جو چار مہینوں کے لیے دلی کا بادشاہ بھی ہو گیا تھا، دراصل گجرات کا ایک خوش رو وجیہ چھوکرا تھا، اصلی نام حسن پرواری بچہ تھا، قطب الدین اس کے ہاتھ سے مارا گیا یہ تو واقعہ ہے، لیکن اس کے پیچھے کیا کسی اللہ کے ولی کی بد دعا رہی تھی؟ جیسا کہ میں نے کہا تاریخوں میں بھی سلطان المشائخ کے قصّہ کو ذکر کرتے ہیں لیکن مجمل لفظوں میں میر خورد نے سیر الاولیاء میں اس قصّہ کا ذکر کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا، اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لیے قطب الدین حضرت سے بھی ناراض رہتا تھا، اُس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ و علماء کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں، سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا "مامسجد نزدیک داریم و آں احق است ہمیں جا خواہم گذارد" اور وہ جامع میری نہیں گئے بادشاہ سخت برافروختہ ہوا، اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان و مشاہیر شہر دربار شاہی میں پیش ہو کر نذر گذرانتے تھے، سلطان المشائخ اس تقریب (باقی بر صفحہ ۲۳۱)

بجائے خود اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں واقعات کچھ کم اہم نہیں ہیں، خصوصاً قطب الدین مبارک کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت اور چار سال تک اسی کشمکش میں دلی ہی کے گویا ایک محلہ میں رہنا، سلطان المشائخ کی ایمانی استقامت کی بڑی عجیب وغریب شہادت ہے، شخصی حکومت کے مطلق العنانہ اختیارات کا اندازہ کیجیے اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے، یقیناً ابتلاء کی یہ چار سالہ مدت کم مدت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی مجھے لوگوں پر تعجب ہے کہ جب تاریخی کتابوں میں سلطان المشائخ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۰) میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، اداے رسم کے لیے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے، اس سے بھی وہ برہم تھا، اس نے اپنے تمام امراء وزرا کو حکم دیا کہ کسے بزیارتِ شیخ غیاث پور نرود" میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ" بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ بیارد دہزار تنکہ زر اورا بدہم"

ایک دن شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا، یوں مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کی چار سالہ مدت میں پیش آتے رہے، نوچندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا، قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ اگر "در غرۂ ماہ آئندہ نیاید بیاریم چنانکہ دانیم" گویا یہ اس کی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسیٹوا کر بلواؤنگا، شاید قتل ہی کا ارادہ ہو، سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم صمیم کی خبر پہنچی "سلطان المشائخ ہیچ نگفت" اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا "ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں را روے پیش ترمی داد" الغرض، مہینہ ختم ہوا، چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے اعیان و امراء دربار میں جائینگے، لیکن سلطان المشائخ نہیں طے کیے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤنگا، قطب الدین بھی فیصلہ کیے ہوئے ہے کہ اگر "نیاید بیاریم چنانکہ دانیم" صرف شب درمیان ست، دلی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دنیا اور دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے، رات گزرنے بھی نہ پائی کہ

"ہم دریں شب، ماہ بلائے از آسماں برجان بادشاہ نازل شد"

یعنی خسرو خاں حسن پرواربچہ "موئے سر سلطان را گرفت و باہم در آویختند پہلوئے سلطان را بخنجر شگافتہ برزمین انداخت و سر آں مشوم را از تن جدا کردہ از بام ہزار ستوں بزیر افگند" (طبا طبائی) صبح کو سر اورا بالائے نیزہ کرد بخلق نمود" میر خورد کہتے ہیں کہ جس رات کو یہ واقعہ پیش آیا، سلطان المشائخ اپنے بالاخانہ کی چھت پر ٹہلتے ہوئے زبانِ مبارک سے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے ؎

اے روبہک چرانہ نشستی بجائے خویش   با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

میر خورد نے اس شعر پڑھنے کے واقعہ کو نہیں لکھا ہے، دوسرے تذکروں میں ہے۔ البتہ سعدی کے نام سے اسی مقام

متعلق اس قسم کے واقعات درج ہی کیے جا رہے تھے، تو اس سلسلہ کا جو سب سے بڑا واقعہ تھا
اسی کو قلم انداز کیوں کر دیا گیا، حالانکہ میر خورد نے اسی زمانہ میں اپنی کتاب سیر الاولیا میں
بتفصیل اس کا تذکرہ کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق کے عہد میں "سماع" کے مسئلہ
نے ایک سخت فتنہ کی شکل اختیار کی، سلطان المشائخ کے دربار کا جاہ و جلال، دسترخوان
کی وسعت ارباب حاجات کا ہر طرف سے آنا، اور ان غریبوں کی عام اعانت و
امداد کی وجہ سے ملک میں جو ہر دل عزیزی آپ کو حاصل تھی یہی چیز بعض علماء وقت کے
حسد کا باعث ہوئی اور تو کوئی چیز قابلِ اعتراض بات سلطان المشائخ کی زندگی میں
ملی نہیں، اسی غیر مزامیری سماع کے مسئلہ کو اہم بنا کر مولویوں نے محضر نامہ کی صورت میں
غیاث الدین کے پاس پیش کیا، ایک صاحب جن کا نام شیخ زادہ جام حسام الدین تھا
سلطان المشائخ ہی کی خانقاہ کے رہے ہوئے بلکہ پلے ہوئے تھے، میر خورد نے لکھا ہے

"یا تا بہ غربی درخانہ سلطان المشائخ کشادہ بود"

یعنی شروع شروع جب دلی آئے تو حضرت ہی کے یہاں فروکش ہوئے، بڑے آدمی شیخ
جام کے خاندان سے تھے اس لیے "با نواع تربیت و شفقت سلطان المشائخ پرورش یافتہ" بعد
کو شاہی دربار میں ان کو رسوخ خاص حاصل ہو گیا تھا، یہی حضرت اس محضر نامہ کے پیش
کرنے میں آگے آگے تھے، غیاث الدین کو حیرت ہوئی جب اُس نے سُنا کہ غیر مزامیری سماع
بھی حرام ہے اُس نے فرمان صادر کیا۔

"چوں علماء دین در حرمت سماع فتوی کردہ بجہت ایں کار مزاحم شدہ سلطان المشائخ
را حاضر کنند و جملہ علماء شہر و اکابر را طلب کنند"

فرمان کی تعمیل ہوئی، سلطان المشائخ بھی حاضر ہوئے اور شہر کے علماء، و اکابر بھی بلائے گئے،
اس زمانہ میں نائب السلطنت کے عہدہ پر قاضی جلال الدین لوالجی سرفراز تھے مجلس میں
یہی سلطان المشائخ سے مخاطب ہوئے، بادشاہ بھی موجود تھا، طرفین میں گفتگو ہو رہی تھی،

دونوں کی سُن رہا تھا، درمیان میں فریق مخالف کے علما جب شور برپا کرتے تو تغلق کہتا

"غلبہ مکنید بشنوید کہ شیخ (سلطان جی) چہ می فرماید"

اس عرصہ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے مولانا علم الدین بھی مجلس مناظرہ میں کہیں سے آپہنچے، غیاث الدین ان کا کچھ معتقد تھا، ان ہی کو اس نے حکم بنایا اور کہا کہ

"شما در بغداد و شام و روم گشتہ مشائخ آں دیار سماع می شنوند یا نے؟ و ایشاں را دریں کار کسے مانع شود یا نے؟"

مولانا علم الدین نے جواب میں جو واقعہ تھا وہ بیان کیا، فرمایا

"در ہمہ شہرہا بزرگان و مشائخ سماع می شنوند"

بلکہ یہ بھی کہا کہ بعض مقامات میں تو "دف و چغانہ" کے ساتھ بھی سُنتے ہیں "و کسے ایشاں را مانع نمی شود" تغلق نے ان کی یہ رپورٹ جب سُنی "ساکت شد و ہیچ نہ گفت" نائب السلطنت قاضی جلال الدین نے بادشاہ پر اصرار کیا کہ ممانعت سماع کا فرمان جاری کر دیجیے، سلطان المشائخ نے کہا بادشاہ ایسا حکم نہ صادر کریں، تغلق نے سلطان المشائخ ہی کی بات مان لی، یعنی کوئی فیصلہ نہ ہوا، جو حال اب تک تھا وہی باقی رہا، مولانا فخر الدین زرادی کے عربی رسالہ سے یہ فقرہ میر خورد نے نقل کیا ہے، جس میں اس مجلس مناظرہ کی کیفیت درج ہے۔

وکان ذلک من اول الضحیٰ الیٰ اوان الفیٔ ثم قام اھل المجلس من عند السلطان ۔	ابتداء وقت چاشت سے سایہ ڈھلنے تک مناظرہ کی یہ مجلس قائم رہی، پھر لوگ بادشاہ کے سامنے سے اُٹھ گئے ۔

بہر حال یہ تو مجلس مناظرہ کا مختصر حال ہے، میر خورد نے دیگر جزئیات کی بھی تفصیل لکھی ہے۔

میر خورد نے اس کے بعد مولانا ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی کے

رسالہ "حسرت نامہ" سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

"چوں حضرت سلطان المشائخ از محضر مذکور در خانہ آمد بوقت نماز پیشین (ظہر) مراد

مولانا محیی الدین کاشانی و امیر خسرو شاعر را طلب فرمود"

برنی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حضرت کی خدمت میں جمع ہو گئے اُس وقت

حسب ذیل تقریر سلطان المشائخ نے شروع کی۔

"گفت کہ دانشمندان (علماء) دہلی بعداوت و حسد من پر بودند میداں فراخ یافتند و

سخنہائے پر از عداوت ایشاں بسیار گفتند"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں جو تقریریں ہوئی تھیں ان سب کا خلاصہ سلطان المشائخ نے

ذکر فرمایا، آخر میں ارشاد ہوا۔

"عجبے امروز معائنہ شد کہ در معرض حجت احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

نمی شنوند ومیں گویند کہ در شہر ما عمل بروائت فقہ مقدم ست بر حدیث"

اور صرف یہی نہیں، برنی نے براہِ راست سلطان المشائخ کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں

ہر بار کہ حدیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور می شد برمی آمدند و منع می کردند و می

گفتند ایں حدیث متمسک شافعی است و او دشمن علمار ماست مانمی شنویم"

اسی کو "بدنام کنندہ نکو نامے چند" کہتے ہیں، کیا واقعۃً یہی حنفیت ہے، یہی امام ابوحنیفہ اور علمائے

احناف کا مسلک ہے، کیا ان خرافات کا اظہار جب ان مولویوں کی زبانوں پر ہو رہا تھا،

تو وہ اصل حقیقت سے آگاہ نہ تھے، لیکن ان کو حسد اندھا بنائے ہوئے تھا، اس وقت

لہ خدا جانے بیجاپور میں بیٹھے بیٹھے ہندو شاہ کے بیٹے قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہاں سے یہ بات اُڑائی کہ امام غزالی کا قول یجوز لاھلہ ولا یجب لغیر اھلہ کو حدیث قرار دے کر سلطان جی نے پیش کیا، کیا تماشا ہے دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پر یہ الزام ہے، اسی مجلس میں مولانا فخرالدین زرادی موجود تھے۔ گذر چکا کہ وہ دعوے کے دونوں پہلو، جواز و عدم جواز پر دلیل پیش کرنے کے لیے تیار تھے ۱۲

ان کا ایمانی نور گہن میں آگیا تھا سب کچھ جانتے تھے مگر جیسا کہ سلطان المشائخ نے فرمایا

"با اعتقاد اندیانہ کہ بحضور اولی الامر بمکابرہ می آیند"

ظاہر ہے کہ صرف دھاندھلی اور مکابرہ سے محض اپنی بات کی بیجا طرفداری بادشاہ کے سامنے کر رہے تھے، تعجب ہے کہ سلطان المشائخ کے اسی بیان کو بعض لوگوں نے اس کی دلیل بنالیا ہے کہ ہندوستان کے علماء، حدیث سے ناواقف تھے، حالانکہ یہ جو کچھ کہا جا رہا تھا ناواقفیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف ضد، ہٹ دھرمی، حسد، شرارت نفس کا نتیجہ تھا، اسی کے بعد سلطان المشائخ ہی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہیچ علمائے ندیدم و نشنیدم کہ پیش او احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کردہ آید و او گوید کہ من نمی شنوم من نمی دانم"

سلطان المشائخ بیچارے تو ہندوستان سے باہر ایک دن کے لیے بھی کہیں تشریف نہیں لے گئے، ان کا "ندیدم" کھلی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان ہی کے علماء سے متعلق ہو سکتا ہے جس کا یہی مطلب ہوا کہ اس مجلس خاص میں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ علمی نہیں بلکہ صرف حسد کی گفتگو اور معاندانہ حجو و تعنت تھا، ورنہ کیا عام علماء ہند کا وہی حال تھا، جسے سلطان المشائخ نے دیکھا تھا، بھلا ایسا کونسا مسلمان ہو سکتا ہے جو حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ماننے کے بعد بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے نہیں مانتا، زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ مثلاً نسخ کا تخصیص کا تاویل کا دعوی کرے، نہ کہ علانیہ اقرار کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ماننے کے باوجود میں نہیں مانتا، کیا ایسے شخص کا اسلام باقی رہ سکتا ہے؟ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان مولویوں کی غرض بھی یہی ہوگی یعنی جس مقصد کو اس حدیث سے لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہم اس مقصد کے لیے اس حدیث کو مفید نہیں سمجھتے۔ لیکن بادشاہ جاہل تھا، علمی اصطلاحات کو کیا سمجھتا، انہوں نے اس کے سامنے ایسی تعبیروں میں اپنے مدعا کو پیش کیا کہ حقیقت

یہ ہے کہ اس سے ایمان کانپ جاتا ہے۔

بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ سلطان المشائخ پر علماء کے اس طرزِ عمل کا سخت اثر تھا، اور کیوں نہ ہوتا، علانیہ رسول کی حدیث کی توہین کی گئی تھی، ضیاء برنی نے اس کے بعد لکھا ہے، سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلنے لگے۔

"ایں چہ روزگار است دراں شہرے کہ ایں چنیں مکابرہ کنند چہ گونہ آباداں ماند"

دین کی غیرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خون کھول رہا تھا، اپنے محبوب رسول کی حدیث کی اس اہانت نے دامن صبر کو ان کے ہاتھ سے الگ کر دیا، اور خاص حال میں جو اہل اللہ پر ایسے مواقع میں طاری ہو جاتا ہے، یہ الفاظ کیا تھے، صرف خدا کا غصہ قہر الٰہی کے شعلے تھے جو فضا میں بھڑکنے لگے، برنی ناقل ہیں کہ سلطان المشائخ نے فرمایا "عجب است کہ خشت خشت نہ شود" پھر فرمایا کہ

"بعد ازیں بادشاہ و امراء و خلق کہ از قاضی شہر و علماء شہر بشنوند کہ دریں شہر عمل بر حدیث نیست"

ظاہر ہے کہ جس پیرایہ میں قاضی شہر اور علماء نے مسئلہ کو پیش کیا تھا، اس کا ظاہر مطلب تو یہی ہو سکتا تھا کہ باوجود اسلامی شہر ہونے اور باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور ان کے دین پر ایمان لانے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر چلنا ضروری نہیں ہے، سلطان جی نے سچ فرمایا کہ جب اسی قسم کی تعبیریں پیش کی جائینگی تو پھر "سنت" پر اس ملک کے مسلمانوں کا عمل کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

"چہ گونہ اعتقاد بر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راسخ ماند"

آخری الفاظ آپ کے یہ تھے

ازاں وقت باز کہ ایشاں روایت کردن حدیث منع کردند، من ترسانم کہ شومت نحوست"

ایں چنیں بد اعتقادی کہ بر علماء شہر معائنہ شد از آسمان بلا و جلا و قحط و وبا بر سر شہر

خواہد بارید" ص ۳۲ھ

یہ مولانا ضیاء الدین برنی کی روایت ہے، جو براہِ راست سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے انہوں نے نقل کی ہے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجیگی، اس شہر کے لوگ، جلا وطنی کی مصیبت کے شکار ہونگے، قحط میں مبتلا ہونگے، وبا کی مار ان پر پڑے گی، بادشاہ کے دربار میں علماء شہر اور قاضی الملک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ساتھ جو گستاخی کی ہے اس کی سزا ان شکلوں میں لوگوں کو بھگتنی پڑیگی، سلطان المشائخ نے تو "می ترسانم، عجب است کہ خشت خشت نہ شود" کے الفاظ سے صرف اندیشہ کا اظہار فرمایا لیکن واقعہ اس کے بعد کیا ہوا "شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ کی وفات "روز چہار شنبہ ہیزدہم ماہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ" (ص ۵۸) میں ہوئی، اور ملا عبد القادر بداؤنی لکھتے ہیں۔

این واقعہ (یعنی قصر افتادن بر غیاث الدین تغلق) در سنہ خمس وعشرین وسبعمائۃ ۷۲۵ھ

روے نمود (ص ۲۲۵)

اور دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجانے والا، دلّی کے ایک ایک متنفس کو دلّی سے جلا وطن کر کے دیوگڑھی (دولت آباد) لیجانے والا، اور ان سارے مصائب ہائلہ کا سرچشمہ جس کا نام محمد تغلق ہے

"سلطان محمد عادل شاہ بن تغلق شاہ کہ الغ خاں باشد، در سنہ خمس وعشرین ۷۲۵ھ

باتفاق امراء وارکان دولت بر مسند سلطنت نشست" (ص ۲۲۵ بداؤنی)

میں اب اس پر کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتا، صرف اتنی بات کہ برنی نے جو الفاظ سلطان جی کی زبانی نقل کیے ہیں، ان کو سامنے رکھیے، اور "محمد تغلق" جس نے خود تو اپنا نام 'عادل' رکھا تھا، لیکن عوام میں "محمد تغلق خونی" کے نام سے مشہور ہے، اس کی چھبیس سال کی حکومت کی تاریخ پڑھ جائیے، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے، ہو سکتا ہے کہ محمد تغلق کی مختلف الآثار والجوانب، متضاد صفات والی حقیقت' عامہ مورخین و اہل نظر کے لیے جو معمہ بنی ہوئی ہے، وہ معمہ حل ہو جائے

مشہور ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تابعی کو حجاج نے شہید کیا، اور اس پر وہ خاص کیفیت طاری ہوئی یعنی

کان اذا نام رأی سعید بن جبیر اخذ بمجامع ثوبہ یقول یا عدو اللہ فیم قتلتنی؟ فیستیقظ مذعورًا ویقول مالی ولسعید (الیافعی ص ۱۹۸)	جب حجاج سوتا تو خواب میں حضرت سعید کو دیکھتا کہ وہ اس کے کپڑوں کو پکڑے ہوئے فرما رہے ہیں اے خدا کے دشمن کس قصور میں تو نے مجھے قتل کیا، حجاج اس خواب کو دیکھ کر ڈرا ہوا اٹھ جاتا اور بولتا کہ سعید کو ہم سے کیا تعلق ہوگیا ہے

اور ابن جبیر ہی کے قتل کے بعد اس کو وہ بیماری ہوئی، جس کا نام لوگ "زمہریرہ" بتاتے ہیں، ایسی سخت سردی کلیجے سے اٹھ کر سارے جسم پر چھا جاتی تھی کہ کانپتا جاتا تھا اور

وکانت الکوانین تجعل حولہ مملوءۃ نارًا وتدنی منہ حتی یحرق جلدہ وھو لا یحس بھا۔	انگیٹھیاں آگ سے بھری اس کے پاس لائی جاتی تھیں اور اس سے قریب کی جاتیں تا اینکہ اس کی کھال بھی جل جاتی لیکن اس کو حس بھی نہ ہوتا۔

پیٹ میں اطباء نے سرطان تجویز کیا، یافعی وغیرہ نے لکھا ہے کہ

فدعا بالطبیب فاخذ لحمًا وعلقہ فی خیط وسرحہ فی حلقہ وترکہ ساعۃ ثم اخرجہ وقد علق بہ دود کثیرۃ (یافعی ج ۱ ص ۱۹۵)	حجاج نے طبیب کو بلایا، طبیب نے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا، اور اُس میں تاگا باندھا اور گوشت کے اس ٹکڑے کو حجاج کے حلق میں اتار دیا تھوڑی دیر کے بعد تاگے کو کھینچا تو دیکھا کہ اس گوشت کے ٹکڑے میں بکثرت کیڑے پیٹے ہوئے ہیں

کہتے ہیں کہ جب مادی تدبیروں سے حجاج مایوس ہوگیا، تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو بلوایا، اور دعا کی درخواست کی، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ حضرت حسن اس کے اس حال کو دیکھ کر چیخ مار کر رونے لگے اور حجاج کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

قد نھیتک ان تتعرض للصالحین (یافعی وغیرہ)[195]	میں نے حجاج تجھے منع کیا تھا کہ نیک بندوں کو نہ چھیڑنا

ظاہر ہے کہ حجاج کے پیٹ کا آکلہ (سرطان[1] ہو یا زمہریرہ (سردی) کی بیماری ہو، یہ تو بجائے خود ایک واقعہ ہے، لیکن یہ بات کہ یہ کیفیت حضرت سعید بن جبیرؒ کے قتل اور خون ناحق کی آواز بازگشت تھی، جس کی طرف خواجہ حسن بصریؒ نے اشارہ فرمایا، اس کا آپ کو اختیار ہے کہ ملئیے یا نہ مانئیے، بجنسہٖ یہی کیفیت محمد تغلق کی ہے، اس کا جنون، اور عجیب و غریب جنون جس کی نظیر شاید تاریخ میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد، کہ لاکھوں کی آبادی رکھنے والے معمور شہر کو بہ یک گردش قلم ویران کرتا ہے اور ایسا ویران کہ بقول ملا عبدالقادر بدایونی۔

دہلی چناں خراب شد کہ سگ و گربہ ہم دراں نہ ماند و ایں بیت حسب حال آں بود۔

جائے کہ بوداں دلستاں با دوستاں در بوستاں

شد گرگ و روبہ را مکاں شد گرگ کرگس را وطن

عجیب و غریب جلاوطنی کا یہ واقعہ ضرور پیش آیا، دوآبہ کی رعایا پر سخت قسم کے ٹیکس عاید کرنا

"گاؤ شماری[2] و خانہ شماری و رسوم بدعتہائے دیگر نیز پیدا کرد کہ موجب خرابی و ویرانی آں

---

[1] بلاتشبیہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ولادت باسعادت نبوت کبریٰ کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے، گر پڑے، بحیرۂ ساوہ خشک ہو گیا۔ اب بعض لوگ خواہ مخواہ عقلی محفلوں میں اونچی جگہ حاصل کرنے کے لیے ان واقعات ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ واقعات تو تاریخی ہیں۔ کہتے ہیں کہ طاق کسریٰ کے کھنڈر مدائن میں اب بھی جس حال میں موجود ہیں، اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ زدہ عمارت ہے اور اسی زلزلہ میں اس کے مشہور کنگرے گر گئے تھے، یونہی عرب کا نقشہ اُٹھا کر دیکھیے آپ کو حضرموت کی وادی میں ایک خشک دریا ساوہ نامی نقشہ میں نظر آئیگا۔ بہرحال ان واقعات کا انکار کرنے کی توجہ نہیں، ہاں! ہم مسلمان لوگ اپنے پیغمبر کی ولادت کے علامات میں ان حوادث کو شمار کرتے ہیں، اور جنہیں پیغمبر سے عقیدت نہیں ہے، وہ اس کی توجیہ کسی کوئی قانون کے تحت کر سکتے ہیں ۱۲

[2] اعداد و شمار کا خبط جن فاسد اغراض کو سامنے رکھ کر یورپ نے اس زمانہ میں پھیلایا ہے، خدا کی پرانی دنیا جو لامعلوم زمانہ سے موت و حیات کی ایک خاص گردش کے ساتھ چل رہی ہے اس کے حوادث پر قابو پانے کا جو ارادہ اس

ولایت بالکلیہ گردید وضعیفاں نابود شدند، اقویا ربنیاد فساد نہادند"

نیز "سکہ" کے مسئلہ میں جو حماقتیں باایں ہمہ عقل و ہوش اس بادشاہ سے سرزد ہوئیں کہ لوگ

"مس بدار الضرب آوردہ مسکوک می گردانیدند و امتعہ و اسلحہ باں خریدہ در اطراف عالم می فرستند ..... وبدیں حیلہ زرہائے بسیار اندوختند ا ما مردم دار السلطنت (دہلی) بخاک سیاہ برابر شدند" (سیر المتاخرین۔ ص ۱۲۵)

قحط کی وہ صورت نمایاں ہوئی کہ

"گندم قیمت آدم پیدا کرد و برنج ہم سنگ طلا گردید، غلہ کمیاب چہ نایاب گردید تہی دستاں بگرسنگی مردند و متوسطین ہم جاں بحق تسلیم کردند"

اور اس پر کریلے کو نیم پر دلی میں یوں اور چڑھا دیا گیا کہ

"سلطان بے رحم سپاہ دروں دروازہائے شہر (دہلی) بند کرد، تا ہیچ کس از شہریاں بیروں نہ رود، عامہ خلائق بدیں سبب زیادہ از حد شمار بگرداب فنا فرو شدند" ص ۱۲۶

ظالم بادشاہ نے بالاخانہ سے جب اپنی بربریت و وحشت کے اس دردناک نتیجہ کا معائنہ کرلیا، تب اس کی تسلی ہوئی، کہا جاتا ہے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اندھے فقیر کو دلی سے گھسیٹ کر سپاہی دولت آباد کی طرف لے چلے وہ مرگیا، اس کے جسم کا ایک ایک عضو راستہ میں گرتا چلا گیا، تا ایں کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل اس شکل میں ہوئی کہ گھسٹتی ہوئی لاش کا صرف ایک ہاتھ دولت آباد کی سرزمین میں لاکر دفن کیا گیا۔

واقعہ یہ ضرور ہوا اسی طرح ہوا جیسے ہمالیہ کی راہ سے چین پر چڑھائی کی مہم روانہ کی گئی، جواب تک واپس نہیں ہوئی، خلاصہ یہ ہے کہ جب تک دلی میں رہا۔

"پیوستہ پیش سراپردۂ سلطانی و درگاہ دیوانی او از کشتہ پشتہ وا ز مردہ تودہ بودہ کناساں و جلاداں از کشیدن و کشتن انبوہ بستوہ آمدہ بودند" (بدایونی ص ۲۳۸)

کشتوں کے پشتے اور مردوں کے تودے جن جن شکلوں میں ڈھیر کیے جا نے تھے، طباطبائی کا بیان ہو کہ

"بریدن دست و پا و گوش و بینی و میل کشیدن در چشم، و گرفتن استخواں با شکنجہ کوبہ و سوختن اندام ذی حیات بآتش و کشیدن پوست بدن، و دو پارہ ساختن آدمی و زندہ انداختن در پائے فیل و بر دار کشیدن"

جس میں کسی کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔

"مردم ہر طائفہ از صوفی و قلندر، و لشکری و نویسندہ و عمال، و رعیت و تاجر باندک تقصیر و کمتر لغزش سیاست عظیم کردے" (ص ۱۲۴)

واقعہ سب کے سامنے ہوا، لیکن کیوں ہوا، دلّی پر بلکہ ہندوستان پر اچانک یہ آفت کہاں سے ٹوٹ پڑی، لوگوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا؟

یہ جستہ جستہ فقرے ان لوگوں کے لیے میں نے معتبر تاریخوں سے نقل کر دیے ہیں، تاکہ جن لوگوں کی نظر تاریخ پر نہ ہو، یا واقعات مستحضر نہ ہوں، ان کے سامنے تازہ شکل میں وہ نقشہ گھوم جائے، جس کا اندیشہ سلطان المشائخ نے علما دلّی کی توہین حدیث نبوی کے بعد ظاہر فرمایا تھا، تعجب تو اس پر ہو کہ یہ حیرت انگیز مدہش، فقید المثال ساری باتیں کس بادشاہ سے سرزد ہوئیں، جس کے متعلق ارباب تاریخ کا اس پر بھی اتفاق ہو کہ

"در اکثر علوم خصوص تاریخ و معقولات، و نظم و انشاء و غیرہم مہارت تمام داشت"

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ

"در نماز و روزہ و ترویج احکام شرع تیام نمودہ در اجتناب ملاہی و مسکرات و سائر مناہی کوشش بلیغ نمودہ بحسب امی رسانید" (سیر المتاخرین ص ۱۲۴)

اب آپ کا جی چاہے، جیسا کہ قرآن نے روشن خیالوں کا یہ نظریہ حوادث کائنات کے متعلق نقل کیا ہو کہ

قَدمَسّ اٰبآءَنَا الضَّرّآءُ وَالسَّرّآءُ — مصیبتیں اور مسرتیں دونوں قسم کے واقعات گذشتہ نسلوں پر بھی گذرتے رہے ہیں (اس لیے ان کے پیچھے کسی اخلاقی قانون کی حکومت کو پوشیدہ سمجھنا حماقت ہی)

کی عام مادی ذہنیت والوں کی تعبیر کی چادر اُڑھا کر جو چیز محسوس کرائی گئی ہی، اُسے اپنے لیے نامحسوس بنالیجیے یا خوش اعتقادی (وغیرہ کے الفاظ کی عصری گالیوں کے برداشت کرنے کی صلاحیت ہو تو آپ بھی تغلقی عجائب وغرائب جلا و بلا قحط و وبا، میں وہی دیکھیے جو آج ہی نہیں، اُسی زمانہ میں جب دلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، میر خورد نے مجلس مناظرہ کے واقعات بالا کو درج کرنے کے بعد لکھا ہی۔

ازاں بود کہ در چہارم سال ازیں ماجرا تمامی علماء کہ دریں محضر (مجلس مناظرہ) بودند دیگراں راہم بسبب ایشاں در دیوگیر جلا کردند و بیشترے ازاں علماء در دیوگیر سر نہادند قحطے ہلک و وبائے سخت در شہر پیدا شد"

میر خورد کے سامنے کی بات ہی، آخر میں لکھتے ہیں:۔

"تا ایں غایت ایں بلا ہا بکلی دفع نمی شود سبحان اللہ ہر سخنے کہ بزبان مبارک سلطان المشائخ گذشتہ بود عین آں معائنہ و مشاہدہ شد" ص ۵۳۲

اور اسی پر مجھے تعجب ہی کہ محمد تغلق کی فتنہ سامانیوں کے پیچھے اسی زمانہ میں لوگوں کو علماء دلی کی وہ گستاخیاں نظر آئیں، جو اللہ کے ایک دوست اور محبوب کو ذلیل کرنے کے لیے پیغمبر کی حدیث کی تحقیر و توہین پر بھی آمادہ ہو گئے تھے، لیکن اتنا بڑا واقعہ تو بھلا دیا گیا، اور صرف "ہنوز دلی دور است" یا قطب الدین مبارک کے اچانک قتل کا واقعہ لوگوں کو یاد رہ گیا۔

میرا مقصد اس واقعہ کے نقل کرنے سے جہاں ایک عجیب و غریب تاریخی واقعہ کی ایک توجیہ کا تذکرہ ہی، اسی کے ساتھ ان عزیزوں سے بھی التماس ہی جو اپنے چند سرسری سطحی بے سروپا معلومات کو سامنے رکھ کر ایسے نتائج پیدا کر رہے ہیں، جن کا حاصل اس کے سوا اور کیا

نکل سکتا ہے، کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت تھی، دولت تھی، اقبال تھا، جلال تھا، اس وقت تو وہ خود ان کے علماء ان کے اولیا، سب اسلام سے دور تھے، لیکن جب سب کچھ جاتا رہا تو غلامی کے اس دور میں اب حقیقی اسلام ان کے سامنے چہرہ پرداز ہوا ہے۔

پچھلے دنوں میں ایسے بعض مضامین شائع ہوئے جن سے دل کو سخت دُکھ پہنچا، اور گو مجھے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن جیسے جیسے موقعہ ملتا جائیگا، اس سلسلہ میں جو اپنے حقیر معلومات ہیں، اُنھیں پیش کرتا چلا جاؤنگا، شاید غلط فہمیوں کا اس سے کچھ ازالہ ہو، میں نے قصداً اپنے اس مضمون میں خواجگانِ چشت اور ان میں بھی سلطان المشائخ کے حالات کے تذکرہ میں ذرا زیادہ طوالت سے اسی لیے کام لیا کہ ہندی مسلمانوں کی قلبی تربیت، اور اخلاقی نشوونما ایمانی رسوخ، اعتقادی شگفتگی، شرح صدر، کا زیادہ کام اسی خانوادہ سے متعلق رہا، اور ان میں بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء کے خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ ان ہی کے حالات پر دوسرے بزرگوں کے حالات کو بھی قیاس کیا جائیگا، واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی زندگی اور اپنے پیغمبر کے دین کی مخلصانہ خدمت، جتنی راستبازی، وفاشعاری، بے نفسی کے ساتھ ان بزرگوں نے انجام دی ہے، بڑی ناشکری ہوگی اگر غیروں کے اغواء سے جس کا اکثر حالات میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا، ان کے خدمات کی اہمیت گھٹائی جائے۔ اصل حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا جس دن "السرائر" کو "الظاہر" کا رنگ دیا جائے گا، لیکن یوں بھی عام مسلمانوں کا "تلقی بالقبول" میرے نزدیک تو ان بزرگوں کی مقبولیت الٰہیہ کی دلیل ہے، آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن اسی زمانہ کے لوگوں کی یہ روایت ہے کہ جب سلطان المشائخ پر وقت ناگزیر آگیا تو ٹھیک جو حال شیخ کبیر شکر گنج کا نماز کے باب میں تھا کہ بار بار پوچھتے، اور دُھرا دُھرا کر ایک ہی نماز کو ادا کرتے، یہی حال سلطان المشائخ پر بھی طاری تھا، نیم بے ہوشی کی سی حالت تھی، اسی حالت میں، پوچھتے۔

"وقت نماز شدہ است و نماز گذاردہ ام، اگر گفتند کہ شما نماز گذاردہ اید می فرمود بار دیگر بگذارم"

پھر جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں بیان کیا ہے کہ انبار خانہ اور جو کچھ بھی گھر میں تھا، سب کو آپ نے بٹوا دیا، لٹوا دیا، لوگوں نے "مقام مستودع" یعنی قبر کے متعلق دریافت کیا، فرمایا

من زیر عمارت کسے خفتنی نہ ام، من در صحرا خواہم خفت[1]"

عیادت کے لیے شیخ زکریا ملتانی کے پوتے مولانا رکن الدین آئے، بعض تشفی و تسلی کے کلمات فرما رہے تھے، اور یہ کہ اللہ آپ کو ہم لوگوں میں زیادہ دیر تک سلامت رکھے، تا ناقصاں را کمالے حاصل شود" اس وقت سلطان المشائخ چشم پر آب کرد و فرمود"

"من حضرت رسالت را صلی اللہ علیہ وسلم در خواب دیدہ ام کہ می فرمود نظام! اشتیاقِ تو مارا بسیار است"

مجلس اِن کلمات کے سننے کے ساتھ چیخ اُٹھی، مولانا رکن الدین پر بھی گریہ طاری تھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے خدمات کی قیمت آج گھٹائی جا رہی ہے، بلکہ جن پر رسول کے دین کے بگاڑ کا الزام لگایا جا رہا ہے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہ میں اس کا اور اس کے کارناموں کا کیا مقام ہے، رضی اللہ ورسولہ عنہم ورضوا عنہما

خدا جانے اصل مضمون کو میں نے کہاں چھوڑا تھا، غالباً اسی کا ذکر ہو رہا تھا کہ ہمارے قدیم تعلیمی نظام کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دماغوں کی تصقیل و تشحیذ کے بعد میدان عمل میں آنے سے پہلے عموماً قلوب کی تصحیح کا مسئلہ قریب قریب ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اسی سلسلہ میں خواجگانِ چشت اور ان کے قرآنی ذوق کا ذکر آ گیا، بات چونکہ عام خیالات کے خلاف تھی، ضرورت ہوئی کہ ذرا تفصیل سے کام لیا جائے سلطان المشائخ کا وجود میرے نزدیک صرف چشتیوں ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے عام صوفیا

---

[1] میر خورد نے لکھا ہے کہ حضرت والا کو لوگوں نے ایک کھلے میدان میں ہی حسب خواہش دفن کیا تھا، آنجا کہ روضہ متبرکہ سلطان المشائخ است صحرا بود" لیکن بعد کو اسی محمد تغلق نے قبر شریف پر گنبد عمارت کنانید" (سیر الاولیاء ص ۱۵۴)

ہیں ایک مثالی وجود تھا، اور ان کے حالات بھی ایسے ذرائع سے جو ممکنہ حد تک تاریخ میں معتبر ترین ذرائع سمجھے جا سکتے ہیں بآسانی مل سکتے تھے، اس لیے ان کے تذکرہ میں کافی طوالت سے قصداً کام لیا گیا، گویا سمجھنا چاہیے کہ ایک طرح سے سلطان المشائخ کی سوانح عمری ہی درج ہوگئی، اگرچہ اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے، خدا کرے کہ اس کے لکھنے کی مجھے توفیق میسر ہو، واللہ علی مایشاء قدیر۔

اب میں اپنے اصل مضمون کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ نری دماغ کی تصحیح سے علم صحیح کے فوائد و ثمرات نہ خود عالم کو حاصل ہو سکتے ہیں، اور نہ دوسروں کو جیسا کہ چاہیے وہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس خیال کی تائید غالباً سلطان المشائخ کی زندگی کے واقعات سے بھی ہو سکتی ہے، علی الخصوص محضر سماع والی مجلس میں دل کی اصلاح سے غافل ہو کر محض دماغ والے مولویوں نے جو مکروہ نمونے اپنی نفسانیت، دنائت، حسد، انانیت وغیرہ کے پیش کیے، اس سے بھی قلبی تصحیح کی ضرورت آپ خود انصاف کیجیے کہ کتنی اہم ہو جاتی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ قاضی جلال الدین لوالجی جیسا عالم بھی باوجود سب کچھ جاننے کے محض سلطان المشائخ کی شخصی عداوت اور حسد کے نشہ میں سرشار ہو کر علانیہ بھرے دربار میں اس قول کی ہمت کرتا ہے کہ

"ایں حدیث متمسک شافعی ست، او دشمن علمائے ماست مانمی شنویم ونمی دانیم"

اور یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے متعلق مدعی ہوتا ہے کہ میں اس کو نہیں مانونگا، میر خورد کا بیان ہے کہ قاضی جلال الدین نے بادشاہ کے سامنے سلطان المشائخ کو اس کی بھی دھمکی دی، کہ

"اگر سماع بشنوی من حاکم شرع ام ترا بیازارم"

سلطان المشائخ قاضی کی تمام باتوں کو سن کر "حلم می ورزید و تحمل می کرد" لیکن اس کی اس دھمکی پر زبان مبارک سے صرف "معزول باد" کا فقرہ نکل گیا، کہتے ہیں کہ "بعد از دوازدہ روز معزول شد"

خیر یہ تو الگ بات ہے، میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ علم جب تک دماغ اور تن سے تعلق رکھتا ہے اُس وقت تک آستین کے سانپ سے زیادہ اس کی وقعت نہیں، اس کی کیسی اچھی مثال ہے۔

اسی کے مقابلہ میں اسی دلّی کے دوسرے قاضی محیی الدین کاشانی کو دیکھیے، شیخ محدث وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ التمش کے عہد کے مشہور قاضی شہر قاضی قطب الدین کے نواسے تھے، اور مدتوں خود بھی درس و تدریس کا کام اُنھوں نے شہر میں انجام دیا تھا، اسی وجہ سے "استادِ شہر بود" لیکن دماغ کے ساتھ ان کو اپنے قلب کی اصلاح کا موقع بھی سلطان المشائخ کی صحبت میں مل گیا تھا، ان کی استعداد و صلاح مزاج کو دیکھ کر سلطان المشائخ نے ان کی خاص تربیت کی تھی، جس خاص خدمت کے لیے ان کا انتخاب سلطان المشائخ نے کیا تھا، اس کا اندازہ خلافت نامہ کے اس فقرہ سے ہو سکتا ہے جو سلطان المشائخ نے ان کو لکھ کر دیا تھا، آخری فقرہ یہ تھا۔

فان فعلت ما امرتك فظنی بك ان تفعل كذلك فانت خليفتی وان لم تفعل فالله خليفتی علی المسلمين۔	پس اگر تم نے وہی کیا جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے تو میرا گمان تمہارے ساتھ یہی ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے اور اس صورت میں تم میرے خلیفہ اور جانشین بن سکتے ہو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر مسلمانوں کی نگرانی کے لیے میرے خلیفہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

مجھے یہی دکھانا ہے کہ یہ سارا قصہ بھی "المسلمین" کے لیے تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کی حفاظت و صیانت کے لیے تھا، قاضی کاشانی میں باوجود خاندانی قاضی ہونے اور مولوی ہونے کے چند ہی دنوں میں سلطان المشائخ کی صحبت میں وہ ایمانی قوت

ؔ؎ مخدوم الملک شاہ شرف الدین منیری بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جس وقت ہو رہی تھی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ زبان مبارک پر اللهم اغفر امة محمد اللهم ارحم امة محمد (اے اللہ محمدؐ کی ...... امت کو بخش دے اے اللہ محمدؐ کی اُمت پر رحم فرما) جاری تھا، ایک سو بیس سال کی عمر کس تڑپ اور درد و سوز میں اللہ کے اس فقیر کی گذری تھی اس کا اندازہ سکرات کے ان آخری الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے ۱۲

پیدا ہوئی کہ

"مثال ادرار کہ مایۂ دانشمنداں ست بخدمت سلطان المشائخ آورد و پارہ کرد" وثیقہ وظائف شاہی ۱۲

اسی چیز نے سلطان المشائخ کی نگاہ میں ان کی بڑی قدر پیدا کر دی تھی لکھا ہے کہ سروقد ہو کر بجز قاضی کاشانی کے سلطان المشائخ اپنے مریدوں میں اور کسی کو تعظیم نہیں دیتے تھے، لیکن یہی رتبہ کی بلندی بیچارے کے لیے ایک دفعہ مصیبت بن گئی، شاہی وظائف سے دست برداری کے بعد ظاہر ہے کہ امارت اور اُس کا سارا ساز و سامان ٹھاٹھ باٹھ باقی نہیں رہا تھا، فقر و عسرت میں بسر ہوتی تھی، علاء الدین خلجی کو اس کی خبر ہوئی اُس نے فرمان صادر کیا کہ

"قضائے اودھ کہ موروث قاضی محیی الدین ست باانعامات قریات بسیار بدو مفوض دارند"

شاہی فرمان قاضی صاحب کے پاس آیا، بس غلطی یہ ہو گئی کہ اُسی وقت واپس کر دینے کی جگہ، وہ اس فرمان کو لے کر سلطان المشائخ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"سلطان بغیر خواستِ من ایں چنیں فرمانے دادہ ست تا فرمان مخدوم چہ شود"

جس کے سپرد "المسلمین" کی خدمت ہوئی تھی، اپنے اسی خلیفہ کی زبان سے ان الفاظ کا سننا تھا کہ سلطان المشائخ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ و فرمود

"البتہ مثل ایں معنی در خاطر تو گذشتہ باشد آنگاہ ایں معنی برائے تو پیش آوردہ اند"

اس فقرہ کا مطلب اس زمانہ میں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیگا، لیکن کسی زمانہ میں قلوب کی صفائی اس درجہ کو پہنچ جاتی تھی کہ خیال ادھر دل میں آیا، اور دوسروں پر اس کا عکس پڑتا تھا، اسی مسئلہ کی طرف سلطان المشائخ نے اشارہ فرمایا، اتنے برہم ہوئے کہ اُسی وقت حکم دیا کہ "خلافت نامہ" واپس کر جاؤ، یعنی جب تم سے وہ کام سرانجام نہیں ہو سکتا، اور وہی شاہی ملازمت کے شغل میں اُلجھنا چاہتے ہو، تو پھر تم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کے لیے المسلمین پر تمہیں نائب بنایا گیا ہے۔

سلطان المشائخ کی یہ خفگی کہتے ہیں کہ سال بھر تک قائم رہی، قاضی بیچارے حیران تھے کہ کیا کریں سال بھر کے بعد پھر ان کو جدید معاہدہ کا موقع دیا گیا۔ افسوس ہے کہ سلطان المشائخ کی زندگی ہی میں وفات پاگئے۔ ورنہ جو عہد کیا تھا شاید ان کے بعد وہ مسلمانوں کی خدمت کرتے۔

یہ تھا اس زمانہ میں ان لوگوں کی تربیت کا طریقہ جو اپنی زندگی قومی خدمات کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے، آج بھی لوگ "المسلمین" کا نام لے کر اٹھتے ہیں، لیکن اس جلیل خدمت کے لیے دل سے کن کن چیزوں کے نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان بیچاروں کو اس کا موقعہ نہیں ملتا، پھر بجز چند اخباری بیانوں، مجلسی تجویزوں کے عام طور پر جو شکایت ہے کہ قومی لیڈروں سے اور کچھ بن نہیں آتا، تو آپ گولر کے درختوں سے انجیر توڑنے کا خیال کیوں پکاتے ہیں، صورت اور نام کی شباہت سے حقیقت نہیں بدلتی، دماغی علم اتنے بڑے اہم کام کے لیے جو دراصل سچ پوچھیے تو پیغمبروں کی نیابت ہے، یقین کیجیے قطعاً کافی نہیں ہو سکتا اس راہ میں ذروں کو آفتاب سے اور رائی کو پربت سے کاہ کو کوہ سے ٹکرانا پڑتا ہے مولانا فخرالدین زرادی اور اُن کے علم و فضل کا ذکر مختلف طریقے سے ہو چکا ہے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ منجملہ اور مالیخولیاؤں کے محمد تغلق پر اس کا جنون سوار ہوا کہ ہندوستان سے باہر نکل کر براہ راست تاتاریوں کے ملک میں پہنچ کر ان کا قلع قمع کر دے، اس کے لیے اس نے "جہاد" کی مہم کا اعلان کیا، عظیم الشان بارگاہ نصب ہوئی، اس میں منبر رکھا گیا، مقصد یہ تھا کہ اسی منبر سے بادشاہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیگا، لیکن دعوت سے پیشتر اس نے چند علماء سے مشورہ ضروری سمجھا، جن میں ایک مولانا فخرالدین زرادی بھی تھے۔

مولانا کی حاضری کا حکم ہوا، قطب الدین دبیر جو سلطان المشائخ کے مریدوں میں تھے اور محمد تغلق کے دبیر (سکریٹری) تھے۔ یہی مولانا فخرالدین کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے جوتے اُتار کر فرش پر جب قدم رکھا تو قطب الدین دبیر نے اُن کی جوتیاں اُٹھالیں اور

بغل میں دبا کر پیچھے پیچھے چلے تغلق قطب الدین کی ان تمام حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے، کس بادشاہ کے سامنے؟ "محمد تغلق خونی" کے سامنے، بادشاہ مولانا سے خطاب کرکے پوچھتا ہے۔

"ما می خواہیم کہ آل چنگیز را بر اندازیم، شما دریں کار با ما موافقت خواہید کرد"

مولانا نے جواب میں فرمایا "ان شاء اللہ تعالیٰ"

دیوانے تغلق کی اس سے کیا تشفی ہو سکتی تھی بولا کہ "ایں کلمہ شک است"

سننے کی بات ہے، سامنے تغلق ہے، تغلق کے جلاد ہیں، اس کی کھنچی ہوئی تلوار ہے، بغیر کسی جھجک کے جواب میں مولانا نے فرمایا "در مستقبل ہمی آید"

مطلب یہ تھا کہ یہی ہو کر رہیگا، یعنی خود تمہارا عزم مشکوک اور مشتبہ ہو کر ختم ہو جائیگا، تغلق کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا، خون کھولنے لگا، لیکن کسی معمولی کردار کا سامنا نہ تھا، بات بدل دی اور بولا کہ "شما مارا نصیحت کنید"

نصیحت کی درخواست تغلق کر رہا ہے، خدا جانے کتنے نصیحت کرنے والوں کو جو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہے، کشتوں کے پشتوں سے بھرے ہوئے دربار کا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا لیکن مولانا اُسی سنجیدگی اور وقار سے تغلق کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

"غضب فرو خورید"

پوچھتا ہے، کدام غضب؟ مولانا فرماتے ہیں "غضب سبعی"

یعنی درندوں جیسا غصہ تم نے اپنے اندر پیدا کر لیا ہے کہ کسی کی ادنیٰ مخالفت برداشت نہیں کر سکتے، اس غصّہ کو پی جاؤ۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس جواب کے بعد مولانا کے سامنے اپنا جو انجام ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے، شاہی دربار کی طرف جس وقت قطب الدین دبیران کو لے چلے تھے، اُسی وقت یہ کہتے ہوئے اُٹھے تھے۔

"من سرِ خویش بر در سرائے، ایں مرد تغلق، غلطیدہ می بینم با او مسامحت نخواہم کرد او زندہ نخواہد گذاشت"

سیکڑوں کا انجام ان کے سامنے تھا، اسی پر قیاس کر رہے تھے، کچھ ہی دن پہلے اسی حق گوئی کے الزام میں مولانا عماد غوری کا سر اسی محمد تغلق کی تلوار سے اُڑ چکا تھا، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہو کہ جس زمانہ میں محمد تغلق پر جدید دین کی تجویز کا خبط سوار تھا مولانا عماد غوری کو بلا کر اس نے پوچھا۔

"فیض خدا منقطع نیست چرا باید کہ فیض نبوت منقطع شود"[1]

شیخ محدث نے لکھا ہو کہ "مولانا عماد بر فور گفت کہ گہ نخور چہ می گوئی" آخر جنم میں گہ خوری کے لیے اُس نے حکم دیا کہ "او را ذبح کنید و زبانش برآرند" ص ۲۰۱

اور ایسے واقعات تو ہر دن بلکہ دن کے اکثر گھنٹوں میں پیش آتے رہتے تھے، البتہ زیادہ تر اس کے ستم کے تختۂ مشق بیچارے وہی لوگ تھے جو اُس کے دربار کے ملازم تھے معمولی قصور پر قتل کی سزا پاتے تھے، مولانا عماد رحمۃ اللہ علیہ ان عاشقانِ پاک طینت میں ہیں جنہوں نے اپنے وقت میں اللہ اور اس کے رسول کے عشق میں "بخاک و خوں غلطیدن" کی رسم کو زندہ کیا تھا، رضی اللہ عنہ۔

بہرحال مولانا زرادی بھی اسی رسم کی تازگی پر کمرِ ہمت چست کیے بیٹھے تھے، لیکن خدا ہی جانتا ہو کیا صورت پیش آئی کہ تغلق مولانا کی زبان سے ایسی سخت بات سننے کے بعد بھی خاموش ہی رہا، بلکہ بجائے اس کے خاصہ طلب کیا۔ اور مولانا کو اپنے ساتھ بٹھا کر

"در یک صحنک بطعام خوردن مشغول شدند"

---

[1] یہی فقرہ ہو جو ہندستان کی جدید نبوت اور جدید وحی کے مدعی قادیانی مرزا کو ہاتھ لگا، اسی تغلقی فقرہ پر ان کے تنبّی کی دیوار قائم ہو، کاغذ اور سیاہی کی کمی قادیان میں تو کبھی محسوس نہیں ہوئی لیکن تحلیل و تجزیہ کے بعد سارے ہفوات کا خلاصہ اسی ایک فقرہ میں مندرج ہو حقیقت یہ ہو کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہو۔ صدیوں کے بعد پھر اسی تغلقی مالیخولیا نے قادیان میں زور باندھا ۱۲

مولانا کھانے میں شریک تو ہو گئے، لیکن چہرہ کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر سخت بار ہے تغلق کو بھی ان کے اس بار کا احساس ہو رہا تھا، لیکن خلاف معمول وہ اور نرم پڑتا جاتا تھا حتیٰ کہ مولانا کی دل دہی کے لیے۔

"گوشت از استخواں جُدا می کرد و پیش مولانا فخرالدین می نہاد"

مگر مولانا پر وہی ناراضگی کی علامت برابر باقی تھی" باکراہ تمام اندک اندک تناول می کرد" خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا، اور مولانا کو رخصت کرتے ہوئے تغلق نے حکم دیا کہ روپیہ کی ایک تھیلی اور اونی کپڑے کا ایک تھان ہدیہ میں پیش کیا جائے۔ اس کی نیت فاسد تھی، ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس ہدیہ کو اگر مولوی نے واپس کیا، بس رد ہدیہ کو خلاف سُنت قرار دے کر گردن اُڑا دونگا، اس وقت سلطان المشائخ کے صحبت یافتہ قطب الدین دبیر جان پر کھیل گئے اور قبل اس کے کہ مولانا کی طرف ہدیہ بڑھایا جائے، دبیر نے اُن کی طرف سے خود لے لیا، دبیر کو یقین تھا کہ مولانا واپس کرینگے اور دیوانہ اسی کو کاربراری کا ذریعہ بنائیگا، خدا خدا کر کے مولانا کو تغلق کے دربار سے نجات ملی اور بخیر و خوبی گھر واپس ہوئے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ مولانا کے چلے جانے کے بعد قطب الدین دبیر پر تغلق کا سارا نزلہ رجوع ہو گیا، چلا چلا کر ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"اے مزوّر شکال ایں چہ حرکتہا بود کہ کردی اول کفشہائے فخرالدین را زیر بغل گرفتی بعدہ جامہ و سیم او خود پسندی، و اورا از تیغ من خلاص دہانیدی و بلائے او بر خود گرفتی"

لیکن دبیر نے جو کچھ کیا تھا، طے کر کے کیا تھا، بادشاہ کے ان غضبناک بلکہ پیغام موت کے فقروں پر آزادی کے ساتھ اُنہوں نے بھی جواب دیا۔

"او اُستاد من است و خلیفہ مخدوم من مرا شاید کہ کفشہائے او بتعظیم بر سر گیرم فکیف کہ زیر بغلے و جامہ و سیم را خود چہ اعتبار ست"

تغلق ان کی صاف گوئی سے متاثر ہوا، پہلے تو بولا

"ایں اعتقادہائے کفرآمیز را بگذارد والّا ترا ہم خواہم کُشت"

گویا اُستاد اور پیر کی عظمت اس کے نزدیک "اعتقادہائے کفرآمیز"[1] تھی مگر "خواہم کُشت" کی دھمکی دھمکی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ اسی قسم کا ایک واقعہ تغلق ہی کے ساتھ سلطان المشائخ کے ایک اور تربیت یافتہ بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور کا بھی ہے، یہ شیخ کبیر شکر گنج کے مشہور خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے پوتے ہیں، ہانسی ہی میں ان کا قیام رہتا تھا، محمد تغلق بر سبیل دورہ ہانسی پہنچتا ہے، اطراف کے لوگ اُس سے ملنے آتے ہیں، لیکن شیخ قطب الدین منور اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ہیں، محمد تغلق کو اس کی خبر ملتی ہے، حاضری کا فرمان صادر کرتا ہے اور حسن برہنہ نامی امیر کو حکم دیتا ہے کہ فوراً شیخ کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کیا جائے، حسن برہنہ ہانسی پہنچتا ہے، شیخ کو بادشاہ کا حکم سُناتا ہے، شیخ پوچھتے ہیں، جبراً لانے کا حکم ہے یا میری مرضی کو بھی دخل ہے اُس نے کہا کہ جبراً جس طرح ممکن ہو لاؤ اسی کا حکم ہے۔ شیخ بیوی کے پاس جاتے ہیں، خدا کے حوالہ ان کو اور بال بچوں کو کرتے ہیں "مصلی بر کتف، عصا در دست گرفتہ پیادہ پا رواں شد"

حسن گھوڑا پیش کرتا ہے، انکار کیا گیا، ہانسی سے باہر نکلتے ہوئے اپنے آبا واجداد کے مقبرے کے سامنے سے گذرتے ہیں، فرماتے ہیں

"من از کنج شما باختیار خود بیروں نہ آمدہ ام مارا می برند"

شاہی بارگاہ بانسی نامی قریہ میں تھی، جو ہانسی کے قریب ہے لیکن بادشاہ بجائے ملاقات کرنے کے حکم دیتا ہے کہ شاہی کیمپ کے ساتھ ان کو دلّی لے چلو، اب ساتھ ساتھ منزل بمنزل دلّی پہنچتے ہیں، دلّی میں ان کے صاحبزادے میاں نورالدین بھی آجاتے ہیں، تغلق شیخ کی حاضری کا حکم دیتا ہے، شیخ نورالدین صاحبزادے بھی ساتھ ساتھ جاتے ہیں، شاہی محل سرا میں

---

[1] کاش! اس زمانہ میں تغلق نہ ہوا، بہت پہلے پیدا ہو گیا، ورنہ قادیاں کے سوا، ہندوستان کے اور بہت سے دائروں میں اس کی پوجا ہوتی۔ گویا جن باتوں کو آج ہم سُن رہے ہیں، ان سب کا بانی اوّل وہی تھا۔

دونوں باپ بیٹے داخل ہوتے ہیں، ہر طرف ننگی تلواریں لیے سنتری ٹہل رہے ہیں، در و دیوار سے دہشت و خوف کی بارش ہو رہی ہے، شیخ قطب الدین مطمئن آگے بڑھے چلے جاتے ہیں، لیکن کمسن نوجوان شیخ نورالدین کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے، بیٹے کو پلٹ کر شیخ اس حال میں پاتے ہیں، فرماتے ہیں۔

"بابا نورالدین العظمۃ والکبریا للہ" (یعنی بابا نورالدین بڑائی اور عظمت صرف اللہ ہی کے ہے)

یہ وہ نشہ تھا، توحید کا جو سلطان المشائخ کی مجلس میں پلایا جاتا تھا، نورالدین سنبھل جاتے ہیں، تخت سامنے نظر آتا ہے۔

ہاتھ میں تیر و کمان ہے، بادشاہ کا غصہ سے چہرہ بگڑا ہوا ہے، آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں، شیخ السلام علیکم کہتے ہیں، مصافحہ کے لیے بادشاہ ہاتھ بڑھاتا ہے، شیخ ہاتھ ملاتے ہیں، ہاتھ کا ملانا تھا کہ تغلق کا رنگ فق پڑ جاتا ہے، خدا جانے کیا کچھ کہنے کے لیے تیار بیٹھا تھا، لیکن اب زبان سے جو الفاظ اس کے نکلتے ہیں وہ یہ ہیں۔

"من در دیار شما رسیدیم تربیت نہ فرمودند و بملاقات خویش مشرف نہ گردانیدند"

شیخ اسی توحیدی سکینت و وقار کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

"ایں درویش خود را دریں محل نمی دارد کہ ملاقات بادشاہاں کند، در گوشہ بدعا گوئی بادشاہ و کافہ اہل اسلام مشغول می باشد، معذور می باید داشت"

تغلق چپ ہو جاتا ہے، اور فیروز باربک جو بعد کو فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہوئے ان کو حکم دیتا ہے "انچہ مطلوب شیخ ست، ہمچناں کنید"

شیخ پھر فرماتے ہیں: "مقصود من نقد و مطلوب من کنج جلد و پدرست"

محمد تغلق یہ سن کر ان کو رخصت کر دیتا ہے، میر خورد نے تغلق کے ایک نامی امیر اعظم ملک کبیر معظم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ شیخ کی روانگی کے بعد محمد تغلق نے اہل دربار کو مخاطب کر کے کہا کہ جس کسی نے مجھ سے آج تک مصافحہ کیا،

"البتہ دست او لرزید مگر ایں بزرگ کہ بقوت دین دست ما محکم گرفتہ بود .... از

سیمائے او مہابت دین احساس کردم"

لیکن دین کی یہ مہابت اور ہاتھ میں یہ قوت کہ محمد تغلق جیسا جابر بھی، ان کی نگاہوں میں پر پشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، یہ کہاں سے پیدا ہوا تھا؟ آگے قصہ سنیے تغلق نے فیروز شاہ، اور مولانا ضیاء الدین برنی کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ان کو مطلع کرو

"بادشاہ یک لک تنکہ انعام فرمود"

خبر شیخ کو پہنچتی ہے، بے ساختہ زبانِ مبارک سے "نعوذ باللہ ایں درویش یک لک تنکہ قبول کند" تکہ سا جواب دے دیا جاتا ہے، دونوں بادشاہ کی خدمت میں شیخ کے انکار کی خبر پہنچاتے ہیں،

"فرمان شد کہ پنجاہ ہزار بدہید"

مگر شیخ کو انکار ہی پر اصرار رہا، آخر میں تغلق عاجزی کے ساتھ کہلا بھیجتا ہے۔

"اگر شیخ ایں مقدار قبول نہ کند خلق مرا چہ گوید"

بالآخر بڑے ردو کد کے بعد دو ہزار پر بات طے ہوئی، شیخ اس رقم کے لینے پر راضی ہو گئے اور اس لیے راضی ہو گئے .... کہ فیروز شاہ اور برنی دونوں نے عرض کیا کہ "ما کم ازیں نتوانم پیش تخت ذکر کردن کہ شیخ ایں ہم قبول نمی کند"

شیخ قطب الدین نے دونوں کو جواب دیا:-

"سبحان اللہ درویش را دو سیر کھچڑی و دانگے سیر روغن کفاف باشد او ہزار ہا چہ کند"

یہی چیز تھی جو سلطان المشائخ دین کے خادموں کے قلوب میں پیدا کرتے تھے۔ جس دل سے ہزار ہا کا وزن نکل گیا۔ اگر "تغلق" کا وزن پشک شتر سے بھی کم لسے محسوس ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ روپے والوں کا بوجھ تو وہی اپنے اندر پاتے ہیں جن کے دل پر روپیہ کا وزن ہو، جب روپیہ ہی کا وزن نہ رہا صرف دو سیر کھچڑی اور دانگے سیر روغن زرد زندگی گذارنے کے لیے جنہیں بس کرتا ہو وہ بھلا کسی کے بس میں آسکتے ہیں؟

سبک روح تجرد بھی کہیں پابند ہوتے ہیں — شمیم گل کے نقاشو! ذرا تصویر تو کھینچو

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآئَهٗ — یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو دہلاتا رہتا ہے
فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ — پس نہ ڈرو ان سے اور مجھ ہی سے ڈرو اگر تم
مُّؤْمِنِيْنَ . — ایمان والے ہو۔

کے قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل ہے، بلکہ اس کا زندہ اور دکھا ہوا تجربہ ہے کہ "الشیطان" کی ولایت سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کی ولایت ہی کو جو اپنی پناہ گاہ بنا لیتے ہیں، ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی دھمکی نہیں دے سکتی "محمد تغلق" کی عنان گسیختہ طغیانیاں بھی جس دل کو ہلا نہیں سکیں، خود اندازہ کرنا چاہیے کہ ایمان قوت کے جن لامحدود خزانوں سے قلوب کو بھر دیتا ہے، اس قوت کو جانچنے کے لیے اس سے بھی بہتر کسوٹی کیا اور مل سکتی ہے، جس کے کام ہی سے نہیں صرف نام کے سننے سے بھی روح لرز جاتی ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ولایت الہیہ کے وارثوں کا صرف مصافحہ بلکہ صرف "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" کی ایک جھلک اسی کو کپکپا دیتی ہے، شیخ قطب الدین منور کے صاحبزادے شیخ نورالدین کا بیان ہے، میر خورد نے غالباً براہ راست ان کی زبان سے سنا ہے کہ بارگاہ شاہی کے سرادق جلال سے مرعوب ہو کر جب ان کے پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی، اور شیخ منور نے ان کو "الکبریاء للہ" کی ڈانٹ سے چونکایا تو فرماتے ہیں

"بمجرد آں کہ ایں سخن (العظمۃ والکبریاء للہ) بسمع من رسید تقویتے در باطن من ظاہر گشت اطمینانے و استظہارے حاصل شد"

کیسا اطمینان، کیسی پشت پناہی، جس کا احساس ان کے نوجوان قلب نے محسوس کیا؟ خود کہتے ہیں: "چنانکہ آں ہیبت و رعب از دل من بکلی زائل شد"

تغلق کے دربار میں "دور دیہ آہن پوشاں تیغ بکمر و گرز بدوش امرا و ملوک برپا ایستادہ" جو لوگ کھڑے تھے، غالباً شیخ نورالدین اسی نظارۂ ہوش ربا سے متاثر تھے لیکن فرماتے

ہیں کہ احساس کی تبدیلی کے ساتھ ہی "آن امرا، وملوک در نظر من ہمچو گوسپنداں بنودند"

یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں ہی، ذاتی تجربہ ہی، اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ ہی، پہلی دفعہ نہیں بلکہ جب کبھی "ایک" ہی کا خوف دل میں قائم ہوا ہی تو ہر ایک کا ڈر یوں ہی نکل بھاگا ہی" آدم اور آدم کی اولاد ڈرنے ہی کے لیے پیدا ہوئی ہی اس کی سرشت کی افتاد، اور فطرت کی ساخت یہی ہی مجانین یا پاگلوں کے سوا، آدمی کی عقل جب تک سلامتی اور صحت کی حالت میں رہتی ہے ڈرنے کا مشورہ دیتی رہیگی لیکن فرق صرف اس قدر ہی کہ "ایک" سے اگر آپ نہیں ڈرینگے، جس سے ڈرنے کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا ہی، تو عقل مجبور ہی کہ "ہر ایک" سے ڈرنے کا آپ کو مشورہ دے، لیکن بجائے "ہر ایک" کے اگر "ایک" ہی کی خشیت اور ڈر میں آپ کا دل ڈوب گیا، اسی کی عظمت اور کبریاء کے استحضار و شعور میں غرق ہو گیا، تو اُس وقت وہی عقل ایمان کی روشنی میں "ہر ایک" سے بے پروا ہونے پر اصرار کرتی ہی۔

میرے نزدیک صحیح حریت اور آزادی یہی ہی، باقی جو لوگ نہ ایک سے ڈرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ہر ایک سے بھی نہیں ڈرتے، کم از کم میری سمجھ سے یہ باہر ہی کہ اپنے عقلی احساسات کے کچلے بغیر اس دعوے کی ہمت ان میں کیسے پیدا ہوتی ہی، جو بے زور ہی، اس کو زور والوں سے قطعاً ڈرنا چاہیے جو نہتا ہی اُس کو ان لوگوں سے دبنا چاہیے جن کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں، بندوقیں ہیں، اُس وقت تک ڈرنا چاہیے، دبنا چاہیے، جب تک کہ کسی زیادہ زور آور کی ولایت وحمایت کا اُسے یقین نہ حاصل ہو جائے۔ زندگی میں بھی۔

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل — اللہ ہمیں بس ہی بڑا اچھا وکیل

کی نہ ہلنے والی چٹان پر اپنے آپ کو جو کھڑا پاتا ہو، اور موت یا قتل کے متعلق بھی۔

وَلَئِنْ مُتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْن — اور اگر تم مرے بھی یا قتل ہوئے تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤگے۔

کی نہ بجھنے والی روشنی اس کے سامنے جگمگا رہی ہو، لیکن اس کے بغیر جن کمزوروں کی زباں سے

"ہم کسی سے نہیں ڈرتے" "دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی" کے الفاظ نکلتے رہتے ہیں، یقین کیجیے کہ یا ان کی عقل جنون کی آفت سے ماؤف ہے۔ یا جو کچھ وہ بولتے ہیں، صرف بولنے کے لیے بولتے ہیں، وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے صرف کہنا چاہتے ہیں، یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے دماغی تصحیح کے ساتھ قلبی اصلاح کا جو ایک مرکب نظام اس ملک میں قائم کیا تھا، اس کے حیرت انگیز نتائج و آثار ہندی اسلام کی پہلی صدی ہی تک محدود رہے اس میں شک نہیں کہ نتائج کی آب و تاب، ان کی تازگی اور رونق میں دن بدن انحطاط پیدا ہوتا رہا، ان چھ صدیوں میں اُتار چڑھاؤ کے بیسیوں حوادث سے اسے گذرنا پڑا لیکن یقین کیجیے کہ اس وقت تک جب تک کہ ہماری زندگی کی واپسیں سانس اس ملک میں پوری ہوئی، حکومت کے چراغ کی آخری ٹمٹمانے والی لو جب تک نہ بجھی تھی، اور بزرگوں سے تعلیم و تربیت کا جو نظام وارثت میں، ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا تھا، جب تک کہ آخری برہمی کا وہ شکار نہ ہوا تھا، اس وقت تک اِن انقلابی ہستیوں کے سوا جو اس ملک کی دینی و علمی تاریخ میں "مقام خاص" کے مالک ہیں، یوں بھی ملک کا کوئی گوشہ ان رسیدہ پھلوں سے خالی نہ تھا جس کا پھلنا تعلیم و تربیت کے اس "شجرۂ طیبہ" میں تقریباً لازمی تھا، جسے صدیوں کے مسلسل تجربات کے بعد ہمارے بزرگوں نے یہاں نصب فرمایا تھا، ضخیم تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، اگر کتابوں سے ان کے بکھرے ہوئے حالات ایک جگہ جمع کیے جائیں۔

سمجھانے کے لیے میں نے آپ کے سامنے تقریباً ہندی اسلام کی پہلی صدیوں کے چند نمونے اب تک پیش کیے ہیں، اب تک میری گفتگو کا دائرہ زیادہ تر ان ہی بزرگوں کی حد تک محدود رہا ہے، جن کا تعلق ساتویں اور آٹھویں صدی کے آغاز سے ہے، اب میں آپ کے سامنے چند مثالیں گیارہویں بلکہ بارہویں صدی ہجری کی مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مختصر کتاب "مآثر الکرام" سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں، جس کا کسی صوبہ، یا ضلع، یا تعلقہ کے باشندوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اودھ کے قصبہ "بلگرام" ہی کے لوگوں سے تعلق ہے، ایک قصبہ

کی پیداواروں کا جب یہ حال تھا، تو اسی سے اندازہ ہوسکتا ہی، کہ سارا ملک کس رنگ میں رنگین ہوگا، اس میں شک نہیں کہ بلگرام کا شمار ہمیشہ سے ہندوستان کے ایک مردم خیز قصبوں میں ہی، لیکن یہ صحیح نہیں ہی کہ اس کو علم یا دین کی کوئی خاص مرکزیت حاصل تھی خود مولانا آزاد بھی باوجود وطن دوست ہونے کے یہ مانتے ہیں کہ خود اودھ ہی میں بلگرام جیسے بیسیوں قصبات تھے، ابوالفضل نے تو بلگرام کے ذکر میں لکھا ہے۔

"قصبہ ایست خوش ہوا، بیشتر مردم آں خوش فہم و سرود سرا"

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خوش فہمی کے ساتھ جہاں سرود سرائی کا بھی لوگوں کو عارضہ ہو، وہاں خوش فہمی سے صحیح استعمال کہاں تک لیا جاسکتا ہی، گو اسی کے ساتھ ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہی کہ

"درآنجا چاہے ست کہ ہر کہ چہل روز آب از و آشامد شناسائی و حسن منظر فزاید"

شناسائی کا واللہ اعلم کیا مطلب ہی، دقت نظری یا معرفت کچھ بھی ہو، لیکن ظاہر ہی کہ یہ تو خوش اعتقادی کے زمانہ کی باتیں ہیں، خوش اعتقادی کا ایسا زمانہ کہ ابوالفضل جیسے بد اعتقاد آدمی کو بھی اس کے تذکرہ میں ندامت محسوس نہیں ہوئی، لیکن بداعتقادی کے اس عام دور میں اب کنوؤں کے پانی سے حصولِ شناسائی کی کون توقع کرسکتا ہی۔

بہرحال میری غرض یہ ہی کہ ان مثالوں کو مثالوں ہی کی حیثیت سے پڑھنا چاہیے، یہ خیال غلط ہوگا کہ یہ بلگرام کی خاص خصوصیت تھی، بلکہ اس زمانہ کے ماحول کی یہ عام پیداواریں تھیں، جن میں بلگرام نے بھی اپنا حصہ پایا تھا،

میں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستانی تصوف خصوصاً طریقہ چشتیہ کی خاص خصوصیت "سلوک بالقرآن" تھی، گو ظاہر یہ دعویٰ عجیب تھا، لیکن الحمدللہ جو شواہد اور وثائق آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد بھی کیا لوگوں کا تعجب باقی رہا ہوگا، لیکن وہ مثالیں تو ساتویں اور آٹھویں صدی کی تھیں، اب آئیے گیارہویں یا بارہویں صدی میں آئیے، دیکھیے کہ ہندوستانی

مسلمان اس وقت تک بھی قرآن کو کس طریقہ سے استعمال کر رہے تھے۔

مولانا آزاد نے سید نور اللہ نامی ایک صاحب کا ذکر کیا ہے، مولانا ان کے دیکھنے والوں میں ہیں اس لئے جو کچھ سُنایا جائیگا، شنیدہ نہیں، بلکہ زیادہ تر "دیدہ" ہی ہوگا،

ان ہی سید نور اللہ صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ دماغی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قلبی تصحیح کی فکر میں گھر سے باہر نکلے دلی پہنچے کسی پر نظر جمی نہیں، سیدھے سلطان المشائخ کے جوار میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے، کچھ دن کے بعد یہاں سے پھر بلگرام ہی واپس گئے بلگرام میں اس وقت دولے دل کا کام سید لطف اللہ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھا، مولانا آزاد بھی خود ان ہی کے دست گرفتہ ہیں، عوام سید صاحب کو میر لدھا یا پیر لدھا کے نام سے پکارتے تھے، اور مولانا آزاد اپنی کتاب میں، ہر جگہ ان کو سید العارفین کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں، سید نور اللہ سید العارفین میر لدھا صاحب کے برادر صغیر تھے، ان ہی سے آکر بیعت حاصل کی اور ان ہی کی صحبت میں اپنے علم میں عمل کے رنگ بھرنے کی مشق بہم پہنچانے میں مشغول ہوئے، استعداد بالغ تھی رنگ بہت جلد نکھرنے لگا، مولانا ہی فرماتے ہیں "حالتے عجب بہم رسانید" یہ حالت عجیب کیا تھی؟ "شبہا چشم کم برہم می زد"

لیکن رات کی ان تاریکیوں میں کیا تارے گنتے تھے، دوربین لگا لگا کر آسمانی فضاؤں میں دب اصغر اور دب اکبر کی جستجو کرتے تھے، مولانا فرماتے ہیں۔

"اکثر اوقات می گریست در رکوع گاہے وگاہے در سجود شب را صبح کردے"

استغراق کا یہ عالم تھا کہ

"احیاناً بعض اوقات حالت رو داد کہ تا یازدہ روز بیشتر اکل و شرب نمی پرداخت"

مگر باوجود اس استغراق کے جوان کا ایک خاص حال تھا، بیداری کی یہ کیفیت تھی کہ سید العارفین کی مجلس میں ایک روز قلندر بیٹھا تھا، کہیں سے مزامیر (باجوں) کی آواز آئی، قلندر نے میر صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہا،

"جائے کہ مزامیر ست رواں باید شد"

سید نور اللہ جو عموماً خاموش رہتے تھے وہ بھی سامنے بیٹھے تھے، مہر سکوت ان کی ٹوٹتی ہے، قلندر سے پوچھتے ہیں: "درانجا چیست؟"

قلندر نے قلندرانہ جواب یہ دیا۔ گفت "اللہ ست"

یعنی "جہاں باجا ہے وہاں خدا ہے" اس فقرہ کا سننا تھا کہ سید نور اللہ میں حمایت شریعت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے، کھڑے ہو جاتے ہیں، قلندر کا ہاتھ پکڑتے ہیں، اور گرجتی ہوئی آواز میں "برخیز اسداً بنما" صرف دعویٰ نہیں دلیل کا سوال تھا، قلندر کی ساری قلندریت غائب ہو گئی، کھسیانی صورت بنا کر ان کا منہ دیکھنے لگا، سید صاحب پر جلال طاری تھا، آخر سید العارفین نے اُٹھ کر قلندر کو ان کے ہاتھ سے نجات دی،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی توہین ہو رہی تھی، سید صاحب کو ہوش آ گیا، مگر جانتے ہو، یہی ہوش بے ہوشی سے کب بدلتا تھا، کیا طبلہ کی کسی تھاپ، یا کسی راگ کے الاپ پر، مولانا آزاد راوی ہیں،

"شبے نماز تراویح بجماعت می خواند"

قرآن سُن رہے تھے، براہِ راست خالق کائنات کے مخاطب تھے

امام بریں آیت رسید فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا (تم کم ہنسا کرو اور چاہیے کہ زیادہ رویا کرو) درعین نماز بے ہوش افتاد)

خدا جانے کب ہوش آیا، مگر آیا تو کس حال میں آیا، "تا پندرہ روز از گریہ نیاسود"

جس "اللہ" کو الٰہ بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے سپرد کیا تھا، اسی الٰہ کی تلاش میں سید صاحب کو کہیں رکاوٹ پیدا ہوئی، پیر سے خواہاں ہوئے، بعض اشغال اور تدبیریں بتائی گئیں، مشکل حل نہ ہوئی

میں جب کہتا ہوں کہ ہندوستان کا تصوف قرآنی تصوف تھا، لوگ حیران ہوتے

ہیں، آپ اس سلسلہ میں جو کچھ سن چکے وہ تو سن ہی چکے لیکن وہ تو ہندی اسلام کی ابتدائی قرون کی باتیں تھیں، سُنیے بارہویں صدی میں بھی سلوک کی راہ میں مرید رکاوٹ محسوس کرتا ہے پیر علاج تجویز کرتا ہے۔

"برو قرآن مجید حفظ کن" مآثر الکرام ص ۱۲۰

جس کی تلاش تھی، اس کے پانے کی قریب ترین راہ یہی ہوسکتی تھی، محبوب مل بھی جائے۔ ع "تم ہمارے سامنے ہو، ہم تمہارے سامنے" کا نظارہ بھی پیش آجائے، لیکن دل کی بیکلی "کچھ اپنی ہم سنائیں، کچھ وہ سنائیں اپنی" کے بغیر کیا مٹ سکتی ہے؟ "قرآن حفظ کن" اسی کی تدبیر تھی، مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

"چند جزاز قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت"

اب بات ہی کیا باقی رہتی ہے، عمر زیادہ گذر چکی تھی، لیکن چند جزء کے بعد کل اجزاء قرآنی کے حفظ کی دھن سوار ہوگئی، جب تک جیتے رہے، اسی شغل میں جیتے رہے۔

"بست و پنج جزیاد کردہ بود"

کہ جس وقت کے لیے جی رہے تھے، وہ وقت آگیا، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جب "وقتِ احتضار رسید" پوچھا گیا "تمنائے بہ خاطر دارید"
نزاع

ساری آرزوؤں کو سینے سے نکال کر ایک ہی آرزو کی لذتوں میں جو ڈوب گیا تھا، سنتے ہو، بارہویں صدی کا ہندی مسلمان بھی یہی جواب دیتا تھا

"ہمیں تمنا باخود دارم کہ پنج جزاز قرآن باقی ماند فرصت حفظ نہ یافتم"

پانچ پاروں کے حفظ کی تمنا گور تک لیجانے والے کی وفات کی تاریخ مولانا آزاد کو "بشریٰ لکم الیوم جنات" ملی۔
۱۱۵۰

جس قرآن میں حفظ کرتے تھے وہ گم ہو گیا، گھر کے لوگوں کو تلاش تھی، خواب میں آئے اور اطلاع دی کہ "قرآن در خانہ فلاں در فلاں محل ست" اور بیداری میں لوگوں نے "چوں خبر گرفتند ہمانجا یافتند"

اللہ کی راہ میں مرنے والوں کے متعلق قرآن میں "بل احیاء" یعنی وہ مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں کی خبر دی گئی تھی، خواب میں جس خبر دینے والے کی بات بیداری میں دیکھی گئی کیا خواب کی اس تجربی تفسیر کے بعد بھی یہی سمجھا جائیگا کہ ایسے لوگوں کا صرف نام زندہ رہتا ہے، ورنہ واقع میں وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔

مولانا آزاد نے بارہویں صدی کے اس واقعہ کے ساتھ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبد العزیز شکر بار جو حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد میں ہیں، یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک قاری حضرت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ، خوش الحانی کے ساتھ سورۂ ق کی تلاوت اُس نے شروع کی، جوں ہی کہ

"بآیہ نَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مِن حَبلِ الوَرِید (میں اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں) رسید حالت شوق غلبہ کرد، سہ مرتبہ کلاہ از سر مبارک برقص آورد"

قاری طبع عالی کا مذاق شناس تھا، اب تک جو قریب سے آگے بڑھ کر اقرب کی

---

[1] فقیر سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی سابق صدر الصدور سرکار آصفیہ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ان کے چچا نواب عبد الشکور خاں مرحوم کے پاس حضرت مولانا عالم علی صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لایا کرتے تھے، مولانا کو کشف قبور میں خاص ملکہ تھا، ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، ایک بی بی صاحبہ جن کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا ان کی قبر پر مراقب ہوئے، اور فرمایا کہ ان بی بی صاحبہ کے پاس کسی نے اپنی جوتیاں امانۃً رکھنے کو دی تھیں اس عرصہ میں ان کا انتقال ہو گیا، کہتی ہیں کہ ان جوتیوں کی وجہ سے ان کو تکلیف ہے، پتہ یہ بتاتی ہیں کہ فلاں کمرے کے فلاں مقام پر جو صندوق رکھا ہوا ہے، اس کے کپڑوں کے نیچے جوتیاں ہیں، جس کی امانت ہے پہنچا دی جائے، لوگوں نے تلاش کیا، ٹھیک جوتیوں کا جو پتہ اُنھوں نے دیا تھا، وہیں نکلیں، حافظ ابن قیم نے کتاب الروح میں عہد صحابہ کا بھی واقعہ کچھ اسی نوعیت کا درج کیا ہے کہ خواب میں اپنے دوست صحابی کو مرنے کے بعد اُنھوں نے اطلاع دی کہ میرے مکان کے چھپر میں سینگ کے اندر اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں، جو ایک یہودی سے میں نے لی تھیں، تم یہودی تک ان کو پہنچا دو، صحابی جنھوں نے خواب دیکھا تھا، ان کے گھر آئے، پردہ کیا، اور چھپر میں دیکھا تو ٹھیک جہاں پر اُنھوں نے اشرفیوں سے بھرے سینگ کا پتہ دیا تھا ملا، گھر والوں سے اُنھوں نے قصہ خواب کا بیان کیا، اور ان کی اجازت سے یہودی کو دے آئے یہودی اس قصہ کو سُن کر مسلمان ہو گیا۔ اس قسم کے تجربات کا ایک ذخیرہ کتابوں میں ملتا ہے۔

شکل میں محسوس ہو رہا تھا، قاری نے جیسا کہ مولانا آزاد لکھتے ہیں،

بازحافظ آیت ھوالاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم

(وہی اول بھی ہے، وہی آخر بھی ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے، وہی ہر شے کا دانا و علیم ہے)

پڑھنا شروع کیا، مولانا لکھتے ہیں کہ

"شیخ را طرفہ ذوقے و حالتے بہم رسانید چوں قرآن تمام کرد و آیت سبحان ربک

رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین

خواند، حضرت شیخ ہر دو دست مبارک بر روئے مشکبوئے فرود آورد و بر سینہ فیض گنجینہ برد"

اہل مجلس کی نظر اسی پر تھی کہ اچانک انہیں محسوس ہوا، کہ شیخ

"جان بجاناں تسلیم نمود" ماثر الکرام ص ۷۵۔

میں صرف نمونہ دکھا رہا ہوں، ہندوستانی مسلمانوں کا جو تعلق قرآن سے تھا، ہندی اسلام کی ابتدائی وسطانی و آخری صدیوں سب ہی کے نمونے اور سب ہی کی شہادتیں آپ کے سامنے گذر رہی ہیں، استیعاب مقصود نہیں صرف ان چھوٹوں سے جو آج اپنے بڑوں سے اسی لیے روٹھے بیٹھے ہیں کہ ہندوستان میں پہنچ کر انھوں نے خدا کے کلام سے رشتہ توڑ لیا، رسول کی حدیثوں کو اس ملک میں آکر چھوڑ دیا، ان نوآگاہوں کی آگاہی کی ایک راہ کھولنی ہے، ورنہ ان واقعات کی اس ملک میں کب کمی رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی وفات ان کی قرآن پر نہیں بلکہ کسی شعر پر ہوئی ہے، کسی نے

کشتگانِ خنجر تسلیم را   ہر زماں زغیب جانے دیگرست

شہادت کے کشتوں میں شریک ہو کر غیب کے زندوں میں اپنے آپ کو شریک کیا "سجن المومن" سے آزادی کسی کو "خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی" پر میسر آئی، تو کیا واقع میں یہ سب شعر تھا، لوگ غور نہیں کرتے ورنہ جسے وہ شعر سمجھ رہے ہیں، قرآن میں پا سکتے ہیں، اور کیا یہ کوئی ایک دو قصے ہیں، تعلیم کا وہ نظام ہی اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ جینے والوں میں مرنے کا

صحیح سلیقہ پیدا ہو جائے۔ ساری تربیت کا حاصل اسی دن سامنے آتا تھا جس دن اس دنیا سے وہ روپوش ہوتے تھے[1]

میں نے کسی جگہ سید محب اللہ بلگرامی کا ذکر کیا ہے کہ عہد جوانی میں "در شش ماہ قرآن یاد کرد" مولانا آزاد نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "سر حال شعار خود ساخت" سپاہیوں کے لباس میں رہتے تھے، عالمگیر کے صاحبزادے محمد اعظم کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے، شاہزادہ کو اجین مالوہ کی صوبہ داری سپرد ہوئی، فوج بھی ساتھ گئی، میر صاحب بھی اندر قرآن اور باہر ڈھال و تلوار لگائے شاہزادے کی فوج کے ساتھ اجین پہنچے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اجین کے قریب ایک مقام جس کا نام "سرائے سیپی" ہے گھوڑے پر سوار جا رہے تھے، وہیں "سرائے سیپی" کے کسی باغ میں گھوڑے سے اُترے، زین پوش بچھائی، خدام جو ساتھ تھے اُن کو بھی روک لیا، گٹھری سے نیا سفید لباس نکالا، پہنا، شربت بنایا، پیا، اور "بہ تلاوت قرآن مشغول گشت" تلاوت ختم ہوئی، قرآن جزودان میں رکھا گیا، اور خود "چادر کشیدند" چادر تنی کی تنی رہ گئی، لوگوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ

"جاں بحق سپردہ است" رحمۃ اللہ علیہ (مآثر۔ ص ۱۲۸)

عالم نہیں، فاضل نہیں، پیر نہیں، فقیر نہیں، فوج کے ایک سپاہی کو دیکھ رہے ہو جو قرآن نے اپنا اثر اس پر قائم کیا تھا،

قرآن کے ساتھ جن کے اگلوں کا بھی یہی رشتہ تھا، پچھلوں کا بھی یہی تعلق تھا، جو

---

[1] میری ایک کتاب "دم واپسیں" کا بکھرا ہوا مواد غیر مرتب حال میں پڑا ہوا ہے، چند اجزاء اختصاریات کے عنوان سے القاسم دیوبند میں شائع بھی ہوئے تھے پھر سمیٹنے کا موقع نہ ملا، خدا کرے کہ توفیق میسر ہو، عجب واقعات ہیں، ان کے بھی جو مرنے کے لیے جیتے تھے اور اُن کے بھی جو جینے پر مصر تھے، لیکن بہر حال ان کو مرنا پڑا، ---- میں نے مذکورہ بالا دو واقعات میں دراصل حضرت خواجہ بختیار کاکی اور حضرت حاجی امداد اللہ چشتی مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا محمد حسین الہ آبادی کی وفاتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو عام طور پر مشہور ہیں۔ قطب صاحب کا انتقال پہلے شعر پر اور مولانا الہ آبادی کا دوسرے شعر پر ہوا۔ ۱۲

درمیان میں تھے، ان پر بھی یہی کیفیت طاری تھی، خواص بھی اسی رنگ میں عوام بھی اسی حال میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کے بعد بھی لیا اپنے بزرگوں سے منہ پھلانا ان عزیزوں کا درست ہوسکتا ہے، جن کے منہ خواہ جتنے بھی پھولے ہوئے ہوں، لیکن ان میں شاید کسی ایک کا دل بھی قرآن کے لیے اتنا پھیلا ہوا نہ ہوگا، جس انشراح اور وسعتوں کا نظارہ ہم ان بزرگوں کے قلوب میں کر رہے ہیں۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ جب صور میں پھونکا جائیگا۔

والی مشہور قرآنی آیت سے اثر پذیر ہوکر جامع ترمذی میں ہے کہ ایک تابعی خَرّ مَغشِیًّا علیہ (جھکر اکر نماز میں گر پڑے) اور اسی بیہوشی میں وفات پاگئے، بلاشبہ یہ واقعہ بھی اہم تھا، اور ہے، اسی لیے ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں اس کو جگہ دی، لیکن پوری کتاب میں ایک واقعہ ہے، لیکن قرآنی مخدرات کی دلبریوں، بلکہ جاں برآریوں کے کرشموں کو دیکھ رہے ہو، ہندوستانیوں کی کوئی کمی ہے، یاران عزیز!

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن

آخر حدیث میں بھی تو ہے

اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ اپنے موتی کا ذکر نیکی سے کیا کرو۔

ھٰذا والسلام علی من اتبع الھدیٰ

اس سلسلہ میں سردست جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا، آخر میں ایک بات جس کا گذشتہ بالا واقعات میں مولانا آزاد نے تذکرہ کیا ہے، دل چاہتا ہے کہ تنبیہ کیے بغیر اسے نہ چھوڑا جائے، میرا اشارہ سید نوراللہ کے ترجمہ کے اس جزو کی طرف ہے یعنی مولانا آزاد نے جو یہ لکھا ہے۔

"وقتے اوراد رسطے ایں راہ مشکلے پیش آمد بخدمت سید العارفین اظہار کرد، حضرت

شغلہا فرمودند عقدہ وا نہ شد آخر فرمودند برو قرآن مجید حفظ کن، چند جزو از قرآن حفظ کردہ بود کہ عقدہ انحلال پذیرفت، آمدہ بپائے حضرت افتاد و باقی قرآن یاد کردن گرفت" (ص ۲۰)

اس واقعہ کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ اس وقت اس کے نقل کرنے سے میری غرض پھر اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا ہے جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے، پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ "حفظ قرآن" کو اس راہ کی مشکل کے حل کا ذریعہ کیا جوگیوں میں بتایا جاتا ہے، ہندوستان کا تصوف جوگ اور یوگ سے ماخوذ ہے، اس دعوے کے مدعیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسی تصوف کا نام جوگ اور بیراگ ہے؟ یہ سید العارفین جنہوں نے اپنے مرید کو حفظ قرآن کا مشورہ دیا، ان کے طریقۂ عمل کی خصوصیت مولٰنا آزاد نے یہ بیان کی ہے

"ریاضات شاقہ کہ آدمی را مزمن سازد نمی فرمودند واگر در اربعین من نشاندند اغذیہ لطیف می دادند، می فرمودند کہ قوام انسان غذا ہست اگر تندرست است جہاد از وخوب می آید واگر ناتواں قصور واقع شود"

اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً ان کے مرید سید نور اللہ کے متعلق جو یہ بات گذری کہ گیارہ گیارہ روز تک کچھ نہیں کھاتے تھے یہ ان کا خاص حال تھا، یہ خیال کرنا کہ خود مرشدوں کی طرف سے اس کی تعلیم دی جاتی تھی، میرے نزدیک اکثریۃً یہ صحیح نہیں ہے، اور کبھی کبھی اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اُس کی حیثیت کسی وقتی علاج کی تھی، اسی قسم کا وقتی علاج جیسے حضرت کعب بن مالک صحابی کا علاج بارگاہ نبوت سے وقتی طور پر یہ کیا گیا تھا کہ عموماً صحابہ کو ان سے ملنے جُلنے بات چیت کی ممانعت کر دی گئی تھی، حتیٰ کے آخر میں ان کی اہلیہ کو بھی اسی کا حکم دیا گیا تھا جس کی تفصیل بخاری میں موجود ہے، لیکن ظاہر ہے کہ چالیس پچاس دن کے لیے حضرت کعب کو یا ان کے ساتھ دو اور صحابیوں کو جو اس حال میں رکھا گیا تھا، اس کا تعلق ان کے خاص ذاتی خصوصیات سے تھا، اس کی حیثیت عام قانون کی نہ تھی، مولانا آزاد نے یہ بھی ان ہی سید العارفین کے متعلق لکھا ہے کہ

"ازدلق پوشیدن، ومرقع دوختن، وخود را در نظر خلق وانمودن، منع می کردند واز تاہل وکسب معاشش کہ سنت سنیۂ انبیاست بازنمی داشتند"

سید العارفین سے ان کے تصوف کا حاصل مولانا نے جو نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے

"مرد آں ست کہ ظاہرش بامعاملہ خلق متفق باشد، وباطنش دریاد مولیٰ مستغرق" ص۱۱۱

آپ اگر دیکھینگے تو عام اسلامی صوفیہ کا آپ کو یہی مسلک نظر آئیگا، البتہ ان میں جو حضرات ملّی اور دینی خدمات کے لیے اپنے آپ کو پابند بنا لیتے تھے، تو ظاہر ہے کہ کسبِ معیشت کا ان کو موقعہ کہاں سے مل سکتا تھا، خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو منصب نبوت ودعوت پر سرفراز ہونے کے بعد کوئی معاشی پیشہ اختیار نہیں فرمایا تھا، لوگ باوجودیکہ عموماً ان باتوں سے واقف ہیں مگر پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہندوستانی جوگیت اور ہمارے بزرگوں کے طریقۂ کار میں لوگوں کو کیا مشابہت نظر آئی، جو یورپ کے اس افترا کے تسلیم کرنے پر مضطر ہو گئے۔ یورپ تو تصوف ہی نہیں، ہمارے سارے علوم بلکہ خود ہمارے دین ہی کو بجرا

لہ اور سید العارفین کے متعلق تو آپ پڑھ رہے ہیں کہ وہ کسب معیشت سے لوگوں کو صرف "بازنمی داشتند" یعنی منع نہیں کرتے تھے، مگر کسی مولوی یا کسی معاشی مسلمان نہیں بلکہ طبقہ صوفیہ کے سرخیل، اس راہ میں ایک خاص مکتب خیال کے بانی حضرت علاء الدولہ ابو المکارم سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مولانا جامی نے نفحات ص۵ مطبوعہ کلکتہ میں ان ہی کا یہ قول نقل فرمایا ہے، یہ فرمانے کے بعد کہ "حق تعالیٰ زمین ومزارع را بحکمت آفریدہ" یعنی زمین اور اس کی کھیتیوں کو خدا نے مصلحت اور حکمت سے پیدا کیا ہے، حضرت سمنانی فرماتے تھے "می خواہد کہ معمور باشد وفائدہ بخلق رسد" (یعنی خدا چاہتا ہے کہ زمین اور اس کی قابلِ کاشت زمین آباد رہیں اور ان سے خلق اللہ کو نفع پہنچے) اس کے بعد ہے "اگر خلق بدانند کہ از عمارت دنیا کہ برائے فائدہ ودخل کنند نہ بوجہ اسراف چہ ثواب است ہرگز ترک عمارت نہ کنند" (یعنی دنیا کی آبادی جو بغرض فائدہ اور آمدنی کی جائے محض فضول خرچی مقصود نہ ہو اگر لوگوں کو اس کا ثواب اور اجر معلوم ہو تو ہرگز زمین کو غیر آباد نہ رکھیں)، اسی طرح "اگر بدانند کہ از ترک عمارت وگذاشتن زمین را معطل چہ گناہ حاصل می شود ہرگز نہ گذارند کہ اسباب او خراب شود" (یعنی غیر آباد رکھنے میں جو گناہ ہوتا ہے اگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو ہرگز آبادی کے اسباب و ذرائع کے برباد ہونے پر کوئی تیار ہو سکتا ہے) بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے آخر میں ارشاد ہے تمثیل سے سمجھایا گیا ہے۔ "ہر کسے کہ زمینے دارد کہ ہر سال ازاں زمین ہزار من غلہ حاصل می تواند کرد اگر بتقصیر واہمال نہ صد من حاصل کند بسبب آں صد من از خلق خلق دوا افتد بقدر آں ازوے باز خواست خواہند کرد (یعنی کسی کے پاس زمین ہے جس سے ہزار من

(باقی صفحہ ۲۶۸)

راہب اور ورقہ بن نوفل کی تعلیم سے ماخوذ قرار دیتا ہی، پھر ایک بیچارے صوفیہ نے کیا قصور کیا تھا، کہ اسلامی صفوں سے ان ہی کو باہر نکال کر سرقہ و انتحال کے الزام میں ان ہی کو گردن زدنی قرار دیا گیا، اس الزام سے اسلام کا کونسا شعبہ محفوظ ہی، ہندو فقیروں، جوگیوں، بیراگیوں کا طرز عمل کوئی ایسا پوشیدہ راز بھی تو نہ تھا کہ اسلامی صوفیہ کے طریقۂ کار اور اس کا موازنہ اور مقابلہ ناممکن تھا، ابوالفضل طبا طبائی، سبھوں نے تحقیق کے ساتھ "ہندی تصوف" کی کیفیت لکھی ہی، کم از کم لوگ اسی میں پڑھ لیتے ہیں، طباطبائی کی کتاب سیر المتاخرین سے نقل کرتا ہوں کہ اس کے الفاظ ذرا مانوس ہیں، یہ بتا کر کہ ہندو درویشوں کی چند قسمیں ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"نخستیں (اول قسم) صنف سناسیاں ازاں خاک نشیناں جمعے مہر خاموشی برلب نہادہ حرف زدن ندارند"

یہی لوگ منی ہوتے ہیں، یہ صوم صمت پر گویا عامل ہیں، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرما دی ہی، اگرچہ حضرت مریم کے قصہ میں قرآن نے اس روزہ کی طرف اشارہ کیا ہی۔

"فریقے ہر دو دست را مائل بآسماں گذارند و بعضے خود را معکوس در درخت آویختہ تمکید تن خویشتن بآتش می نمائند و چندے نظر بسوئے آسماں برداشتہ نظر بر آفتاب دوختہ دارند و برخے بہ پا ایستادہ شب و روز می گذارند"

آپ ہی بتائیے کہ جو پانچوں وقت کی نماز اور وہ بھی باجماعت جس کے لیے پڑھنا ضروری ہو، کیا وہ اسلامی صوفی ان عجیب و غریب مشاغل کو مذہباً اختیار کر سکتا ہی، میری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷) غلہ پیدا کیا جا سکتا ہی لیکن قصداً کوتاہی اور غفلت کو کام میں لاکر بجائے ہزار من کے نو سو من ہی غلہ اس کھیت میں پیدا ہوا، تو سو من جو محض اس کی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے خلق اللہ کے منہ تک نہ پہنچ سکا، تو یہ سو من غلہ اس غافل سست عمل کاشتکار سے وصول کیا جائیگا اور اس کی باز پرس ہوگی) بتلائے جس طبقہ کا یہ خیال ہو اُس پر رہبانیت اور جوگیت کا افترا کس حد تک درست ہو سکتا ہی، تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب "اسلامی معاشیات"۔

گفتگو کا تعلق ان بازاری بھنگڑوں سے نہیں ہے جنہوں نے بے دینی کا نام دین اور لامذہبیت کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے، بلکہ اکابر و ائمۂ صوفیہ سے بحث ہے خصوصاً خواجگانِ چشت کے سربرآوردہ بزرگوں سے کہ ان ہی کی طرف ہندوستان کی خصوصیت کی وجہ سے اس قسم کے خرافات کا انتساب اس زمانہ میں ذرا زیادہ جسارت سے کیا جا رہا ہے، ان پر سب سے بڑا الزام سماع کا لگایا جاتا ہے لیکن اس کی جو اصل حقیقت بزرگوں میں تھی اسے آپ سن چکے

اور سماع کے متعلق تو میرا خیال ہے کہ جس خاص طریقہ سے بعض صوفیوں میں یہ مروج تھا، اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں بمشکل مل سکتی ہے، بلاشبہ گانے بجانے اچھلنے کودنے کا رواج بعض غیر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ہمارے بزرگوں کی سماع کی مجلسوں کا جو وقار تھا اور جن خاص خصوصیتوں کے ساتھ اکابر سماع سنتے تھے، میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں اس قسم کی مجلسوں کا رواج ہو، اب اگر کہیں مروج ہو ابھی ہو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اسلامی صوفیہ ہی سے یہ طریقہ ماخوذ ہے ورنہ کہاں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے سامنے اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر بھجن خوانی، اور کہاں پاکوں کے یہ روحانی مجالس، کاش! جن لوگوں کو ریسرچ کا شوق ہے وہ اسی مضمون پر ریسرچ کرتے، میرے لیے تو اتنا وقت نہیں ہے کہ اس پر کوئی مفصل مضمون لکھ سکوں، اس لیے ان چند اشارات ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

خیال تو کیجیے کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو، کہ معمولی جادوگروں اور ساحروں کی نفسانی قوتوں سے جو متاثر ہو جاتے ہوں اور اس کے ازالہ میں وہ اسی طرح عاملوں وغیرہ کے محتاج ہوں جیسے مادی امراض میں طبی تدبیروں کے، کیا ان ہی کے متعلق یہ قابل تصور بات ہو سکتی ہے وہ بھی کچھ اسی قسم کی نفسانی ورزشوں سے اپنے اندر تصرف وغیرہ کی قوت پیدا کرتے تھے، فوائد الفواد میں حسن علا سنجری نے براہ راست حضرت سلطان المشائخ کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے، یہ لکھنے کے بعد کہ

"بندہ ایں خبر ناخوش آنحضرت ہم در لشکر شنیدہ بود کہ کسے سحر کردہ بود ایں معنی عرضداشت کردہ شد کہ چہ گونہ بود"

جواب میں سلطان المشائخ نے جو فرمایا میر نے اُسے بجنسہ نقل کیا ہے یعنی

فرمودند کہ آرے مدت دو ماہ زحمت (بیماری) دیدم زحمتے عظیم شد تا مردے را بیاوردند کہ او در بیروں آوردن علامات سحر مہارتے داشت، القصہ آں مرد بیامد پیش خانہ وحوالی آں می گشت و ہر بار قدرے گِل (مٹی) از زمین بر می داشت و بوئے می کرد دریں میاں گلے را بوے کرد و گفت ایں جا بکاوید (کھودو) بکاوند (لوگوں نے کھودا) علامات سحر پیدا شد، آں گاہ اندک مایہ خفتے پیدا شد، دریں میاں آں مردم گفت من اں قدر مہارت می دارم کہ اگر بگویند ان کس را کہ سحر کردہ است نام آں ہم بگویم خبر بمن رسانیدند، گفتم زنہار او را منع کنید تا نگوید ہر کہ کرد من از او عفو کردم (فوائد الفواد)[۱۷۸]

سوچنے کی بات ہے کہ سحر اور جادو اور اسی قسم کی نفسانی درزشوں سے جو ایک عام آدمی کے طریقے سے متاثر ہوتے ہوں اور رد عمل کرنے والے کی دفع سحر کے لیے ان کو بھی ایسی ہی ضرورت ہو، جیسے ایک عامی آدمی کو ہو سکتی ہے۔

کیا ان کے متعلق جو گیانہ مشقوں کا شبہ بھی ہو سکتا ہے، اور کچھ سلطان المشائخ ہی کے متعلق سحر کا یہ قصہ نہیں ہے، اسی کے بعد امیر حسن علاء نے لکھا ہے کہ

"دریں میاں عرضداشت کرد شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز را نیز سحر کردہ بودند، فرمود آرے، آں سحر بروں آمد (یعنی ازالہ کیا گیا) و طائفہ را کہ ایں حرکت بود دریافتند"

آگے طویل قصہ ہے کہ اجودھن کے والی نے ان ساحروں کو گرفتار کر کے حضرت شیخ کبیر شکر گنج کے پاس بھیجا، آپ نے سب کو بخش دیا، اور حاکم سے سفارش کی کہ ان کو چھوڑ دیا جائے، واللہ اعلم والی اجودھن نے بخشا بھی یا نہیں کیونکہ اسلامی قانون میں تو ساحر واجب القتل ہے

اس واقعہ کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ بھی ہو کہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی بعض صحیح روایتوں میں جو آتا ہو کہ آپ پر سحر کیا گیا تھا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہو لیکن میرے نزدیک تو یہ دلیل ہو اس بات کی کہ اسپریچولزم، مسمریزم وغیرہ ساحرانہ اعمال کا جو شبہ خواہ مخواہ دلوں میں ایسی ہستیوں کے متعلق ہوتا ہو جن کی ساری کرامت یا سارا معجزہ تعلق باللہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس قسم کے واقعات سے اسی شبہ کی تردید قدرت کی طرف سے ہوتی ہو۔ پلٹ پلٹ کر ایک خاص مسئلہ میں میری واپسی ممکن ہو کہ بعضوں کو گراں بھی گذر رہی ہو لیکن دلوں کی ویرانی کا جو عام حال ہو اس نے میرے اندر جو زخم پیدا کیے ہیں، کیا کروں رہ رہ کر اُن ہی میں ٹیس اُٹھتی ہو، خصوصاً ان مخلص نوجوانوں پر افسوس ہوتا ہو جو ہوائے دل کی بساط کے تازہ واردہیں، دماغی تنوری کو کافی سمجھ کر ان میں اکثر اخلاص کے ساتھ عمل کے میدان میں اتر پڑے ہیں، لیکن ہلکی سی آزمائش، معمولی سا ابتلا ان کے قدم میں لغزش پیدا کر دیتا ہو اور یہ اس خامی کا لازمی نتیجہ ہو، جو غیر تربیت یافتہ قلوب میں بہرحال باقی رہ جاتی ہو، خواہ دماغوں کو کتنا ہی روشن کیا گیا ہو، آخر جس کی بینائی قوی ہو کیا ضرور ہو کہ شنوائی بھی اس کی ضعیف نہ ہو، یہی وجہ ہو کہ سارا اخلاص معمولی ٹھیس کی برداشت کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا، اچانک نفسانیت، تعصب، بے انصافی کے زہر سے سینے معمور ہو جاتے ہیں، چاہتا ہوں کہ قلبی تربیت کی جو حقیقی موروثی راہ ہو جن سے حریفوں نے بے بنیاد باتوں کے ذریعہ سے انہیں بدکا دیا ہو، اس کی متعلقہ غلط فہمیاں دور ہوں، ہو سکتا ہو کہ ان میں کوئی خیر کے ساتھ موفق ہو۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔	نہیں چاہتا ہوں میں لیکن صرف سلجھاؤ، جہاں تک میرے بس میں ہو، (صداقت) کی توفیق اور اس کے ساتھ میل اللہ ہی کے حکم سے ہو سکتا ہو اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف جھکتا ہوں

میں توچند اوراق میں ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تھا، لیکن بے اختیار مضمون نے مقالہ کی، اور مقالہ نے اب تک توشاید ایک مستقل کتاب ہی کی شکل اختیار کرلی بات میں بات نکلتی چلی آئی، قلم کو میں نے بھی نہیں روکا، واللہ اعلم حق تعالیٰ کی کیا غرض ہو۔

اشرارید بمن فی الارض — زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ (میرے ان ہفوات

ام اراد بھم ربھم خیرا — کے اظہار سے) کیا گیا ہو، یا ان کے رب نے کسی خیر کا ارادہ فرمایا ہے

بہر حال جب طوالت کا مجرم ہو ہی چکا ہوں، تو اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کیوں تشنہ چھوڑ دی جائے۔ میرا مطلب یہ ہو کہ تصوف و صوفیہ کے متعلق جہاں ایک طرف جوگیت اور بیراگیت کے اتہام کو اچھالا گیا ہو، اسی سلسلہ میں بعضوں کو دیکھا جاتا ہو کہ وہ تصوف کا رشتہ تشیع سے ملاتے ہیں، منشا صرف اتنا ہو کہ عموماً صوفیہ کرام کا رجحان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف بہ ظاہر زیادہ نظر آتا ہو، واقعہ یہی ہو یا نہ ہو، لیکن بات مشہور کردی گئی، سوچنے اور غور کرنے سے پہلے چیزوں کو چلتا کردینے کی عادت جن لوگوں میں ہوتی ہو، وہ اُسے لے اُڑے پھیلا دیا گیا کہ صوفی ایک قسم کے شیعہ ہیں، بلکہ بعض لوگ تو شیعیت کی ذمہ داری صوفیوں ہی کے سر تھوپتے ہیں۔

اس وقت مجھے اس سے بحث نہیں کہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ساتھ حضرات صوفیہ کے جس رجحان طبع کو مشہور کیا گیا ہو وہ کہاں تک صحیح ہو یا اہلِ بیتِ نبوت سے کیا واقعی صوفیوں کا تعلق جادۂ اعتدال اور ایمان و اسلام کے حقیقی اقتضاؤں سے ہٹا ہوا ہو۔ اس کے لیے تو بجائے میرے زیادہ مناسب ہوگا کہ خود ان حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ غزالی، ابن عربی، سلاسل صوفیہ کے ائمہ حضرت سیدنا الشیخ جیلی سیدنا شہاب الدین سہروردی، سیدنا بہاء الدین نقشبند عارفِ روم اور ہندوستان[1] کے مشائخ

[1] ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے خود اور ان کے بعد اس خاندان کے اکابر شاہ ولی اللہ، میرزا مظہر جاناں شاہ عبد العزیز وغیرہم حضرات نے تشیع کے خلاف میں جو کام کیا ہو وہ آج کس پر پوشیدہ ہو، اسی ہندوستان میں (باقی بر صفحہ ۲۷۳)

چشت، اکابر مجددیہ وغیرہم کے اقوال، ملفوظات مکتوبات و تالیفات پڑھیے آپ پر خود حقیقت واضح ہو جائیگی، ان میں اکثر بزرگوں کی خود لکھی مستند کتابیں موجود ہیں، اور جن کی کتابیں نہیں ہیں ان کے ملفوظات یا مکتوبات پائے جاتے ہیں۔

بہرکیف اس وقت جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مسئلہ پر اس حیثیت سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کے سامنے میں ایک نئی چیز پیش کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ صوفیہ کرام کی طرف تشیع کا انتساب صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خود شیعوں کا حضرات صوفیہ کرام کے متعلق کیا خیال ہے، حضرت غوث پاک یا مجدد الف ثانی کے متعلق تشیع کے حلقہ میں جو ناگفتہ باتیں کہی جاتی ہیں، اس کی تو شاید یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بزرگوں سے نفرت شیعوں کو شخصی حیثیت سے ہے، مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ اشخاص افراد نہیں پورے طبقہ صوفیہ کے متعلق ارباب امامیہ کے کیا خیالات ہیں، نجوم السما شیعہ علماء کی تاریخ ہے اس کے مصنف ..... مولوی میرزا محمد علی ہیں، جن کے نام کے آگے دو سطروں کے طویل القاب لکھے ہوئے ہیں، یعنی شیعوں کے کوئی مستند عالم ہیں، انہوں نے مذہب امامیہ کے ایک عالم شیخ حر عاملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"شیخ حر عاملی در رسالہ اثنا عشریہ فی رد صوفیہ آوردہ کہ جمیع شیعہ انکار بر صوفیہ داشتہ اند

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۲) حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم تھے، جو مجدد ہی نہیں بلکہ شیخ ابن عربی کے غالی عقیدت مندوں میں ہیں، ان کا نام ایک سطر کے آداب و القاب کے بغیر نہیں لیتے، ان کے متعلق حدائق حنفیہ میں یہ لکھا ہے، ان کا (مولانا بحر العلوم کا) قول تھا کہ مجھ کو عالم رویا میں حضرت ابو بکر صدیق کی زیارت ہوئی انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھ کو اپنی بیعت میں داخل کیا اور تعلیم و ارشاد طریقت کا حکم دیا، پس میں خاص ان ہی کا مرید ہوں اور ان کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجھے سلسلہ انتساب بیعت کا پہنچتا ہے ص۴۶۷ مولانا بحر العلوم کو اس باب میں اتنا غلو تھا کہ اسی کتاب میں ہے، "چنانچہ جو شخص اس سلسلہ میں ان سے بیعت کرتا تھا، آپ اُسے ایک واسطہ سے شجرہ لکھ کر اس کو دیتے تھے" ص ۔ میرا خیال ہے کہ تصوف کا اگر تشیع سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو سب سے زیادہ اس کا اثر سرخیل صوفیہ ابن عربی اور ان کے پیروؤں پر ہونا چاہیے، حالانکہ نہ شیخ ہی کا یہ رنگ ہے نہ ان کے ماننے والوں کا ۱۲۔

وتکفیر ایشاں نمودہ اند، در روایات مذہب ایشاں از ائمہ معصومین علیہم السلام نقل کردہ اند"

(نجوم السماء ص ۳۲)

[1] آپ نے جن بیچاروں پر تشیع کا الزام لگایا جارہا ہی، ان پر ایک دو طرف سے نہیں بلکہ جمیع شیعہ کی طرف سے کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہی، بعض شیعی علماء مثلاً نور اللہ شوستری یا بہاء الدین عاملی کی کتابوں میں بعض اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابن عربی وغیرہ کی تعریف پائی گئی ہی، مصنف کتاب نے سب کو تقیہ پر محمول کیا ہی، بہاء الدین عاملی کے متعلق تو یہاں تک نقل کیا ہی، کہ تقیہ کے طور پر انھوں نے جو کچھ کہا ہو، لیکن اصل اعتقاد صوفیوں کے متعلق ان کا جو تھا، اس کا اندازہ ان کے اس طرز عمل سے ہو سکتا ہی کہ

"ہرگاہ در مجلس شیخ بعضے ازاں فرقہ حاضر شدے بعد از بیروں رفتن او جناب شیخ بتطہیر فرش امر می فرمود" ص — ۳۴

یعنی فرقہ صوفیہ کا کوئی آدمی اگر ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوتا تو اس کے باہر نکلنے کے بعد ملا نور اللہ اس فرش کے دھونے کا حکم دیتے تھے جس پر غریب صوفی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح اہل سنت والجماعت میں ایک گروہ اہلِ حدیث کا پیدا ہو گیا ہی، جو صوفیہ سے بدگمان ہی، اسی طرح شیعوں میں بھی "اخباریوں" کا ایک طبقہ جو حال ہی میں ظاہر ہوا ہی اور وہ بھی "اجتہاد و قیاس" کا دشمن ہی، شاید صوفیہ سے یہ ناراضی اخباری جماعت کی کوئی خصوصیت ہی، وجہ اس کی یہ ہی کہ مصنف کتاب نے یہ بتاتے ہوئے کہ امامیوں میں اخباری جماعت کی ابتداء ملا محمد امین ابن محمد شریف استرآبادی سے ہوئی جیسا کہ اسی کتاب میں ہی:۔

---

[1] ان ہی شیعی مولویوں میں صدر شیرازی المشہور بہ صدرا بھی ہیں، چونکہ وہ صوفیوں کے معتقد ہیں اس لیے طبقہ شیعہ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے ان کے بیٹے ابراہیم نامی کے تذکرہ میں لکھا ہی:۔

"میرزا ابراہیم از علماء متبحرین وبخلاف پدر خود (صدر الدین شیرازی) سالک مسالک حق ویقین بود"

یہ بھی لکھا ہی کہ ابراہیم کی پیدایش ملا صدرا سے مصداق یخرج الحی من المیت بود (ص ۸۸)

"او رست[1] یعنی ملا امین) اول کسے کہ دروازہ طعن بر مجتہدین کشاد و فرقہ ناجیہ امامیہ اثنا عشریہ را بدو قسم منقسم گردانید[2] یکے اخباری و دیگر مجتہد" (ص ۴۱)

بہرحال مصنف کتاب نے اس تفریق کی یہ تاریخ بتا کر لکھا ہی کہ ملا امین نے

"درکتاب خود فوائد مدینہ طعن و تشنیع بسیار در حق مجتہدیں نمود، بلکہ گاہی ایشاں را بسوئے تخریب دین نسبت کردہ است"

مصنف کی اس باب میں جو رائے ہی، اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہی۔

لیکن (ملا امین) سخن نیک نگفتہ است و کلام خوب نہ کردہ و بموافقت صواب و سداد نرسید زیرا کہ فسادے عظیم بریں مرتب شدہ است" (ص ۴۲)

مندرجہ بالا قول جیسا کہ ظاہر ہی اس کی کھلی ہوئی شہادت ہی کہ مصنف کتاب کا تعلق اخباریوں (یا شیعہ وہابیوں[1]) سے نہیں ہی، بلکہ وہی پرانے خیال کے مجتہدیہ یا گروہ

---

[1] شیعوں میں گویا یہ اہل حدیث کا فرقہ ہی، ملا محمد امین کی وفات ۱۰۳۳ھ میں ہوئی ہی، یعنی گیارھویں صدی کے آدمی ہیں، یہ ٹھیک وہی زمانہ ہی جب یورپ میں عیسائی بھی دو فرقوں میں منقسم ہو کر باہم ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان تھے، یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ لاحتجاجیہ عجب اتفاق ہی کہ قسطنطنیہ جو یورپ اور ایشیا بلکہ اسلام اور عیسائیت کا سنگم تھا وہاں چونکہ ترکوں کی کڑی حکومت تھی، یورپ کے اس مذہبی فتنہ کا اثر نہ پڑا، لیکن بجائے قسطنطنیہ کے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران کا ایک شیعی عالم مجتہدین یا عیسائی اصطلاح میں کہیے کہ کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہا ہی، اور اس کے کچھ ہی دن بعد جامع ازہر کا ایک طالب العلم عرب کے ایک دور افتادہ علاقہ نجد میں پہنچ کر سنیوں کے اندر بھی یورپ کی اسی آواز کو دہرا رہا ہی کہ ہم پر علما و ائمہ کا قول حجت نہیں براہ راست قرآن و حدیث سے جو بات میری سمجھ میں آئیگی وہی مانینگے، یعنی وہی بات کہ کلیسا کی تشریح سے پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کو اختلاف تھا تورات و انجیل سے براہ راست اجتہاد کرنے کے وہ مدعی تھے، کیا ان ہی دنوں میں نصرانیت نے یورپ سے پاؤں نکال کر اسلامی ممالک کو اپنے سیاسی اقتدار کے نیچے دبانا شروع کیا۔ یہ ایک دل چسپ بات ہی، میں نے صرف اشارہ کیا ۱۲

[2] میرے اس اصطلاحی لفظ پر برہم ہونے کی ضرورت نہیں، ملا امین کے متعلق اسی کتاب میں لکھا ہی کہ "او در مدینہ منورہ اختیار مجاورت نمودہ بود و بعد ازاں در مکہ معظمہ رحل اقامت انداخت، وہ مرے بھی ہیں مکہ معظمہ ہی میں تاریخ کی کڑیوں کے ملانے والے اگر چاہیں تو بہت سی باتیں جو ابھی" بخہ رازمیں ہیں۔ (باقی بر صفحہ ۲۷۶)

مقلدہ سے تعلق ہی۔ ورنہ اگر اخباریوں سے ان کا تعلق ہوتا، تو اپنے پیشوا ملا امین کی شان میں وہ یہ الفاظ لکھ سکتے تھے کہ اس نے اچھی بات نہیں کہی ہی، اور سیدھی راہ پر نہیں چلے ہیں، ان کی وجہ سے بڑا بھاری فساد پیدا ہوا۔

میری غرض اس تفصیل سے یہ تھی کہ صوفیہ کرام سے ناراضی اور اتنی سخت ناراضی کہ صوفی جس فرش پر بیٹھ جاتا تھا، اس فرش کو دھلوالیا جاتا تھا، جن شیعوں میں صوفیہ اور تصوف کے متعلق یہ خیال ہو، کیا تماشے کی بات ہی کہ ان ہی صوفیوں پر شیعہ ہونے کی تہمت جوڑی جاتی ہی، واقعہ تو یہ ہی کہ اگر ان بزرگوں کا تشیع کی طرف میلان بھی ہوتا تو کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ شیعوں کی طرف سے ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا، اور ائمہ کی طرف سے ان کی مذمت میں روایتیں پیش کی جاتیں۔

اس وقت صوفیہ کے باب میں انتساب تشیع کے متعلق مجھے صرف اتنی بات کہنی تھی، لوگوں کی معکوس فہمیوں کا ماتم کس سے کیجیے، افسوس ہے کہ اس وقت تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہی، ورنہ میں واقعات کی روشنی میں بتاتا کہ شیعہ تحریک کا جتنی سختی سے مگر بطرز حکیمانہ کارگر و موثر مقابلہ حضرات صوفیہ نے کیا ہی، علماء ظاہر سے وہ بات بن بھی نہیں پڑی ہی، آج مسلمانوں کی اکثریت[1] جو اہل سُنّت کی شکل میں بحمداللہ کرۂ ارض پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۵) ان کو پاسکتے ہیں، میں تو ابھی صرف اسی پر اس وقت قناعت کرتا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مشاہدات و محسوسات کے خلاف دنیا میں چند خلاف واقعہ باتیں جو مشہور ہوگئی ہیں، بے سوچے سمجھے ہر شخص ان کو دہراتا رہتا ہی، اُن میں سب سے بڑا فریب اور سفید جھوٹ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کی شہرت ہی۔ جہاں جائیے، جس سے سُنیے یہی سُنیے کہ فرقہ بندیوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رکھا ہی، مسلمانوں کی بربادی اور تباہی میں تو شبہ نہیں لیکن فرقہ بندیوں کا دعویٰ قابلِ غور ہی، یہ صحیح ہی کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب غیر اقوام کے افراد شروع شروع اسلام میں داخل ہوئے تو اپنے آبائی اور موروثی جراثیم اپنے ساتھ لائے، شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جراثیم کا اثر مسلمان ہونے کے بعد بھی (باقی بر صفحہ ۲۷۷)

پھیلی ہوئی ہی، میرا دعویٰ ہی کہ سنیت کے مسلک پر کم از کم عامۂ مسلمین کو قائم رکھنے میں سب سے زیادہ مؤثر حصہ حضرات صوفیہ ہی نے لیا ہی، اہلِ بیت اطہار کے ساتھ ان کا ایک خاص ربط باوجود شدید تسنن کے اس کامیابی کی بہت کچھ ذمہ دار ہی، ورنہ مولویوں کے مناظرانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۶) کچھ دنوں ان میں باقی رہا، ان ہی آثار میں مذہبی اور اعتقادی اختلاف کا عارضہ بھی تھا۔ اسلام کے سوا آپ کسی مذہب کا جائزہ لیجیے، ایک ایک مذہب میں بیسیوں کمیونٹیاں سیپرو والے فرقے آپ کو نظر آئیں گے، اور کیسے فرقے کہ باہم خدا تک ان کے الگ الگ ہیں، کسی کا معبود شیو ہی تو کسی کا وشنو، کوئی مسیح و بیٹے کا پجاری ہی کوئی باپ کا، کوئی ماں کا، میں نے جیسا کہ کہا کہ ابتدائی صدیوں میں غیر قوموں نے اپنے اس عارضہ کو مسلمانوں میں بھی منتقل کیا، نحل والملل کی کتابوں میں ان اسلامی فرقوں کی ایک طویل الذیل فہرست نظر آتی ہی، لیکن کیا یہ حال ہمیشہ باقی رہا؟ واقعہ یہ ہی کہ بہ تدریج یہ سارے فرقی اختلافات مٹتے مٹتے کچھ ہی دن کے بعد اسلام نے زمین کے اس کرہ پر اپنا یہ حیرت انگیز معجزہ پیش کیا اور شاید ایک حد تک یہ تماشا ابھی ختم نہیں ہوا ہی کہ نسل انسانی کی اتنی بڑی برادری جس کی تعداد چالیس سے ستر کروڑ کے لگ بھگ سمجھی جاتی ہی، ان میں شیعوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا جن کی عددی حیثیت ایک فی صدی بھی مشکل ہی سے ہی بحمد اللہ ایک عقیدہ ایک خیال ایک قسم کے جذبات رکھتے ہیں، یعنی جن کی عام تعبیر اہل السنت والجماعت سے کی جاتی ہی، نادانوں کا گروہ جو یا تو فرقہ کے مفہوم سے ناواقف ہی، یا ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے اتباع اور پیروکاروں کے باہمی اختلافات کی جو نوعیت ہی اُس سے جاہل ہی، بہرحال جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہل السنت والجماعت میں بھی حنفی، شافعی، مالکی حنبلی چار فرقے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں باہم عملاً کچھ اختلافات ضرور ہیں لیکن کیسے اختلافات؟ اسی قسم کے جیسے خود حنفیوں میں امام محمد ابو یوسف، زفر، ابو حنیفہ وغیرہ کے آرا میں اختلاف ہی، غور تو کیجیے کہ حب حنفی، شافعی کے پیچھے نمازیں پڑھتا ہی، باہم ایک دوسرے سے بیعت ہوتے ہیں۔ تمام سنی مسلمانوں کے سب سے بڑے شیخ طریقت حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ حنبلی ہیں، مگر حنفی، شافعی، مالکی تمام مسلمانوں کے وہ پیشوا ہیں، کیا جن لوگوں میں اس قسم کے تعلقات ہوں۔ ان لوگوں کو مختلف فرقوں سے متعلق سمجھا جا سکتا ہی؟ لوگ کتابوں میں معتزلہ کرامیہ کے ساتھ خدا جانے کن کن فرقوں کا نام پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں وہ اب بھی موجود ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہی کہ شیعہ فرقہ کے سوا تقریباً تمام فرقے صدیاں گذریں کہ ختم ہو چکے، شاید خارجیوں کی تھوڑی تعداد مسقط وغیرہ میں سنا جاتا ہی کہ پائی جاتی ہی، ورنہ بحمد اللہ شیعوں کے سوا سارے مسلمان اس وقت ایک فرقہ اہل السنت والجماعت کی شکل میں موجود ہیں۔ بعض فرقوں مثلاً داؤدیہ، سلیمانیہ، اسماعیلیہ، اور زیدیہ وغیرہ دراصل شیعوں ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ کل شیعہ طبقہ جب سو میں ایک کی حیثیت رکھتا ہی تو وہ قابل لحاظ کب ہی، میرا خیال ہی کہ اس یکسانیت کے پیدا کرنے میں حضرات صوفیہ کا ہاتھ سب سے زیادہ ہی۔ لیکن صوفیہ کا زور جب سے گھٹ رہا ہی یا اغیار کی دسیسہ کاریاں اسے گھٹا رہی ہیں، اب پھر حالات بدل رہے ہیں، اسلامی حکومتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، عام مسلمانوں پر اقتدار رکھنے والی نہ روحانی قوتیں باقی رہیں اور نہ سیاسی ایسی حالت میں اب جو کچھ بھی پیش آئے یا آ رہا ہی تو اس کا گلہ کس سے کیجیے شاخ پر بیٹھ کر جڑوں کو کھودنے والو، کو کون سمجھا سکتا ہے کہ درخت کے ساتھ خود ان کو بھی گرنا پڑے گا۔

مباحث کتابوں میں جس شکل میں پائے جاتے ہیں، ان کے پڑھنے والوں کے اندر کسی ایک طرف غلو اگر پیدا کر دے تو کچھ تعجب نہیں۔

بہر حال "تعلیم" اور "تربیت" دونوں کا جو نظام اس ملک میں قائم تھا، قریب قریب تمام اسلامی ممالک نہیں تو اسلام کے مشرقی علاقے یعنی خراسان، ترکستان، ایران، ہندستان وغیرہ میں صدیوں سے اسی اصول پر تعلیم بھی ہو رہی تھی، اور تربیت بھی، اور یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک بجائے مشرق کے مغرب سے ایک عجیب تعلیم اور غریب تربیت کا آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا، اس کے بعد تو خیر قیامت ہی برپا ہو گئی، ہند میں بھی، مصر میں بھی، ترکی میں بھی، ایران میں بھی، حتیٰ کہ اب تو اس کی شعاعیں عرب کو بھی گرما رہی ہیں اور اسلام غریب اسلام کا آخری کوہستانی حصار یا پناہ گاہ افغانستان بھی اسی کی روشنی نما تاریکی میں بتدریج گھرتا چلا جا رہا ہے، ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا

خاتمہ اب آخر میں اسی مرحوم تعلیم و تربیت جو ہندوستان میں جاری تھی اس کی بعض دیگر خصوصیتوں کا ذکر کر کے کتاب کو ختم کر دیتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بلکہ ان سے پہلے حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہندوستان کے دینی و علمی کاروبار میں جو نئی ہلچل پیدا ہوئی، اور اس کے بعد ہندستان کی طرف سے بعض ایسی چیزیں دنیائے علم میں یا کم از کم اسلامی علوم کے حلقہ اثر میں پیش کی گئی ہیں، ان کے متعلق اگر ہمارا یہ ملک امتیاز کا دعویٰ کرے تو کچھ بیجا نہ ہو گا، اسلامی ممالک نے مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو جس نظر سے دیکھا ہے، اس کا اندازہ آپ کو اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان کے فارسی خطوط کا عربی زبان میں ترجمہ قازان (روس) کے ایک مہاجر مکہ عالم ملا مراد نے کیا، سلطان عبد الحمید خاں خلیفۃ المسلمین ترکی مرحوم کے عہد میں بغداد کے ایک عالم جلیل شہاب محمود آلوسی نے نو جلدوں میں روح المعانی کے نام سے جو قیمتی معلومات سے مملو تفسیر لکھی، بہ کثرت اس تفسیر میں آپ کو

مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات عربی شکل میں نظر آئینگے۔

یوں ہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات بدیعہ، خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ کے متعلق بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم اسرار الدین میں یہ کتاب اپنی آپ نظیر ہے متعدد بار مصر میں اس کا شائع ہونا خود اس کتاب کی افادیت کی دلیل ہے، اور شاہ صاحب کے بعد مسلسل ہندستان کا اسلامی علوم کی طرف جو رجحان بڑھتا رہا، اس نے چودھویں صدی تک پہنچتے ہوئے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کے متعلق ہندستانی علماء اسلام کے خدمات کو اتنا وزنی کر دیا ہے کہ اس وقت اگر یہ کہا جائے کہ اس باب میں ہندی مسلمانوں کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو اُسے شاید مبالغہ نہیں سمجھا جاسکتا، صرف فنِ حدیث ہی میں ان پچھلے دنوں میں جو کام ہندوستان نے کیا ہے، مصر ہو، یا عرب، ترکی ہو، یا ایران تونس ہو یا مراکش کیا اس کے مقابلہ میں اپنا کوئی سرمایہ پیش کرسکتا ہے؟ اجمالاً میں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

اسی طرح تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ہندستان کے بعض جدید کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہوسکتی ہے جسے ہم ہندستان کے ان کارناموں کے مقابلہ میں قابل لحاظ قرار دے سکتے ہوں۔

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے، وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے، عجیب بات ہے کہ باوجود اہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی، اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسن قبول اہل علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز یعنی نویں صدی کے ابتداء میں پیش ہوئی، وہ ہندوستان ہی کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے، یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے

اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مگر یہ تو پچھلے زمانہ کی بات ہے، میں نے جیسا کہ عرض کیا ولی اللٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشأت ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "نظام الفرقان" کی طرف ہے، جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث) کے سوا سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ اُنہوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہوسکتی!

بہرحال حدیث کے سوا عربی زبان میں بھی، اور عربی سے زیادہ ہندوستان کی جدید مقامی زبان اُردو میں ہندوستانی علماء نے اسلامی علوم کے مختلف شعبوں کے متعلق بعض ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ ہندوستان کا اگر اسے طغرائے امتیاز و سرمایہ ناز قرار دیا جائے تو اس کا وہ بجا طور پر حقدار ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسلام کا ایک خاص فلسفہ عہد جدید کی ذہنیتوں کے مطابق جو تیار کیا ہے، یا مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ نے سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ترتیب جس نئے انداز میں انجام دی ہے بلکہ دے رہی ہے، حتیٰ کہ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ اُردو کی اس کتاب کے چند حصوں کا ترجمہ ترکی زبان میں شائع ہوچکا ہے اور عربی میں بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے، ترجمہ کی تیاری ہو رہی ہے، یا ہوچکی ہے، اسی تالیفی ادارہ نے معرفۃ الصحابہ کے علم میں جو ضخیم مجلدات اُردو میں شائع کیے ہیں، نیز اس کے سوا دوسرے علمی شعبوں پر جن تحقیقی اور تصنیفی کاموں کا سلسلہ جاری ہے مشکل سے ان کی نظیر اس وقت آپ کو کسی دوسرے اسلامی ملک میں نظر آئیگی، خود مولانا شبلی مرحوم جو اس ادارہ کے بانی ہیں، شخصی طور پر اسلام کی سیاسی و علمی تاریخ کے متعلق جو مختلف کتابیں اُنہوں نے لکھی ہیں، انصاف سے اگر کام لیا جائے اور مذہبی اختلاف کو اعترافِ فضل

میں بلا وجہ دخل نہ دیا جائے۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کاموں کا اکثر حصہ ایسا ہے جو اپنی خصوصیات کی بنیاد پر اچھوتا ہے، اُردو ہی میں نہیں عربی میں بھی مولوی صاحب مرحوم کی تصنیفات و مقالات امتیاز خاص کے حصہ دار ہیں۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی زبان میں بھی "اسلامیات" کے متعلق اس وقت تک جتنا اچھا مواد مسلمانوں کے قلم سے منتقل ہوا ہے اس میں بھی سب سے بڑا حصہ ہندوستان ہی کا ہے، جس کا اندازہ آپ کو مصر کے جدید مصنفین کی کتابوں سے ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں زیادہ تر ان کے اقتباسات اور شواہد سید امیر علی اور صلاح الدین خدا بخش مرحوم کی کتابوں سے لیے گئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اہل قلم کے سوا گویا انگریزی بلکہ شاید کسی دوسری مغربی زبان میں بھی دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔

بہر حال ہندوستان کے یہ سارے کارنامے جو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے بعد کے ہیں، جن کی اگر تفصیل کی جائے تو میں نے جو کچھ اجمالاً عرض کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کاش! اس کام کو کوئی الگ کر کے دکھاتا، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی خبریں حقیقت یہ ہے کہ بالکل نئی ہیں، مگر میری بحث کا زیادہ تر تعلق چونکہ ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم اور اس کے نتائج سے ہے اس لیے چند ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جنہیں بظاہر چنداں اہمیت حاصل نہیں، لیکن خصوصیت بہر حال خصوصیت ہے جب اس تعلیم اور اس کے نتائج کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہو رہی ہے تو خصوصیت و امتیاز کے اس پہلو کو کیوں چھوڑ دیا جائے، بلکہ ممکن ہے جیسا کہ آئندہ شاید معلوم بھی ہو، کہ خصوصیت کے سوا ہندوستان کے ان خصوصی خدمات کی کوئی چاہے تو قیمت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں بارہویں صدی کے وسط میں ایک کام ہندوستان کا وہ ہے جسے ہم چاہیں تو اسلامی علوم کا اسے انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف قرار دے سکتے ہیں۔

میں حضرت شیخ محمد علی بن علی التھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "کشاف اصطلاحات الفنون" کی طرف اشارہ کررہا ہوں عربی دائرۃ المعارف کے مصنف بستانی نے بھی "التھانوی" کے عنوان سے مولانا کی اس کتاب کا وزندار الفاظ میں ذکر کیا ہے (دیکھیے جلد ششم ص ۳۴۷ (دائرۃ المعارف للبستانی)

افسوس ہے کہ صاحب کتاب کے متعلق باوجود تلاش و کوشش کے اب تک صرف اتنا ان ہی کی کتاب سے معلوم ہو سکا کہ ان کا نام اور نسب تو یہ تھا، جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

یقول العبد الضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولانا اتقی العلماء محمد صابر الفاروقی السنی الحنفی	یعنی عرض کرتا ہے بندۂ ضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن مولانا محمد صابر جو اتقی العلماء کے لقب سے ملقب تھے (اپنے نسب کی طرف فاروقی کے لفظ سے اور عقیدۂ عمل کے لحاظ سے سُنّی حنفی ہونا اپنے کو بیان کیا ہے۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ علمی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا غالباً آپ کے خاندان میں قضا کا عہدہ بھی چلا آرہا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں سب اپنے والد سے پڑھی تھیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

فلما فرغت من تحصیل العلوم العربیہ والشرعیہ من حضرۃ جناب استاذی والدی	یعنی علوم عربیہ اور دینیہ شرعیہ کی تعلیم سے میں فارغ ہوا اور یہ تعلیم حضرت جناب والد سے میں نے حاصل کی۔

البتہ علوم عقلیہ مثلاً طبعیات، الٰہیات ریاضیات وغیرہ فنون کا اُستاد کی امداد کے بغیر خود مطالعہ کیا ہے، جو ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

شمرت عن ساق الجد الی اقتناء ذخائر العلوم الحکمیۃ الفلسفیہ والحکمۃ الطبیعیہ والالٰھیۃ والریاضیۃ کعلم	میں علوم حکمیہ فلسفیہ اور حکمت طبعی، الٰہی، ریاضی مثلاً حساب، ہندسہ، ہیئت، اسطرلاب وغیرہ کے سیکھنے کے لیے آمادہ ہوا، لیکن ان فنون کے

الحساب والهندسه والهيئة الاسطرلاب ونحوها فلم يتيسر تحصيلها من الاساتذة فصرفت شطرا من الزمان الى مطالعة مختصراتها الموجودة عندی فکشفها الله علیّ

اساتذہ سے پڑھنے کا موقع نہ مل سکا، تب میں نے ان فنون کی مختصر کتابوں کا مطالعہ شروع کیا جو ہمارے پاس موجود ہیں، خدا نے ہم پر ان کے مسائل کھول دیے۔

بس ان چند اجمالی باتوں کے سوا اور کوئی تفصیلی چیز ان کے متعلق کسی کتاب میں اب تک نہیں ملی ہے۔ تذکرۂ علمائے ہند میں بھی ان کا ترجمہ درج نہیں ہے، جو محل حیرت ہے، دیباچہ کے آخر میں مصنف نے یہ لکھ کر "احصل الفراغ من تسوید ہا سنہ الف ومائۃ وثمانیہ وخمسین" یعنی ۱۱۵۸ھ میں اس کتاب کی تصنیف سے وہ فارغ ہوئے جس کا مطلب یہی ہوا کہ بارہویں صدی کے عالم ہیں، گویا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے ہمعصروں میں ہیں

بہرحال مصنف کتاب کے حالات نہ معلوم ہوں تو کام تو موجود ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان سے پہلے اس قسم کا جامع اور حاوی کام کسی اور اسلامی ملک میں انجام دیا گیا ہے[1]۔ زیادہ سے زیادہ دو کتابیں یعنی میر سید شریف کا مختصر رسالہ "تعریفات" اور ابوالبقا کی کلیات کے سوا مجھے کسی دوسری کتاب کا اس سلسلہ میں حال معلوم نہیں لیکن کشاف کے مقابلہ میں جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دو کتابوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر کو اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور کلکتہ سے مدت ہوئی ٹائپ کے حروف میں دو ضخیم جلدوں کی شکل میں یہ کتاب شائع کی گئی لیکن اب تقریباً نادرالوجود ہے، صرف یہی اس کتاب کی خصوصیت نہیں ہے ہر قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ جو مسلمانوں میں ان کے زمانہ تک مروج تھے ان کے اصطلاحات کی تعریفیں کتابوں سے اخذ

---

[1] ایک کام قریب قریب اسی نوعیت کا ہندوستان کے جنوبی علاقہ احمد نگر میں مولانا عبدالنبی احمد نگری نے دستورالعلماء نامی کتاب کے ذریعہ سے دیا ہے جس کے بعض اقتباسات کا ذکر اس کتاب میں بھی میں نے کیا ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے مدت ہوئی یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے ۱۲۔

کرکے اس کتاب میں درج کردی گئی ہیں بلکہ خود اپنی ذاتی تحقیق سے بھی مصنف نے بکثرت کام لیا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کتاب دنیا کی انسائیکلوپیڈیاؤں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا ہے، بشرطیکہ چینی اور جاپانی انسائیکلوپیڈیاؤں کو مستثنیٰ کردیا جائے کیونکہ وہ خصوصاً چینی انسائیکلوپیڈیا تو دیوارِ چین کی طرح دنیا کے عجائبات میں ہے، لیکن ان کے سوا یورپ میں بھی جو انسائیکلوپیڈیائیں لکھی گئی ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے اتفاقاً کی اس عجیب وغریب کتاب کے بعد ہی مرتب ہوئی ہیں۔ انگریزی، فرنچ وغیرہ مغربی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا کا رواج اٹھارویں صدی کے وسط میں ہوا۔

البتہ فارسی میں ایک کتاب نفائس الفنون فی عرائس الفنون ضرور ایسی کتاب ہے جسے حاویات اور محیطات کے سلسلہ میں جگہ دی جاسکتی ہے، لیکن پھر بھی کشاف الاصطلاحات والفنون کے مقابلہ میں یہ کتاب نہیں آسکتی۔ امام رازی نے بھی ایک کتاب حدائق الانوار فی حقائق الاسرار نامی ترکی بادشاہ کے نام سے لکھی ہے کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ساٹھ علوم کے مسائل جمع کردیے گئے ہیں، مگر اسی کے ساتھ غالباً اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان (جس سے میں کشمیر وغیرہ کو مستثنیٰ نہیں سمجھتا) کے ایک کشمیری عالم شیخ الاسلام مفتی قوام الدین محمد حسن کی وفات سنہ ۱۲۱۹ھ میں ہوئی ہے صاحب حدائق حنفیہ نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ آپ نے

"کتاب صحائف سلطانی ساٹھ علم میں تصنیف کی۔" ص ۴۶۲

واللہ اعلم بالصواب یہ امام رازی کی کتاب سے ماخوذ ہے یا شیخ الاسلام نے کوئی الگ کتاب لکھی ہے، بہرحال ہے تو ہندوستان کی یہ بھی ایک چیز۔ اسطرح واجد علی خان کی کتاب کشاف الاصطلاحات والفنون کے بعد دوسری چیز اس سلسلہ میں جو قابل ذکر ہے وہ وہی ہے جس کے متعلق میں نے پہلے بھی وعدہ کیا ہے، فیضی کی غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام فیضی اور ابوالفضل دونوں کے پدر بزرگوار کے دینی پہلو کے متعلق جو میرے خیالات

ہیں، مختلف حیثیتوں سے بغیر کتمان کے میں اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں لیکن

"عیبہا جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"

ناانصافی ہوتی، اگر میں اس کے ذکر سے لاپروائی برتتا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی، اشارہ ملا ابوالفیض فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام کی طرف کر رہا ہوں، یوں تو اہل علم میں ایسا کون ہوگا، جو ان کی اس تفسیر اور اس کی خصوصیت خاصہ سے واقف نہ ہو، میں نے بھی شاید اشارے اس کی طرف کیے ہیں، لیکن اس تفسیر کے پیچھے جو واقعات ہیں، ان پر لوگوں کی کم نظر گئی۔

اتنا تو سب ہی جانتے ہونگے کہ ملا فیضی نے عربی زبان میں کامل تیس پارول کی تفسیر ایسے الفاظ میں کی ہے جن میں ہر لفظ غیر منقوط ہے۔ یہ تفسیر مدت ہوئی چھپ چکی ہے، اہل علم کی نظروں سے عموماً گذرتی رہتی ہے یوں تو ظاہر ہے کہ کلام اللہ کی تفسیر کا کام ابتداء اسلام سے اس وقت تک جاری ہے، اور ٹھیک جس طرح حق تعالیٰ کے کام کے منافع کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے، اور ہر دن اس عالم کون کے نئے ناموس فطرت کے نئے قانون کا علم بنی آدم کو ہو رہا ہے۔ باوجود اس کے طے شدہ ہے کہ جو کچھ جانا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی نہیں جانا گیا ہے، بجنسہ یہی حال اللہ کے کلام کا بھی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں، جلد ہا جلد میں اس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں، لیکن ہر قرآن پڑھنے والے کو کم از کم اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ اس کتاب کو جتنا سمجھا گیا ہے اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو نہیں سمجھا گیا ہے، خواہ جو نہیں سمجھا یا گیا ہے وہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مشہور روایت

لَا تَنْقَضِی عَجَائِبُہٗ وَلَا یُخْلَقُ عَلٰی کثرۃ الرد — قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے، اور بار بار دہرانے سے وہ پرانی نہیں ہو سکتی۔

میں قرآن کی اس لامحدودیت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، اپنے ایک رسالہ "کائنات روحانی" میں مدت ہوئی، بعض نقاط خیال کا اظہار کیا گیا تھا، خیر یہ ایک مستقل بحث ہے، اس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ مذہبی اور دینی حیثیت سے فیضی اور اس کے طرز عمل کے متعلق جو رائے بھی رکھی جائے، اور مُلّا عبدالقادر نے جو حالات اس شخص کے بیان کیے ہیں، کون ایسا مسلمان ہے جو اس کے بعد بھی اپنے دل میں فیضی کے متعلق کوئی گنجائش پا سکتا ہے، لیکن میری گفتگو اس وقت صرف علمی اور ادبی حیثیت سے ہے، اور اسی لحاظ سے مُلّا فیضی کے اس کام کو ہندوستانی تعلیم کے نتائج میں کم از کم میرے نزدیک نمایاں مقام حاصل ہے، اس تفسیر کی ضخامت پچھتر جز ہے، اور یہ واقعہ ہے، مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود مُلّا نے یہ کمال کیا ہے کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق عموماً جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہے، ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مولانا غلام علی آزاد نے بھی اپنے زمانہ تک اس کا دعویٰ کیا ہے۔

"کہ دریں ہزار سال پیشتر تا ہیچ مستعدے را میسر نہ شد"

اور اس سے بھی طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ پچھتر جزوں کا یہ ضخیم مجموعہ کتنے دنوں میں تیار ہوا ہے، مولانا لکھتے ہیں۔

"طرفہ ایں کہ ایں چنیں کار دشوار وا درعرض دو سال از مبدء (آغاز) با منتہیٰ (ختم) رسانید"

ہندوستان کے نظامِ تعلیم کا دماغی ارتقا پر کیا اثر پڑتا تھا، مُلّا فیضی کے ذاتی عقائد کچھ ہوں لیکن ان کی اس تفسیر کو تو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے، یا دو سال کی مختصر مدت میں ایسے عجیب وغریب کام کا پورا ہونا کیا کوئی معمولی بات ہے، رہ گئی یہ بات کہ آخر اس ادبی زور جس کا عملاً ظاہر ہے کہ ایک "فخریہ قصیدہ" سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں ہے، اس کے محرکات عقبی کیا ہیں؟

واللہ اعلم بالصواب، پہلی بات تو میری سمجھ میں وہی آتی ہے جس کا اظہار ابوالفضل نے آئین اکبری میں کیا ہے، ابوالفضل نے ایک مستقل باب اپنی اس کتاب "ہندوؤں کے علوم وفنون" کی تفصیل کے لیے مختص کیا ہے، اور اس کے ذیل میں اس نے سنسکرت زبان کی نحو وصرف، قرأۃ، بدیع، بلاغت وغیرہ وغیرہ مختلف علوم کا ذکر کیا ہے، وہیں لکھتے لکھتے آخر میں اس کے قلم سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ہیں۔

"پیش ازاں کہ بدیں زبان (سنسکرت) سخنے آشنا شود"

یعنی سنسکرت زبان کا تھوڑا بہت علم میں نے جو حاصل کیا ہے اس سے پہلے

"چناں می دانست کہ ضابطہ لغت عرب بے ہمتا باشد"

مگر جب سنسکرت زبان سے آگاہی حاصل ہوئی تو آپ فرماتے ہیں۔

"اکنوں چناں پیدائی گرفت (ظاہر شد) کہ ہندی نژاداں فراواں کوشش بجا آوردہ اند وکار را استوار ساختہ"

گویا عربی زبان جو عہدِ اکبری میں ہر قسم کی تحقیر و توہین کی مستحق قرار پا چکی تھی، اس کے مقابلہ میں ایک اور باضابطہ زبان کا سراغ لگا یا گیا، گو ابوالفضل نے کھُل کر تو اظہار نہیں کیا ہے، لیکن انداز کا رجحان بتا رہا ہے کہ سنسکرت کو عربی کے مقابلہ میں فضیلت بخشی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ ہم جیسے لوگ جو سنسکرت زبان سے قطعاً نا آشنا ہیں، ابوالفضل کے اس دعوے کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن جس خاندان سے اس دعوے کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی گھر سے عربی زبان کے متعلق کم از کم عظیم سرمایہ داری کا جو ثبوت فیضی کی اس تفسیر سے ملتا ہے، میں تو گونہ ابوالفضل کی اس تعریض کا اسے ایک قدرتی جواب سمجھتا ہوں، بلکہ عہد اکبری میں بھی "عربی الفاظ" سے، فارسی زبان کی العیاذ باللہ تطہیر کی جو خفیہ تحریک اٹھی تھی، جس کے ثبوت میں علاوہ ملا عبدالقادر کے بیان کے خود ابوالفضل کی طرز تحریر کو پیش کیا جاسکتا ہے، اپنی

پوری کتاب میں گویا قسم کھائے ہوئے ہی کہ سمتوں کے بیان میں مغرب اور مشرق کے عام الفاظ استعمال نہیں کریگا بلکہ اس زمانہ میں ٹھیک جس طرح ججھی اور اُتری دغیرہ کے الفاظ سے شائستہ کانوں کو مجروح کیا جا رہا ہی۔ ابوالفضل بھی مغرب کی جگہ باختر اور مشرق کی جگہ خاور کے الفاظ استعمال کرتا ہی، شمال اور جنوب کے متعلق فارسی میں جو الفاظ تھے، شاید وہ اتنے نسیاً منسیا ہو گئے کہ ابوالفضل کو غالباً لغتوں میں بھی اس کا پتہ نہ چلا، اس لیے مجبوراً شمال و جنوب کو استعمال کرتا ہی، انتہا، یہ ہی کہ کسی ملک کی مشرقی حد کو "خاور رویہ" مغربی سرحد کو "باختر رویہ" کہنے سے کبھی نہیں تھکتا، "مرکز" کی جگہ التزاماً "بن گاہ" کی بھونڈی ترکیب شاید اسی کی تراشی ہوئی ہی، اور یہی حال اس کا دوسرے عربی الفاظ کے متعلق ہی، یقیناً اس تنگ دلی کا یہ ایک زندہ جواب ہی، کسی زبان کا سرمایہ اتنا وسیع ہو کہ وہ سارے معانی اور مطالب، جو عربی تفسیروں کی ضخیم مجلدات میں بیان کیے گئے ہیں، غیر منقوط الفاظ میں ادا کر دیے جائیں، کیا یہ کوئی معمولی بات ہی، دوسری زبانوں میں اس قسم کے التزامات شاید چند سطروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے، گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہی، تاہم بہرحال وہ ایک غیر معمولی ذہن و دماغ کا آدمی تھا، بیچ بیچ میں بعض نکتے اس کے قلم سے بے ساختہ نکل پڑے ہیں اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اچھی خاصی چیز ایسی جمع ہو سکتی ہی جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دی جا سکتی ہی۔

اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ ذکر بات بھی ہی، مآثر الامرا میں اکبری عہد کے ایک عجیب واقعہ کا ذکر ہی، لکھا ہی کہ جس زمانہ میں اکبر کے دربار میں دنیا کے تمام مذاہب کے علماء اور پیشواؤں کو مدعو کر کے ان کے مذہب کی حقیقت کی تحقیق ہو رہی تھی، ان ہی دنوں میں پارسیوں کے ایک پیشوا جس کا نام آذر کیوان مجوسی تھا، اکبر نے پٹنہ[1] سے اُسے طلب کیا

[1] یہ میں نے اس لیے لکھا ہی کہ مولانا شبلی نے اپنے مقالات میں ایک جگہ لکھا ہی۔ آذر کیوان ہندوستان آیا، عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی اور ۱۰۲۷ھ میں ۸۵ سال کی عمر پاکر مرگیا ۱۲ مجموعہ مقالات

کیوان خود تو نہیں آیا، لیکن ایک کتاب لکھ کر اکبر کے پاس بھیجی جس کی خصوصیت مآثر الامراء میں یہ بیان کی گئی ہے۔

"کیوان مجوسی کتابے بر چہار جزبرد اکبر فرستاد، ہر سطرش پارسی بحت (یعنی شدھ فارسی تھی)، وتصحیف آن عربی، و چوں قلب می کردند ترکی و مصحف آن ہندی"

مطلب یہ ہے کہ اصل کتاب کو سیدھے سادے طور پر اگر پڑھیے تو خالص فارسی جس میں عربی الفاظ کا میل نہ ہو، آپ کو نظر آئیگی، لیکن اسی عبارت کے الفاظ کی تصحیف کر دیجیے یعنی نقطوں کو حذف کر کے ان ہی الفاظ کو ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو بجائے فارسی کے آپ کو یہ کتاب عربی زبان کی کتاب معلوم ہوگی، پھر ان الفاظ کو اُلٹ دیجیے یعنی حروف کو اُلٹ کر الفاظ بنائے جسے صنعت قلب کہتے ہیں، تو اب یہ ترکی زبان کی کتاب ہو جاتی ہے، ان مقلوبہ الفاظ کی اس کے بعد تصحیف کیجیے (یعنی وہی نقطوں کو ادل بدل کر کے ہم شکل الفاظ کی صورت میں پڑھیے تو اب بھی کتاب آپ کو ہندی زبان کی کتاب نظر آئیگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیوان نے اپنی کتاب کی ان ہی خصوصیات کو اپنے مذہب کی صداقت کی دلیل قرار دیا تھا، کیونکہ مآثر الامراء میں اسی کے بعد یہ فقرہ بھی درج ہے۔

"شیخ ابوالفضل می گفت، ایں نامہ افصح از قرآن ست" مآثر ج ۲ ص ۳۸۶

اس ابوالجہل کے نزدیک اگر اسی لفظی کرتب کا نام فصاحت ہے، تو آپ کی فضیلت کو کیا کہا جاسکتا ہے یہ بشیانہ بازیگری جس کا کسی زمانہ میں پرانے مکتبوں میں رواج تھا[1]، اس شخص

[1] بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک عالم میاں الہداد نامی رہتے تھے، فقہ، اصول فقہ میں بڑی دستگاہ تھی، ملا عبدالقادر ان سے لکھنؤ میں خود بھی ملے ہیں۔ انہوں نے ملا صاحب کو اپنی مصنفہ چند کتابیں دکھائیں جس میں ایک کتاب کی خصوصیت یہ تھی۔

رسالہ کہ از طول چہاردہ سطر یا از عرض ہماں قدر سطور بجدول نوشتہ بودند واحکام و مسائل چہاردہ علوم ازیں استخراج می یافت" ص ۸۶ (باقی برصفحہ ۲۹۰)

کو ملاحظہ فرمائیے آپ اسے فصاحت قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کی فصاحت پر اسے ترجیح دیتے ہیں :-

میرے پاس اس کا کوئی بین تصریحی ثبوت تو نہیں ہے لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آذر کیوان کی اس کتاب کی لفظی "صناعیوں" نے اگر واقع میں ایسی کوئی کتاب اُس نے لکھ کر بھیجی بھی تھی، اس زمانہ میں کچھ خاص اہمیت حاصل کی شاید فیضی کی اگر دینی نہیں تو نسلی اور علمی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی، اور اسی کتاب کے مقابلہ میں ایک دوسری لفظی صنعت کا التزام کرکے اس نے یہ تفسیر لکھی، اب خواہ یہ واقعہ ہو یا نہ ہو، اور فیضی کے سامنے آذر کیوان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹) یعنی لکیریں کھینچ کر اُنھوں نے طول اور عرض دونوں میں چودہ چودہ سطریں ایسے الفاظ میں لکھی تھیں کہ ان سطروں کے ایک ایک خانہ سے طولاً وعرضاً چودہ علوم کے مسائل پیدا ہوتے تھے، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ دو چیزوں میں ایک غریب اور نادر چیز تو ان کے پاس یہ دیکھی، اور کوئی شبہ نہیں کہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ایسی عبارت بنانا کہ ایک طرف سے مثلاً طول کی طرف سے پڑھیے تو ایک فن کا مسئلہ ہو، اور عرض کی طرف سے پڑھیے تو دوسرے فن کا، یوں ہی ایک ایک خانہ کو چھوڑ کر پڑھتے چلے جائیے الگ الگ فن کے مسائل کی وہ عبارت بنتی چلی جائیگی، یہ عبارتی عجائب نگاری کا ایک دلچسپ کمال ہے، اور میرے خیال میں آذر کیوان کے کام سے کم حیرت انگیز نہیں ہے، دوسری چیز "قیطون" نامی ان کی ایک اور کتاب تھی لکھا ہے کہ "مثل مقامات حریری داشت" مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا کمال یا خاص بات تھی البتہ ایک اور کتاب کا جو ذکر کیا ہے کہ وہ نحو میں تھی جس عبارت میں مسئلہ بیان کیا گیا تھا وہی عبارت مثال کا کام بھی دیتی تھی، لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ اس میں میاں الہداد کو تفرد و تقدم حاصل نہیں ہے، اسی ہندوستان میں نحو کا ایک "متن" اسی صنعت میں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی لکھ چکے تھے، جس کا نام ارشاد ہے وہ چھپ بھی چکا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ارشاد ہو، کیونکہ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے متعلق ملا صاحب نے لکھا ہے کہ میاں الہ داد کے بنی اعمام کہتے تھے کہ "رسالہ چہار دہ علمی و قیطون تصنیف حکیم زبرتی ست کہ در جونپور آمدہ با قاضی شہاب الدین مشہور معارضہ نمودہ" کیا تعجب ہے کہ یہی حال نحو کے اس متن کا بھی ہو، ملا عبدالقادر کو اس کی خبر نہ ہو۔ علامہ شرف الدین اسمٰعیل پشاوری کے رسالہ بعنوان النشرف میں آئی

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] چند سال ہوئے کہ مسٹر ظریف نامی ایک صاحب نے، اسلام اور مذہب کے خلاف میں ایک سخت کتاب لکھی تھی، جس کے متعلق ہنگامہ بھی سخت ہوا تھا، مولانا عبدالباری ندوی فرماتے تھے کہ مسٹر ظریف کشمیر میں تھے میں بھی وہیں تھا، کانپور کی مسجد مچھلی بازار والی کا قضیہ اسی زمانہ میں پیش آیا تھا میں نے

کی کتاب کا مقابلہ ہو یا نہ ہو لیکن میں تو اس کو بھی قرآن کی طرف سے ایک غیبی جواب سمجھونگا کہ اصل قرآن کا مقابلہ تو خیر کوئی کیا کرسکتا ہے جس طرح خدا کے بنائے ہوئے کسی پتہ کا بھی جواب ہو بہو جیسا کہ وہ ہے آسمان و زمین کی کوئی طاقت پیش نہیں کرسکتی، یہی چیز قدرتی اور مصنوعی امور میں فرق پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن کے قدرتی ہونے کی دلیل میں متعدد جگہ اسی چیز کو پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اس جیسا کلام نہیں بنا سکتا۔ مگر فیضی کے کام نے یہ ثابت کردیا کہ آذر کیوان کی کتاب کا مقابلہ قرآن کی ایک تفسیر سے کیا جاسکتا ہے، جو معمولی آدمی کی لکھی ہوئی ہے، آخر آذر کیوان کی کتاب کی اس سے زیادہ تو کوئی خصوصیت نہیں کہ انشا، یا کتابت کی چند صفتوں کے التزام کے ساتھ چار جز کا ایک رسالہ اُس نے لکھ دیا، لیجیے اسی قسم کی انشائی صنعت میں چار جز نہیں پچھتر جز کی تفسیر تیار ہے۔

فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے، جیسا کہ میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے کہ اس تفسیر کے چند اجزا، بطور نمونے کے فیضی نے اسلامی ممالک میں بھی روانہ کئے تھے، اگرچہ ملا عبدالقادر نے رفیعی شاعر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اکبر اور دوسرے امرا، سے انعام واکرام لے کر رفیعی جب اپنے وطن کاشان واپس جارہا تھا، اور فیضی نے اس کے ساتھ

چند جزء از تفسیر بے نقط بہ توقیعات (تقریظات) افاضل و دیوان بولایت برائے شہرت فرستادہ بود"
ایران وخراسان ۱۲

لیکن خدا جانے کیا نحوست پیش آئی ملا صاحب لکھتے ہیں کہ جہاز پر سوار ہو کر رفیعی جب ایران جارہا تھا تو:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) مسٹر ظریف کو دیکھا کہ جو لوگ اس مسجد کے سلسلہ میں شہید ہوئے تھے، ان سے ہمدردی کرتے ہوئے، حکومت کے خلاف سخت لعن طعن کر رہے ہیں میں نے کہا کہ آپ کو جب اسلام ہی سے انکار ہے تو مسلمانوں سے ہمدردی کے کیا معنی؟ بولے کہ واہ تو کیا میں قومی حیثیت سے بھی مسلمان نہیں ہوں، مذہبی حیثیت سے مجھے ہمدردی نہ ہو، لیکن قومی حیثیت سے تو میرا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے اور مسجد سے بھی۔

"چوں از ہرمز (جزیرہ) گذشت نزدیک بہ کچ و مکران رسید کشتی او بہ تباہی شد و ہرچہ داشت بہ تاراج رفت" ص، ۲۳۲

اور اسی ہرچہ داشت میں فیضی بیچارے کا سرمایۂ شہرت بھی تھا وہ بھی بر باد ہوگیا، مگر ملا صاحب ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیضی نے اپنی کتابوں کی نقل کے لیے ایک سررشتہ قائم کر رکھا تھا۔

"زر ہائے جاگیر صرف کتابت و تذہیب (مطلّا و مذہب کرنے میں) تصانیف خود ساختہ" (۲۸۵ ج ۳)

ایک ایک کتاب کے کتنے نسخے فیضی نے تیار کرائے تھے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد جب اس کا کتب خانہ شاہی خزانہ میں منتقل ہو رہا تھا، تو ملا صاحب نے لکھا ہے

"از و دان کتابوں میں، صد و یک کتاب نل دمن بود" ج ۳ ص ۳۰۶

یعنی صرف مثنوی نل دمن کے ایک سو ایک نسخے تو وہ تھے، جو تقسیم و اشاعت کے بعد کتب خانہ میں بچ گئے تھے، ایسی صورت میں کیا تعجب ہے کہ رفیعی کے ساتھ جو نمونہ تفسیر کا بھیجا گیا تھا وہ ڈوب گیا ہو، مگر اور ذرائع سے جو نسخے اسلامی ممالک میں بھیجے گئے تھے وہ وہاں پہنچ گئے ہوں، اگرچہ اس تفسیر کا ذکر باہر کے علماء کی کتابوں میں ہم نہیں پاتے مگر جس کی ایک ایک کتاب کے سَو سَو نسخے بانٹنے اور تقسیم کرنے کے بعد باقی بچ جاتے ہوں، جو اپنی جاگیر کی آمدنی کا بیش قرار حصہ صرف اپنی کتابوں کی کتابت و زیبائش پر خرچ کرتا ہو، اس کے متعلق یہ کیوں سمجھا جائے کہ اگر ایک نقل اس کی ڈوب گئی تو دوسری نقلیں اس کی کتابوں کی اسلامی ممالک میں نہ پہنچی ہونگی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ دن ہوئے قسطنطینہ سے ایک تفسیر "درر الاسرار" نامی چھپ کر آئی ہے، مصنف اس کے سید محمود آفندی ہیں، دمشق کے رہنے والے ہیں، اپنی اس تفسیر میں محمود آفندی نے بھی اسی صنعت اہمال کا التزام کیا ہے، یعنی پوری تفسیر غیر منقوط ہے، سلطان عبد المجید خاں خلیفۃ المسلمین مرحوم کے نام یہ کتاب معنون ہے، سنہ تالیف ۱۲۲۴ھ سنہ ہجری

یعنی سو سال سے کچھ ہی زیادہ زمانہ گذرا ہی۔

ظاہر ہی کہ فیضی کی تفسیر کے دو سو سال بعد یہ کتاب لکھی گئی ہی، چونکہ فیضی سے پہلے اس صنعت میں تفسیر لکھنے کا جہاں تک میں جانتا ہوں رواج نہ تھا، مفتی عنایت احمدؒ نے چالیس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا قصد اس صنعت کے ساتھ کہ

کیا ایسی صورت میں اگر یہ خیال کیا جائے کہ شام کے ایک عالم کے دل میں اس تفسیر کے لکھنے کا ارادہ ہندوستان کے ایک مُلّا کے کام کو دیکھ کر پیدا ہوا تو کوئی دور از قیاس بات ہو سکتی ہی، میں نے فیضی کی تفسیر کے بعض مقامات کا مقابلہ محمود آفندی کی تفسیر سے کیا ہی، شاید دوسروں کو مجھ سے اختلاف ہو، لیکن اس مقابلہ سے مجھ پر تو یہی ظاہر ہوا کہ عموماً اظہار مطالب میں الفاظ کے ان ہی ذخیروں سے محمود آفندی نے بھی کام لیا ہی، جن سے فیضی پہلے کام لے چکا تھا۔ فرق دونوں میں اگر کچھ نظر آیا تو صرف اجمال اور تفصیل کا، فیضی نے جس مطلب کو دس سطروں میں مثلاً ادا کیا ہی، محمود آفندی نے اسی خیال کو مثلاً دو تین سطروں میں سمیٹ لیا ہی، اور اسی چیز نے دونوں کتابوں میں فرق پیدا کر دیا ہی، ورنہ اگر محمود آفندی بھی اسی تفصیل سے کام لیتے تو دونوں کتابوں میں اس وقت شاید امتیاز مشکل ہو جاتا،

جن لوگوں کو بایزید یلدرم عثمانی ترکی بادشاہ اور تیمور کے تعلقات کا علم ہی اور جو عثمانی خانوادۂ شاہی اور تیموری خاندان کی موروثی چشمکوں اور رقابتوں سے واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تیموری دربار کے ایک مُلّا کے کام کا جواب "اخوندردم"[1] کے دربار کے عالم کی طرف سے اگر دیا جائے، تو یہ چنداں محل تعجب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال سید محمود آفندی کی بے نقط تفسیر درر الاسرار کے باوجود پھر بھی اس قسم کی تفسیر

[1] مغل سلاطین سلاطین ترک کو "اخوندردم" ہی کے لفظ سے یاد کرتے تھے اکبر نے اپنے امیر پر الزام بھی لگایا تھا کہ اندرونی طور پر اخوندردم سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہی۔ مجدد الف ثانی کے مقالہ میں خاکسار نے اس کا تذکرہ

کی اولیت کا سہرا ہندوستانی نظام تعلیم کے سر سے اُتارا نہیں جا سکتا، بلکہ اگر واقعہ یہی ہے کہ بایزید یلدرم کے وارثوں نے تیمور کے وارثوں کو اس طریقہ سے خاموش جواب دیا ہے تو یہ بات کہ فیضی کے کارنامے کے ساتھ بیرون ہند کے اسلامی ممالک نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، درست نہیں رہتا۔

خیر فیضی کی تفسیر سواطع تو گونہ ایک انسانی کمال کا اظہار ہے، گو ضمناً اس ذریعہ سے اس زبان کی عجیب و غریب حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ایک زندہ ثبوت مہیا ہو جاتا ہے جس میں خدا کا آخری پیغام کرہ زمین کی ساری نسلوں اور قوموں کے لیے نازل کیا گیا، اور رہتی دنیا تک اسی کو کافی و وافی قرار دیا گیا۔

اسی سلسلہ میں ہندوستانی نظام تعلیم کے ایک اور نتیجہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا، میں نہیں جانتا کہ دنیا کی کسی ملک اسلامی ہو یا غیر اسلامی اور ان ممالک کی کسی زبان میں کسی دینی یا دنیوی علم یا فن کے مسائل کو اس طریقہ کے التزام کے ساتھ ادا کیا گیا ہو، کہ فن کا ہر مسئلہ خود ہی اس مسئلہ کی مثال بھی ہو۔

لیکن عوام تو خیر کیا واقف ہو سکتے ہیں شرح مُلّا جامی کے پڑھنے والے طلبا کہیں کہیں اسی کتاب میں کافیہ کی شرح ہندی کا تذکرہ پاتے ہیں، اِسی شرح ہندی[۱] کے

---

[۱] حال میں ایک مضمون مولانا ابوالاسرار رمزی کے قلم سے مجلہ "ندائے حرم" میں شائع ہو رہا ہے، میں مولانا سے شخصاً واقف نہیں ہوں، لیکن ادھر چند دنوں سے اُنہوں نے اپنی شعریت کا استعمال جس پاک مقصد کے لیے شروع کیا ہے، اُس کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، ان شاء اللہ مستقبل ان سے مستفید ہوگا ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ کہنا یہ ہے کہ ندائے حرم کے اسی مضمون میں "گرامر آف لنگویج" نامی کتاب سے جو کسی نصرانی کی ہے آپ نے ایک بڑا اچھا فقرہ یہ نقل فرمایا ہے۔ "درحقیقت انسانی زبانوں میں یہ (عربی زبان) سب سے زیادہ قابل انتقال اور مالدار زبان ہے" اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ منجملہ اور دلائل کے عربی زبان کی مالداری کا ایک ثبوت ہندوستانی نظام تعلیم کا ایک "نمایاں ثمرہ" فیضی کی تفسیر بھی ہے، پچھتر جزوں کی کتاب میں سارے جہان کی تفسیری معلومات کا غیر منقوط الفاظ میں ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ۱۲

مصنف ملک العلماؒ[1]، شہاب الدین دولت آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب الارشاد نامی علم نحو میں لکھی تھی، عجب کتاب، مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں۔

"ارشاد متن در علم نحو کہ تمثیل مسئلہ در ضمن تعبیر التزام کردہ و طرزے تازہ بر روئے کار آوردہ"
آثر ص ۱۸۹

یہ کتاب چھپ چکی ہے، لیکن اب نایاب ہے، غالباً کسی زمانہ میں درسی نصاب میں شریک تھی، محدث دہلوی نے اپنے حالات میں لکھا ہے، اپنے تعلیمی نصاب کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے۔

"از مختصرات نحو مثل کافیہ ولب وارشاد" (اخبار۔ ص ۳۱۱)

اغلب یہی ہے کہ ارشاد سے مراد ملک العلماء کا یہی "متن عجیب" ہے۔

اس زمانہ کے علمی ماحول کی ایک ا ورنادر دلچسپ چیز جسے لوگوں نے شاید کم کیا، کچھ اہمیت نہ دی، وہ اس ملک کے ایک نہیں بلکہ متعدد اہل علم کا ایک عجب کارنامہ ہے۔

---

[1] ملک العلماء کا خطاب ان کو جونپور کی حکومت شرقیہ کی طرف سے ملا تھا، دلّی میں پیدا ہوئے تھے، مولانا آزاد نے لکھا "تولد او دولت آباد دہلی ست" معلوم ہوتا ہے دلّی میں دولت آباد نامی کوئی محلہ تھا، ملک العلماء مولانا خواجگی دہلوی کے شاگرد ہیں جو چراغ دہلوی کے اجلہ خلفاء میں تھے، کہتے ہیں کہ مولانا خواجگی نے قاضی شہاب الدین کے متعلق طالب العلمی کے زمانہ میں فرمایا تھا "بہ پیش من طالب العلمے آید کہ پوست او علم مغز او علم، استخوان او علم ست" یہ بھی اس زمانہ کی سند اور اس عہد کا ڈپلوما جو اساتذہ اپنے خاص خاص طلبہ کو دیا کرتے تھے، فیروز تغلق کے بعد دلّی کے تخت پر عموماً نالائق جانشینوں کا قبضہ ہوتا تا اینکہ ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہوگیا، تیمور نے موقع کو خالی پاکر حملہ کردیا کہتے ہیں کہ اس حملہ کی اطلاع حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز صاحب گلبرگہ قبل از قبل دے چکے تھے جو دلّی چھوڑ کر بہمنیوں کی حکومت میں جو دکن میں قائم تھی چلے آئے، کچھ لوگ جونپور کی حکومت کی طرف چلے گئے، قاضی شہاب الدین جونپور جانے والوں میں تھے، وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، قضاء کا عہدہ سپرد ہوا اور ملک العلماء کا خطاب ملا، عربی زبان میں مختلف کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی زندگی ہی میں جیسا کہ محدث دہلوی نے لکھا ہے "درحیات او مشہور عالم گشتہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کا اس زمانہ میں کیسا نظم تھا۔ جونپور میں کتاب لکھی جاتی ہے، اور ترکستان میں جامی اس پر تنقید کرتے ہیں ان کی ایک تفسیر بحر مواج فارسی میں ہے، نظر سے گذری ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ شرح ملا جامی دراصل دولت آبادی کی شرح کا ایک نسخہ ہے لیکن میں نے خود ہندی کی شرح نہیں دیکھی ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا ۱۲۔

شاید لوگوں تک یہ بات پہنچی ہوگی کہ ابن حاجب کی کافیہ سے ہندوستانی مولویوں نے اپنی عقیدت اس حد تک بڑھادی تھی کہ بجائے علم نحو کے اُنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ کافیہ نحو نہیں، بلکہ تصوف اور حقائق کی کتاب ہے[1]۔ صرف دعویٰ نہیں بلکہ عملاً کافیہ کے الفاظ کی شرح اسی طریقہ سے کی گئی ہو، مولانا آزاد نے صاحب سبع سنابل میر عبدالواحد بلگرامی کے تذکرہ میں لکھا ہو۔

"از نوادر تصانیف او شرح کافیہ ابن حاجب است بطور حقائق (یعنی تصوف) تامبحث غیر منصرف"

یعنی غیر منصرف کی بحث تک کافیہ کے جتنے مسائل ہیں سب کو بجائے نحو کے معارف و حقائق کی تعبیر قرار دے کر میر صاحب نے اسی التزام کے ساتھ اس کی شرح لکھ بھی ڈالی، اور کچھ میر صاحب ہی اس کام میں منفرد نہیں ہیں، مولانا آزاد ہی لکھتے ہیں۔

"مخفی نماند کہ دو شرح بعبارت عربی و فارسی تامبحث غیر منصرف بطور حقائق در نظر فقیر آمدہ"

پھر ان دونوں شرحوں، عربی و فارسی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نام شارح اول میر ابوالبقا است ظاہر معاصر میر باشد و نام شارح فارسی ملا موہن بہاری ست کہ از میر متاخر ست" آثر۔ ص ۳۲

میر ابوالبقا کا حال تو معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں، لیکن اتنا یقینی ہو کہ ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں، اور ملا موہن بہاری[2] کا ذکر تو پہلے بھی آچکا ہو کہ حضرت اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بھی اُستاد تھے۔

---

[1] کتابوں کے ساتھ عقیدتمندی کبھی حد سے گذر جاتی ہو، اس کی ایک مثال یہ ہو کہ مفتاح السعادۃ میں لکھا ہو، کان شمس الدین شیخ الربوۃ المعروف بابن ابی طالب یقول زعم بعضہم ان المقامات وکتاب کلیلہ ودمنہ رموز فی الکیمیا" یعنی مقامات حریری اور کلیلہ و دمنہ دراصل کیمیا کی کتابیں ہیں۔ گلستاں کے متعلق بھی بعضوں کا یہی خیال ہو۔

[2] کچھ عجیب بات ہو کہ بہار باوجودیکہ دارالسلطنت سے کافی فاصلہ رکھتا تھا لیکن عموماً بادشاہی خاندان کے

اپنی طالب العلمی کے دنوں میں کا یہ کی ان صوفیانہ شرحوں کا ذکر جب میں نے سُنا تھا، تو قدرتی طور پر جیسا کہ چاہیے یہ کچھ عجیب بے معنی سی بات معلوم ہوئی، اس وقت بجز ایک لا حاصل کام کے اس کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اور میں خیال کرتا ہوں کہ جو بھی یہ سنیگا، حیرت کے ساتھ اس کا بھی یہی خیال ہوگا کہ بیٹھے بٹھلائے ان لوگوں کو یہ کیا سوجھی؟ مگر دنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی، اس کا تجربہ مجھے شرح کے اسی طریقہ کے متعلق اُس وقت ہوا جب مدت ہوئی دار العلوم دیوبند کے قیام کے زمانہ میں دہلی آنا ہوا یہاں اُس زمانہ میں قرآن کی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا، اس ادارہ کے بعض طلبہ سے ملاقات ہوئی، گفتگو کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اس ادارہ میں قرآنِ مجید کو سیاسی نقطۂ نظر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۶) اساتذہ میں ہم بہار کے علماء کو پاتے ہیں، عالمگیر کے بعد شاہ عالم بادشاہ عالی گوہر کے اُستاذ مولوی سراج الدین صاحب کے متعلق تذکرہ صبح گلشن میں لکھا ہے۔

"متوطن فرید پور کہ بہ فاصلہ شانزدہ کروہ از عظیم آباد ست وایں مولوی سراج الدین احمد شاہ عالم عالی گوہر بادشاہ دہلی را اُستاد بود"

زیب النساء کے اُستاد ملا سعید کے متعلق بھی مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مونگیر میں مدفون ہیں، مآثر الامراء میں ہے کہ سید محمد جونپوری مدعی مہدویت کے خلفاء کا مقدمہ جب حکومت دہلی کے سامنے پیش ہوا تو فیصلہ کے لیے ملا بدہ حقانی بہاری کے پاس مقدمہ بھیجا گیا، واللہ اعلم کیا بات تھی خود سید محمد جونپوری کو لوگ جونپور کا بتاتے ہیں، لیکن ان کے واقعات وحالات میں داناپور کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے جو پٹنہ کا گویا ایک محلہ ہے، ان کے تذکروں میں لکھا ہے کہ دعوئے مہدویت سے پہلے اسد العلماء کا خطاب ان کو داناپور کے علماء نے دیا تھا، خود سید صاحب کے صاحبزادے سید محمود جن کی قبر گجرات میں ہے سارا گجرات "بہاری پیر" کے نام سے یاد کرتا ہے، یہی چیز شک میں ڈالتی ہے کہ مہدویوں کا مقدمہ مُلا بدہ حقانی کے پاس بہار کیا اسی تعلق سے بھیجا گیا کہ سید محمد صاحب کا حقیقی وطن بہار ہی تھا، شرقیوں کی حکومت جب جونپور میں قائم تھی تو مقبوضہ رقبہ کے تمام باشندوں کو لوگ جونپور ہی کی طرف منسوب کر دیتے تھے، صاحب شمس بازغہ ملا محمود جونپوری کے نام سے مشہور ہیں، حالانکہ ان کا اصلی وطن دلید پور ضلع اعظم گڈھ تھا، ہو سکتا ہے کہ سید محمد کو اسی بنیاد پر بجائے بہار کے جونپور کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔ ملا الہداد ہدایہ اور بزدوی کے مشہور شارح ومحشی بھی عموماً الجونفوری کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن ملا جیون نے اپنی تفسیرات احمدیہ کے دیباچہ میں غالباً ان ہی کو الشیخ الہداد البہاری کی نسبت سے ذکر کیا ہے (ص ۲ دیباچہ تفسیرات احمدیہ) ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ سید محمد جونپوری کے والد کا نام بھی بدہ بتایا جاتا ہے، اور

سے پڑھایا جاتا ہے، صاحب تفسیر یورپ کے موجودہ پارلیمانی نظام، ووٹنگ، حزب الاختلاف، ریزولیشن وغیرہ وغیرہ ساری باتیں قرآن سے ثابت کرتے ہیں، جوں ہی کہ یہ بات میں نے سُنی معاً میرا خیال کافیہ کی اُس صوفیانہ شرح کی طرف منتقل ہو گیا میں نے خود تو ان شرح کو دیکھا نہیں تھا، لیکن جن صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی، ان سے میں نے عرض کیا کہ اگر الفاظ سے معانی پیدا کرنے میں اتنی آزادی برتی جائیگی تو بقول اکبر مرحوم

"مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے"

ہر مدعا جو بھی پیش کیا جائے اپنی تفسیر سازی کے زور سے اس مدعا کو قرآن سے نکال کر دکھایا جانے لگے، تو لیجیے میں آپ کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ کافیہ نحو کی نہیں بلکہ "النبوات" کی کتاب ہے، میں نے معاً اسی کے ساتھ مطلب برآری کا کام شروع کر دیا بات تو لمبی تھی، لیکن کافیہ کے ابتدائی فقروں کا جو مطلب میں نے عرض کیا تھا، وہ غالباً یہ تھا "الکلمہ" سے مُراد النبی ہے، عقلاً تو اس لیے کہ کلمہ بھی ایک پوشیدہ مافی الضمیر حقیقت کو ظاہر کرتا ہے، یوں ہی حق تعالیٰ کی غیبی حقیقت کی ترجمانی نبی کرتے ہیں، اور نقلاً اس کی تائید قرآن ہی سے ہوتی ہے کہ مسیح علیہ السلام جو اللہ کے نبی تھے، ان کو کلمۃ منہ کہا گیا ہے، قرآن میں لاغلبن انا ورسلی بھی ہے اور ان کلمۃ اللہ ھی العلیاء بھی، معلوم ہوا کہ کلمۃ اللہ سے یہاں رسل ہی مُراد ہیں، جن کو غلبہ عطا کیا جاتا ہے، آگے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ عالم علوی سے طرف عالمِ سفلی کے نبی ملفوظ ہوتے ہیں یعنی پھینکے جاتے ہیں، ان کی حقیقی غرض چونکہ "مالکم من الٰہٍ غیرہ" اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کی دعوت ہی ہوتی ہے، اس لیے۔ وضع لمعنیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۶) اسی زمانہ میں بہار میں مُلّا بدہ نامی ایک مشہور عالم گذرے ہیں یعنی شیخ محدث نے لکھا ہے کہ وہ فصوص الحکم اور وحدت الوجود، صوفیانہ خیالات کے سخت مخالف تھے، اور یہ وہی مُلّا بدہ ہیں جن کی جوتیاں شیر شاہ سوری اپنے ہاتھ سے مُلّا صاحب کے سامنے سیدھی کیا کرتا تھا۔
(دیکھیے اخبار الاخیار، ذکر شیخ حسن طاہر۔ ص ۱۹۵)

مفرد (بنایا گیا ایک مفرد معنی کے لیے) یعنی کلمۂ توحید اور معبود کی انفرادیت کا اعلان یہی نبی کا منصب حقیقی ہے جس کے لیے وہ بنائے جاتے ہیں، یوں ہی میں نے کہا کہ ایک قسم انبیاء کی تو وہ ہوتی ہے جن کی نبوت زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہوتی ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ ہے، سمو اور بلندی کی وجہ سے ان کو اسم کہہ سکتے ہیں، بعضوں کی نبوت کا تعلق کسی خاص قرن اور زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جیسے انبیاء سابقین اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نبوت کسی دوسرے نبی کی نبوت سے ملے بغیر مکمل نہیں ہوتی، جیسے حضرت ہارون کی نبوت کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے ہے پس یوں فعل، حرف اور اسم تینوں قسمیں النبی یعنی الکلمہ کی پیدا ہو جاتی ہیں، الیٰ غیر ذلک من الخرافات۔ وہ صاحب میرا منہ تاکنے لگے، میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی بڑی ذہانت کی بات نہیں ہے اور نہ یہ تفسیر ہے بلکہ تحریف ہے تغییر ہے[1]

واقعہ یہ ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کافیہ کی صوفیانہ شرح کی گوش زدہ بات ہی اُس دن مجھے کام آگئی، اس وقت سے علماء ہند کے اس عجیب و غریب طرز عمل کی بے حاصلی کا جو خیال تھا وہ بدل گیا۔

دل سوچنے لگا کہ ہندوستان کے علماء کو کسی کتاب کی ایسی شرح جس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہ ہو آخر سوجھی تو کیوں سوجھی! بیرون ہند کے علمی حلقوں میں اس نوعیت

---

[1] خیال آتا ہے کہ میں نے ان ہی صاحب سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کسی کلام میں مطلب کو یوں ہی باہر سے داخل کیا جا سکتا ہے، تو پھر داغ مرحوم کا سب سے افحش ترین شعر

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک　　مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

کے متعلق دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تیمم کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے یعنی حور حورا کی جمع ہے حور اور حواری سے مناسبت رکھتا ہے، حواری ماہی گیر تھے، ماہی گیروں کو پانی سے لزومی تعلق ہوتا ہے پس لازم بول کر ملزوم مراد لیا گیا، یعنی پانی کا حشر تک سے یہ مراد ہے کہ آفتاب اتنا جھک جائے کہ نیزہ سوا نیزہ کے قریب آجائے عصر کا وقت جب اتنا تنگ ہو جائے تو پانی کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ شباب یعنی وقت کے بھڑکاؤ کا وقت جب ہو، جوانی کی طرح فانی نظر آ رہا ہو، تو مٹی پر ہاتھ مار کر تیمم کر لینا چاہیے ۱۲

کی شرح کا بھی کوئی سُراغ نہیں ملتا کہ سمجھا جاتا، تقلید میں ایسا کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ تو سراسر ان کا اجتہاد اور ابتداعی طریقہ ہے جس کا کوئی نمونہ کم از کم میرے علم کی حد تک اس سے پہلے اسلامی ادبیات میں نہیں ملتا، اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال آتا تھا کہ میر ابوالبقار کے سوانح کی حقیقت کا صحیح علم اب تک حاصل نہ ہو سکا۔ باقی دُو صاحب یعنی میر عبدالواحد بلگرامی کا شمار تو اپنے عہد کے ممتاز دسر برآوردہ بزرگوں میں ہے، ایک مدت تک ان کی کتاب سبع سنابل علم و معرفت کے اونچے حلقوں میں خاص قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مولانا آزاد نے براہِ راست شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ایک قصہ[1] نقل کرنے کے بعد یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

سنابل تصنیف او در جناب حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم مقبول اُفتادہ منہ ۳۱

اکبر جیسا بدعقیدہ آدمی بھی میر صاحب سے متاثر ہوتا تھا، پانسو بیگہ زمین بطور جاگیر بلگرام میں میر صاحب کو اکبر ہی نے عطا کی تھی اور مُلّا موہن بہاری کی عظمت و جلالت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت نے ہندی اسلام کو وہ فرزند سعید عطا کیا جس کا نام محیی الملۃ والدین اورنگ زیب عالمگیرؒ ہے، آج اس ملک میں مسلمانوں کا وجود مختلف وجوہ سے اسی کی حمیت دینی، اور حق پژوہی کی رہینِ منت ہے[2]۔

پھر کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان فاضلوں کا واقعی یہ خیال تھا کہ ابنِ حاجب

---

[1] خلاصہ اس قصہ کا یہ ہے کہ شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ منورہ میں خواب کے اندر ذات ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، اس مجلس میں ایک شخص کو دیکھا کہ "حضرت باو لب تبسم شیریں کردہ حرفہا می زنند و التفات تمام دارند" دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ میر عبدالواحد بلگرامی ہیں، کتاب سبع سنابل ان کی مقبول ہوئی ہے، میر صاحب کی عمر سو سال سے متجاوز تھی کہتے ہیں کہ یکے از کفار جیبان بر دست حضرت میر بدولت اسلام مشرف اندوز شد" ماثر۔ ص ۳۱۔

[2] یہ واقعہ ہے کہ اکبر اور داراشکوہ کے ذریعہ سے اسلام کا حشر قریب تھا کہ اس برہمن کدہ میں وہی ہو جائے جو بدھ مت کے ساتھ حادثہ پیش آیا لیکن حضرت مجدد کی روحانی اور اورنگ زیب کی ریاسی قوت نے اس قیامت کو برپا ہونے سے روک دیا، اور انشاء اللہ خدا کی غیبی تائیدوں کا یہ سلسلہ بند نہ ہوگا ۱۲

نے کافیہ میں بجائے نحوی مسائل کے صوفیانہ حقائق و معارف بیان کیے ہیں، اگر یہ بات نہ تھی، بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے کافیہ کے الفاظ میں صوفیانہ خیالات کے بھرنے کی کوشش کی تھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اس کا حاصل کیا ہو سکتا ہے، ان بزرگوں کو حقائق و معارف ہی کے مسائل بیان کرنے تھے تو ایسے کافیہ کی شرح بنائے بغیر یوں بھی لکھ سکتے تھے، یا کم از کم تصوف کی بیسیوں کتابیں سیکڑوں متون مل سکتے تھے، ان ہی کو بہانہ بنا کر دل کا ارمان نکالتے، یہ بے جوڑ انمیل رشتہ کافیہ اور تصوف میں قائم کرنے کی کیا حاجت تھی؟

واللہ اعلم کوئی تصریحی شہادت تو اس باب میں مجھے نہیں ملی ہے لیکن دلی کا جو قصہ میں نے سنایا، اسی قصہ کی بنیاد پر میرا ذہن ادھر جاتا ہے کہ شاید ان بزرگوں پر بھی کوئی اس قسم کی افتاد پڑی تھی جس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ و رسول کے الفاظ کو آڑ بنا کر جو لوگ اپنے خود تراشیدہ دماغی پیداواروں کو دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں، اور اسی کو اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے ہیں کہ جس لفظ سے جو معنی اور جس مطلب کو چاہوں لوگوں کو نچوڑ کر بتا سکتا ہوں، گویا ایک قسم کا جادو کرتے ہیں، کانٹے کے تھن سے عرق انار اور انار کے پھل سے گائے کا دودھ نچوڑتے ہیں۔

دل سوچتا تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک کے متعلق تو نہیں کہتا، لیکن ہندوستان کا علمی دماغ موجودہ زمانہ سے پہلے تو کبھی اس آفت میں مبتلا نہیں ہوا تھا جس کا گذشتہ دو ایک پچاس سال یا یوں کہیے کہ مغربی زندگی کے آسیب میں مبتلا ہونے اور یورپ کی علمی للکار سے مرعوب ہونے کے بعد شکار ہوا ہے، قرآن سے ثابت کیا گیا کہ زندہ مستقل ہستیوں کا نہیں بلکہ عناصر کی عام قوتوں کا نام ملائکہ ہے، معجزہ کا ظہور ناممکن ہے، مسلمانوں کے نزدیک جنت اور دوزخ کا جو مطلب بارہ تیرہ سو سال سے سمجھا جاتا ہے، قرآن کی رو سے وہ قطعاً غلط ہے اور ان تمام قرآنی الفاظ سے وہی مراد ہے، جو یورپ ان مسائل میں اپنا خیال رکھتا ہے،

خدا کا پیغام لے کر جبرئیل نامی فرشتہ کسی انسان پر نازل نہیں ہو سکتا، عقل کا بھی یہی تقاضا ہی، اور قرآن بھی اسی کا مدعی ہی

انیسویں صدی کی یہی چیز اس زمانہ میں اور آگے بڑھی، تا اینکہ سرزمین ہند کے پیدا ہونے والوں میں سے بعض صاحبوں نے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ تمہارے قرآن میں ہمارا ذکر موجود تھا اور تم لوگ اب تک اس کو عرب کے رسول محمد نامی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر منطبق کرتے رہے، خاتم النبیین کے دعویٰ کو جس قرآن نے سب سے پہلے دنیا کے آگے پیش کیا تھا، عرب و عجم کے مسلمان اس کے جو معنی سمجھتے تھے اسی معنی کو "خاتم النبیین" کے الفاظ سے پوچھ کر صاف کیا گیا، اور اپنی طرف سے خود ایک مستقل معنی چھیل چھال کر بنائے گئے، اور اسی خود ساختہ معنی پر "خاتم النبیین" کا قالب کس دیا گیا۔

بدتمیزی کا یہی طوفان بالآخر بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ کر رہا کہ دنیا کی وہ ساری قومیں جو قرآن کو اللہ کا کلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتی ہیں، ثابت کیا گیا اور قرآنی آیات ہی سے ثابت کیا گیا، کہ یہ سب کے سب کافر ہیں، جہنمی ہیں، لیکن قرآن خداوند تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہی اور محمد اللہ کے سچے رسول ہیں، جنہیں ان دونوں باتوں سے انکار اور قطعاً انکار ہی ثابت کیا گیا، قرآن کے نصوص اور آیات ہی سے ثابت کیا گیا کہ یہی لوگ مومن اور مسلم ہیں، خدا کی رضامندی ان ہی کے لیے ہی، جنت کے وارث یہی لوگ ہیں۔

مگر ظاہر ہی کہ ہندوستان میں یہ تماشے جن شکلوں میں بھی پیش ہو رہے ہوں، یہ اسی زمانہ کی بات ہی جب تعلیم کے نظام کو دینی اور دنیوی دو حصوں میں بانٹ دیا گیا، اور دماغ کی بیداری کے ساتھ دل کی جانب سے صرف غفلت ہی نہیں برتی گئی، بلکہ اس کو غافل بنانے اور سلا دینے کی جو ممکنہ ترکیبیں تھیں وہ اختیار کی گئیں۔

لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں نے تو اس ملک کو وطن بنانے کے بعد تعلیم کا

جو خاکہ تیار کیا تھا، اس میں نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ علم کی طغیانی کے نشہ پر

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ۔ تیرے رب کی طرف رجعت (اس کا علاج ہے)

کی ترشی کا نچوڑنا بھی تعلیم کا ترتیب ترتیب ایک لازمی جز قرار دیا گیا تھا، تاکہ دماغ کی لگام ہمیشہ دل کے ہاتھوں میں یا عقل کی باگ ایمان کے پنجوں میں دبی رہے، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جن دنوں میں اپنی دماغی بیداری کی تیاری میں مدرسوں میں کر رہا تھا، تو بار بار ان کے والد شیخ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ متنبہ کرتے تھے کہ

"ہاں! تا مُلّائے خشک و ناہموار نہ باشی" صہ ٣١٢ اخبار

ملائیت (تعلیم یافتگی) کی یہ خشکی جس کا لازمی نتیجہ ناہمواری ہے، ہندوستان کے مسلمان علم کے ان طغیانی آثار سے واقف تھے، چونکہ اس ملک میں اسلام جب آیا تو دین کا سارا ذخیرہ بحمد اللہ منقح ہو چکا تھا، حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی، فقہ کے اصول منضبط ہو چکے تھے یہاں کے اہل علم کو یہ ساری چیزیں پکی پکائی حالت میں ملی تھیں، اس لئے مذہب کے متعلق صرف عمل کا کام رہ گیا تھا، یا زیادہ سے زیادہ حوادث یومیہ جو لامحدود ہیں، ان کے متعلق فقہی کلیات کی روشنی میں حکم پیدا کرنا، آپ دیکھیں گے، کہ ایک مدت تک اس وقت تک جب تک مذہب کو دماغی بازی گاہ کی گیند کی حیثیت سے استعمال کرنے کا لوگوں پر دورہ نہیں پڑا تھا خاموشی کے ساتھ مذہب جن زندہ کمالات اور ارتقائی زینوں کے طے کرنے کا ذریعہ ہے ان ہی مقاصد کے حصول تک مذہب کا استعمال محدود رہا اس وقت تک اس ملک کے مذہبی دائروں میں نہ فساد تھا نہ جھگڑے، ایک روح پرور سکون کا عالم تھا جو طاری تھا۔

تقریباً صدیوں اس ملک کے مسلمانوں میں شیعہ اور سنی یا حنفی و شافعی کے اختلافات بھی نہیں پائے جاتے تھے، سب کا ایک مسلک ایک مشرب تھا، اسی لئے سارا زور جس طرف ڈھلک گیا تھا وہ عمل اور اخلاص کا زور تھا، جو چرچے تھے تو اسی کے

مخفیں تھیں تو اسی کی کتابیں لکھی جاتی تھیں تو اسی پر، لوگوں کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ بہ نسبت دوسرے علوم و فنون کے ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کے سلسلہ میں تصوف کی کتابیں زیادہ اور بہت زیادہ کیوں نظر آتی ہیں، بے سوچے سمجھے جواب دینے والے خیال کر لیتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو اس جواب کی جرأت بھی کر گذرتے ہیں کہ ان کو آتا ہی کیا تھا، تصوف سے کے چند رٹے رٹائے مقررہ مسائل تھے، بس ان ہی کو یہ تختہ مشق بنائے ہوئے تھے۔

ہندوستانی علماء کو آتا کیا تھا؟ اس کا جواب تو بحمد اللہ گذر چکا اور جتنا لکھا گیا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو نہیں لکھا گیا ہے، اور اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ تصوف کی کتابوں کی کثرت کی وجہ یہی تھی کہ اس ملک کے پر اسی کی دھن سوار تھی۔

ہمیشہ رسد طلب کی تابع رہی ہے اسی پر سکون فضا میں جو اکبری عہد سے پہلے اس ملک کے دینی اور علمی دائروں پر چھائی ہوئی تھی، مسلمانوں کی ساری توانائیاں اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

افسوس کہ بات بہت طویل ہو جائیگی، ورنہ بتاتا کہ اخلاص و عمل پر ابھارنے والا جو تیز اور سریع النفوذ ادب نظم کے سوا نثر میں ہندوستانی مسلمانوں کے قلم نے تیار کیا ہے، علی الخصوص حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، بہاری، حضرت شاہ نور عالم پنڈوی بنگالی، سید محمد بن جعفر، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز وغیرہم حضرات سلف میں اور اکبری فتنہ کے بعد شیخ مجدد سرہندی، شاہ ولی اللہ الدہلوی، شاہ عبد العزیز، شاہ اسمٰعیل رحمہم اللہ اجمعین کی کتابیں تیر و نشتر کے جن خزانوں سے لبریز ہیں، مجھ پر شاید ہندوستان کی بیجا پاسداری کا الزام لگا دیا جائیگا، ورنہ کہہ سکتا تھا کہ ان بزرگوں نے اس خاص فن میں جو کچھ لکھا ہے دوسرے اسلامی ممالک میں ان کی نظریں

مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔[1]

مذہبی سکون کے اس زمانہ میں آپ چاہتے ہیں کہ ایامِ فتنہ کی وہ کتابیں ملیں جن سے صدی ڈیڑھ صدی کے اندر اندر ہندوستان کو کیا بتاؤں کہ کیا ہوگیا ہی، حیرت ہوتی ہی کہ محکومیت کے اس قلیل عرصہ میں خلافیات کا جو لٹریچر ہندوستان نے تیار کرلیا ہی، حاکمیت کے قرونِ متطاولہ میں اس طرز کا رسالہ نکالنا بھی مشکل ہی اکبر کے عہد میں سُنتے ہیں، جیسا کہ مورخین نے لکھا ہی، مُلّا عبدالنبی گنگوہی اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری میں کچھ مذہبی جھگڑے چلتے تھے، لیکن وہ اکبر کا زمانہ تھا، اکبر کے زمانہ میں جو

[1] پچھلے بزرگوں خصوصاً حضرت مجدد شاہ ولی اللہ، مولانا اسمٰعیل کے متعلق شاید عام لوگوں کو بھی واقفیت ہو اگرچہ مولانا اسمٰعیل کی عبقات نامی کتاب باوجود مطبوع ہونے کے لوگوں تک نہ پہنچ سکی، اس لیے اس کتاب کی منزلت کا اندازہ نہ ہوسکا، میرا تو دعویٰ ہی کہ فن تصوف کو پہلی دفعہ اس کتاب میں فن کی صورت بخشی گئی ہی، باقی سلف کے جن بزرگوں کا میں نے نام لیا ہی، کچھ نہیں تو اخبار الاخیار محدث دہلوی میں ان کے کلام کے چند نمونے جو درج ہیں وہی دیکھ لیے جائیں، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاریؒ کے متعلق ایک واقعہ یہاں قابلِ ذکر ہی، جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر فلسفہ مولانا عبدالباری ندوی جو اسلامی و مشرقی فلسفہ کے سوا اس وقت مغربی فلسفہ کے بھی مستند علماء میں ہیں، مدت تک مغربی فلسفہ کی کتابیں ایم اے تک جامعہ عثمانیہ میں آپ پڑھاتے رہے ہیں، جدید فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے اور مستقل کتابیں آپ نے جو لکھی ہیں اُن کی تعداد نصف درجن کے شاید قریب ہو، جو دارالترجمہ سرکارِ عالی و دارالمصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہو چکی ہیں، بہرحال مولٰنا عبدالباری صاحب کو ایک دن میں نے شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکاتیب پڑھنے کے لیے دیے، پڑھنے کے بعد کتاب جب مجھے اُنھوں نے واپس کی، تو دیکھا کہ بیسیوں جگہ سُرخ پنسل کے نشانات لگے ہوئے ہیں، میں نے عرض کیا یہ کیا ہیں، فرمایا کہ حیرت ہوتی ہی کہ اس شخص کے کلام میں سطر دو سطر نہیں صفحے کے صفحے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا موجودہ زمانے کے مغربی مفکرین کی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہی، کانٹ ہیگل، برکلے، ہیوم، از قبیل فلاسفۂ جدید کے نظریات جن پر موجودہ فلسفہ کو ناز ہی شاہ صاحب کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں، میں نے بطور یادگار کے اس نسخہ کو اپنے کتب خانہ کے تبرکات میں شریک کرلیا ہی، شاہ شرف الدین یحییٰ منیری حضرت سلطان المشائخ کے معاصرین میں ہیں آپ کی مستقل سوانح عمری سیرۃ الشرف کے نام سے مولوی ضمیر الدین احمد مرحوم بہاری سابق چیف سکرٹری بیگم صاحبہ بھوپال نے بڑی جانکاہی سے مرتب کرکے شائع کردی ہی، غالباً صوفیۂ ہند کے حالات میں عصری رنگ میں سیرۃ الشرف پہلی کتاب ہی جسے ایک انگریزی خواں طبقہ کے فاضل نے مرتب کیا، بعض مکاتیب کا حضرت کے انگریزی

کچھ بھی نہ ہوتا کم تھا، اس سے پہلے اور جب تک حکومتِ اسلامیہ کا شباب رہا، اس کے بعد ہم شقاقیات بعیدہ کی کوئی کتاب اس طرز کی پاتے ہیں، کچھ نوک جھونک اس زمانہ میں اگر ہو بھی جاتی تھی تو علمی مسائل میں مولانا آزاد نے ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم و مسلم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ان کا اور مولانا حافظ امان اللہ بنارسی کا اجتماع اتفاقاً لکھنؤ میں ہو گیا، یہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا عہد تھا، ملا محب اللہ لکھنؤ کے قاضی تھے اور حافظ صاحب صدر الصدور، دونوں ایک ہی اُستاد مولانا قطب الدین شمس آبادی کے شاگرد تھے اسی معاصرت نے دونوں میں مقابلہ کا بازار کچھ دن کے لیے گرم رکھا تھا، مولانا آزاد لکھتے ہیں

"باہم طریق مباحثہ علمی سلوک می داشتند" ص ۲۱۲

مگر یہ "مباحثہ علمی" تھا جو دونوں میں جاری تھا "مکافرہ جہلی" جس کے شکار عہد حاضر کے علما ہیں اس سے تو اس چھ سو سال میں غریب ہندوستان، جہاں تک میرا خیال ہے واقف بھی نہ تھا، عجب تماشا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دونوں کو دعویٰ ہے، اور ہر اُمتی دوسرے کی گردن پکڑ کر اسلام سے اس کو خارج کر رہا ہے۔

بہر حال ہم نے تو جہاں تک غور کیا ہے، مذہب اور مذہبی علوم کو ہمارے بزرگوں نے صرف عمل اور اخلاص کے لیے استعمال کیا تھا، دماغی ورزشوں کے لیے عقلی اور ادبی

---

[1] ملا محب اللہ بہاری سے تو خیر کون ناواقف ہے، بقول مولانا شبلی مرحوم جس نے ڈھائی سو برس تک اسلامی نصاب کی نصف کتابوں کو اپنی سلم و مسلم کے نیچے دبائے رکھا، باقی حافظ امان اللہ بنارسی سے اب لوگ غالباً کم واقف ہیں، اپنے وقت میں مشاہیر مدرسین میں ان کا شمار تھا، بیضاوی عضدی تلویح شرح مواقف شرح حکمت العین، شرح عقائد جلالی، تقریباً اکثر درسی کتابوں پر ان کے قیمتی حواشی ہیں، محکم الاصول فقہ میں ایک مستقل متن ان کا بھی ہے۔ مسلم میں کچھ ملا محب اللہ نے محکم پر چوٹیں بھی کی ہیں، حافظ صاحب نے میر باقر اور ملا محمود جونپوری کے درمیان مسئلہ دہر پر محاکمہ کر لکھا ہے۔ دوانی کے قدیمہ وجدیدہ پر بھی ان کے حواشی ہیں رشیدیہ مناظرہ کی کتاب پر تہذیبی لکھی ہے۔

علوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اگر سعدی وحافظ اپنے ادبی تحفے طوطیانِ ہند کی شکر شکنی کے لیے بھیج رہے تھے، تو کیا اسی زمانہ میں ہندستان خسرو اور حسن کی شکر ریزیوں سے ایران اور ترکستان کو شیریں کام نہیں بنا رہا تھا، امیر خسرو اور امیر حسن علائی (مریدان سلطان المشائخ) کا جب انتقال ہوا تو مولانا جامی کے قلم سے بے اختیار یہ اشعار نکلے۔

ان دو طوطی کہ بہ نوخیزی شاں   بود در ہند شکر ریزی شاں
بقیت سدرۂ افلاک شدند   خامشان قفس خاک شدند   البداؤنی ج۱ ص۲۰

اور ان ہی دونوں پر کیا موقوف ہے، بیدل اور غالب جیسے شعراء جن کا سکہ سارے فارسی سمجھنے والے علاقوں میں رواں ہوا، ہندوستان میں ان کی کیا کمی ہے، میر جرجانی اور علامہ تفتازانی اگر اپنے عقلی اور ذہنی کمالات سے ہمیں سرفراز فرما رہے تھے تو سیالکوٹی، جونپوری، خیرآبادی، دولت آبادی کیا اس احسان کا معاوضہ نہیں ادا کر رہے تھے۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا ہے، جب نصوص قرآنی اور احادیث نبوی کے ساتھ ہندوستان میں اس بازی گری کا رواج نہ تھا جس کا تماشا ہم آج کر رہے ہیں کہ ہر وہ نظریہ ہر وہ اصول حیات، جو یورپ سوچتا ہے، قرآنی آیات میں اس کی گنجائش نکل آتی ہے، جب تک سرمایہ داری کا زور رہا تو قرآن ہی سے ثابت کیا جا رہا تھا کہ وراثت کا قانون قانون نہیں بلکہ مالک جائداد کے اختیاری فعل کے لیے ایک نیک مشورہ ہے، اور جب اشتمالیت اور اشتراکیت کے ڈنکے پر یورپ نے چوٹ لگائی تو ہر طرف سے قرآنی آیتیں تلاوت کرتے ہوئے لوگ، باہر نکل آئے کہ اشتراکیت کے سوا تو قرآن نے کسی

۱؎ تعمیرات، نباتیات، فلاحت، پارچہ بافی، طباخی اور سب سے زیادہ فنون حرب میں ہندوستانی مسلمانوں کے کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس کی نظیر دوسرے ممالک میں مشکل سے ملتی ہے۔ ۱۲

بات کی تعلیم ہی نہیں دی ہے۔

میں اس جستجو میں حیران تھا کہ کافیہ کی یہ شرحیں اگر اسی طرز عمل کے جواب میں لکھی گئی ہیں، تو اس وقت جب کہ اس ملک میں یہ سوال ہی نہیں اُٹھا تھا، جواب کی کیا حاجت تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے باہر بعض دماغوں میں اس قسم کی کجروی کے جراثیم ضرور پیدا ہوئے تھے، اور خصوصاً فرقہ باطنیہ جنہیں قرامطہ بھی کہتے ہیں، ان کے عقیدہ کی تو بنیاد ہی یہی تھی کہ قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے، وہی سمجھنا اور اسی کے مطابق عمل کرنا بے ایمانی ہے بلکہ ہم جو کچھ قرآن سے سمجھنا چاہتے ہیں، اُس پر ایمان لانا بھی عین ایمان ہے[1]، لیکن ظاہر ہے کہ قرامطہ کو ہندوستان کے اس دور سے کوئی تعلق نہیں ہے جس

[1] اہل علم کے لیے یہاں ایک مسئلہ پر تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ اسلام کے متعلق ایک چیز کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے یعنی کسی قسم کے اشعار ہوں ان میں محبوب حقیقی ہی کا ذکر کیوں نہ ہو لیکن اس شر سے بھی وہ خیر نکالنے کے عادی ہو گئے تھے، اور یہ ایک عام رواج عربی اور فارسی دونوں قسم کی شاعری میں پایا جاتا ہے، اسی مشق نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ بعض دفعہ بازار کے صدا لگانے والوں کی صدا پر بھی ان کو حال آجاتا تھا مشہور ہے کہ بغداد کے بازار میں ککڑی بیچنے والا ککڑیاں بیچتے ہوئے یہ صدا لگا رہا تھا "عشر خیار بدانق" دس ککڑیاں ایک پیسہ میں، عربی میں خیار ککڑی کو بھی کہتے ہیں اور نیک لوگوں کو بھی، حضرت جنید یا شبلی بھی اُدھر سے گذر رہے تھے، کان میں یہی صدا آئی، چیخ ماری اور بیہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے پوچھا گیا کہ کیا ہو گیا تھا، بولے کہ بھائی خیال گذرا کہ جب ایک پیسہ میں دس نیک بکتے ہیں تو بروں کا کیا حال ہو گا، بس اسی کا خیال آ گیا طبیعت بے قابو ہو گئی، اب ظاہر ہے کہ ان کی غرض یہ قطعاً نہ تھی کہ بیچنے والے کا مقصد بجائے ککڑیوں کے نیک لوگ ہیں، بلکہ اُن کا ذہن نیک لوگوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا، گو ایسا کم ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بعض قرآنی آیات، یا احادیث سے ان بزرگوں کا ذہن کسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور زبان یا قلم سے بھی وہ نکل بھی گیا ہے لیکن حاشا، وکلا ان بزرگوں کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ یا اللہ کے رسول کی بھی یہی غرض ہے، اپنے اس ذہنی انتقال کا اُنہوں نے نام بھی رکھ دیا ہے یعنی اسکو اعتبار اور "الاشارہ" کہتے ہیں، لوگوں کو ان کی اس اصطلاح یا طرز عمل سے ناواقفیت کی وجہ سے کبھی کبھی ان پر بھی فرقہ باطنیہ کی جیسی باتوں کا شک گذرتا ہے لیکن جب وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ اسے مراد حق نہیں کہتے تو پھر باطنیوں کے طریقۂ کار اور ان کے طریقۂ عمل میں آسمان و زمین کا فرق پیدا ہو جاتا ہے (باقی بر ص ۳۰۹)

کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، ان کا ایک مخذول و مذموم طائفہ کہیں سے بھٹک بھٹکا کر ملتان یا سندھ کے بعض علاقوں میں اگر آ بھی گیا تھا، تو غزنوی کی تلوار ان کا صفایا اس زمانہ سے بہت پہلے کر چکی تھی جب سلطان غوری رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت ہندوستان کو اسلام کا وطن بنایا گیا تھا، بہر حال کافیہ کی ان عجیب و غریب شرحوں کے متعلق کوئی خاص بات میری سمجھ میں مدتوں نہ آئی۔

لیکن کچھ دن بعد جب اس پر نظر پڑی کہ جس زمانہ میں کافیہ کے ساتھ یہ کارروائی کی گئی، یعنی مغلوں کے عہد میں یہ شرحیں لکھی گئی ہیں اور مغلوں سے پہلے دلی میں جو لودیوں کی حکومت قائم تھی، کہیں ذکر آ چکا ہے کہ ان ہی لودیوں میں ایک بڑا علم دوست معارف پژوہ بادشاہ سکندر لودی بھی گذرا ہے، اسی سکندر لودی کے زمانہ میں ایک صاحب جن کا نام شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری ہے، یہ شیخ محدث دہلوی کا بیان ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ان بخاری صاحب کا عرف عجیب بتایا گیا ہے یعنی

"عبدالوہاب بخاری مشہور بہ مچھی روٹی" (ملفوظات عزیزیہ ص ۹۷)

شاہ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو دلی والے مچھی روٹی کیوں کہتے تھے، بہ ظاہر یہ کچھ مجذوب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں، خود ان کا یہ عرف "مچھی روٹی" گونہ ان کی مجذوبیت کی دلیل ہے، ان کا مولد و منشاء ملتان تھا، ملتان ہی سے یہ متاہل ہونے کے بعد ایک خاص جذبہ کے تحت

"براہِ خشکی بزیارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بشتافت" اخبار، ص ۲۱۵

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۸) باطنیوں کی کتابیں عام طور سے نہیں ملتیں لیکن بازاروں میں ایک تفسیر شیخ اکبر محی الدین بن عربی کے نام سے مشہور ہے، جو دراصل اسی قسم کے ایک گمراہ کاشانی نامی کی کتاب ہے، نمونہ دیکھنا ہو تو اسے دیکھ سکتے ہیں، ہر آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے ۱۲

اور ایک دفعہ نہیں متعدد بار ممالک اسلامیہ کی سیر کی اور حجاز آتے جاتے رہے، آخر میں ملتان چھوڑ کر دلی آ گئے، سکندر لودی بادشاہ اہل دین وعلم کا قدر دان تو تھا ہی، ان کے ساتھ بھی خاص حسن سلوک سے پیش آیا، ان کے پیر شیخ عبداللہ تھے، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ پیر کے ساتھ حبِ مفرط رکھتے تھے، شیخ محدث کے الفاظ ہیں۔

"اورا باشاہ عبداللہ نسبت محبت دنیاز وطلب واسترشاد چنداں می بود کہ آنچہ می گویند کہ فنا فی الشیخ می باشد، ایں چنیں خواہد بود نسبت" ص۲۱۵

اس سے بھی افتاد مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبدالوہاب بخاری صاحب نے قرآن کی ایک عجیب و غریب تفسیر عربی میں لکھ ڈالی، عجب تفسیر؟ شیخ محدث فرماتے ہیں۔

"اکثر قرآن بلکہ تمام قرآن را ارجاع بہ نعت پیغمبر و ذکر او کردہ صلی اللہ علیہ وسلم"

یعنی الحمد سے لے کر والناس تک قرآن اور قرآن کی ہر آیت سے آپ نے یہ معنی پیدا کیا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور تعریف بیان کی گئی ہے، صرف دعویٰ ہوتا تو غنیمت تھا، پوری تفسیر اسی دعوے کے اثبات میں لکھ بھی ڈالی، اس قسم کی تفسیر میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ظاہر ہے شیخ محدث نے بھی لکھا ہے۔

"غالباً وقوع آں در غلبہ حال واستغراق وقت بودہ است"

ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی زندگی چونکہ مخلصوں کی زندگی سمجھی جاتی تھی، اور یہی معلوم بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے کہ جذب اور استغراق میں یہ کام اُنھوں نے کیا۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عوام میں ان کے اس کام نے بڑی اہمیت حاصل کی ہو گی، سارا قرآن پیغمبر کی نعت ہے، عام مسلمانوں کے لیے بہ ظاہر ایک بڑا دلکش فقرہ ہے میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے سوا قرآن کی ایسی تفسیر کہیں اور لکھی گئی ہو، کشف الظنون

وغیرہ میں بعض ایسی الٹی پلٹی تفسیروں کا ذکر تو کیا گیا ہے، جس میں من ملنے مطالب قرآنی الفاظ میں بھرے گئے ہیں، بعض تو اس میں ناگفتہ بہ ہیں، لیکن غنیمت ہے کہ ہمارا ہندوستان اس زمانہ میں اگر بہکا بھی تو کسی بُری بات کی طرف نہیں بہکا، اگرچہ بہکنے کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اگر قرآنی تعبیرات میں اس قسم کے کھینچ تان کی اجازت دیدی جائے تو جہاں کسی اچھے رجحان رکھنے والے آدمی نے سارے قرآن کو پیغمبر کی نعت بنا دیا، ہو سکتا ہے کہ شیطان کی کوئی ذریت سارے قرآن کو شیطان کی مدح ثابت کرنے پر آمادہ ہو جائے، اور ہو جائے کیا معنی! اس زمانہ میں دنیا جہان کے سارے مسلمانوں کو قرآن ہی کے رو سے کافر، اور کافروں کو مومن و مسلم جب ثابت کیا جا چکا ہے تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں اگر کوئی صاحب شیطانی مدح کے اثبات کی ہمت نہ کر گذریں۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ لودیوں کے بعد مغلی حکومت جب قائم ہوئی اور اکبری زیغ کا عہد شروع ہوا، اس وقت اشرار نے بیچارے حاجی مچھی روٹی صاحب کے اس طریقہ کار سے بھی ممکن ہے نفع اُٹھایا ہو، غالباً یہ تو لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اکبر کو تناسخ کے مسئلہ پر سخت اصرار تھا، جس کا تفصیلی ذکر حضرت مجدد الف ثانی والے مقالہ میں میں نے کیا ہے، اب کتاب کا تو نام صحیح طور پر اس وقت یاد نہیں، لیکن اسی تناسخ کے مسئلہ کو قرآن کی آیت سے اس میں ثابت کیا گیا تھا، بات ذرا فحش سی ہے لیکن عبرۃً لاولی الابصار نقل کفر، کفر نباشد کے طور پر ذکر کرتا ہوں، سورۂ یٰسین کی آیت

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم	پھر جب "الصور" میں پھونکا جائیگا، تو اچانک وے
مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ	قبروں سے اپنے رب کی طرف قطار در قطار نکلتے
يَنسِلُونَ ۔	چلے آئینگے ۔

صور کے معنی سینگ کے ہیں، صوری مشابہت کی وجہ سے صور سے مردوں کے واسطہ تو الد کو لے کر آگے مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اس میں نفخ کی حالت پیدا ہوتی ہے

تواسی سے نکل کر الاجداث یعنی رحم کی قبروں سے گذرتے ہوئے لوگ اپنے رب کے زیر پرورش بننے کے لیے قطار در قطار نکلتے چلے آتے ہیں، اور یہی صورت تناسخ میں میں پیش آتی ہو کہ مرنے کے بعد لوگ اسی طریقہ سے دوسرا جنم لیتے رہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں ڈاڑھی منڈانے کا زور ہوا، کسی نے فقہی دلیل یہ نکالی کہ کما یفعلہ عصاۃ العراق کو قضاۃ العراق بنا کر پیش کیا گیا، طبی نکتہ پیدا کیا گیا کہ "ریش از خصیتیں آب می خورد" اس لیے اس چیز کا رکھنا کیا ضرور ہی اور شاید اسی زمانہ کا استدلال ہی کہ حدیثوں میں واعفوا اللحی کے الفاظ ہیں، عفو کے معنی بڑھانا اور مٹانا دونوں آئے ہیں، 'عفت الدیار محلہا ومقامہا' میں عفو سے مٹنا ہی مراد ہی، قرینہ یہ قائم کیا گیا کہ اس حدیث میں اور نو باتیں مثلاً ناخن کٹوانا، بغل کے بال کا ازالہ، اور مونچھوں کا کٹانا ان سب کا تعلق ازالہ سے ہی، پھر ایک چیز کا تعلق ابقاء سے کیوں ہو۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طبقۃً بعد طبقۃٍ جس آیت یا جس حدیث کا مطلب مسلمان عہد صحابہ سے اس وقت تک منتقل کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں، اگر اس سے قطع نظر کر کے جس مطلب کو جو چاہے قرآنی آیات واحادیث پر چسپاں کرتا چلا جائے۔ اگر اس کی عام آزادی لوگوں کو دیدی جائے جیسا کہ اس زمانہ میں اس کی عام وبا پھیلی ہوئی ہی، تو اس ذریعہ سے بدیہی سے بدیہی مسائل کو بھی نظری بنا لیا جا سکتا ہی، ڈاڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کترانا صرف سنت نہیں بلکہ اسلام کا ایک متواتر اور متوارث "شعار" ہی جسے غیر مسلمان بھی جانتے ہیں، لیکن یاروں کے جی میں آیا تو اسی حدیث سے جس سے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم پیدا ہوتا ہی العیاذ باللہ لوگوں نے ڈاڑھیوں کے مٹانے کا حکم پیدا کرلیا،

جہاں تک میرا خیال ہی خواہ وہ اچھے رجحان ہی کے تحت کیوں نہ ہوا ہو لیکن اس طریقۂ عمل کی ابتدا، سکندر لودی کے عہد میں ان ہی "مچھی روٹی" والے صاحب سے ہوئی، اور اکبر کے زمانہ میں مختلف قرائن ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ غلط رجحانات

کی توجیہیں اس سے فائدہ اُٹھایا گیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی صریح شہادت تو اس کی موجود نہیں ہے لیکن میرا غالب گمان یہی ہے کہ کافیہ کی صوفیانہ شرح بجائے ایک کے تین تین جو اس ملک میں لکھی گئیں، وہ اسی قسم کے فتنوں کے سد باب کا ایک بہترین طریقہ تھا، اس قسم کی گمراہ ذہنیتوں کا یہ بہترین علاج ہے، قرآن و حدیث میں تحریفِ معنوی کی قینچیاں جو چلائی جاتی ہیں، تو چلانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی دُور کی کوڑی لا رہے ہیں، گویا ابھی ابھی عقد ثریا سے کوئی تازہ خوشہ توڑ کر لائے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں یہ بدترین غباوت، اور دماغی توازن سے محرومی کی دلیل ہے، کسی چیز کا نہ ماننا یہ اور بات ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے تو اس کا انکار صاف لفظوں میں کر دینا چاہیے، آپ کی سمجھ میں آدمی کا وجود تو ممکن ہے، مٹی کا یہ پتلہ دیکھ سکتا ہے، سُن سکتا ہے الغرض اس سے سارے حیاتی آثار ظاہر ہو سکتے ہیں، لیکن زندگی اور احساس کے یہی آثار اگر کسی غیر مرئی عنصر مثلاً ہوا یا نار یا نور وغیرہ کے کسی ٹکڑے یا قطعۂ خاص میں ظاہر ہوں، تو آپ کی عقل میں اگر یہ بات نہیں سماتی ہے، جن اور ملائکہ کا وجود اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو علمی دیانت کا یہ اقتضا ہے کہ آپ اس کا علانیہ انکار کر دیجیے، لیکن اس خیانت اور مردہ ضمیری کا ثبوت تو نہ پیش کیجیے کہ قرآن میں بھی نہ ملائکہ کا ذکر ہے، نہ جنون کا، اور یہ الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں، ان سے مراد آپ کا دماغی مقصد ہے یعنی عناصر کے قوی یا جنگلی آدمی وغیرہ وغیرہ، آپ کے نزدیک مسلمان اگر بدترین قوم ہے، خدا کی معتوب ہے، مقہور ہے، جہنمی ہے، تو آپ اس قوم سے جُدا ہو جائیے، اور جو آپ کی نظروں میں بہترین قومیں ہیں، خدا کی جو پیاری ہیں، جنت جن کا اجارہ ہے، ان میں جا کر شریک ہو جائیے، لیکن اپنے اس خیال کو قرآن پر تو نہ لادیے، آپ اس طریقہ سے خدا پر افتراء کر رہے ہیں، رسول پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔

بہرحال اس قسم کے ماؤف عقول واذہان کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ قرآن و حدیث کے جن الفاظ میں اُنھوں نے اپنے دماغی مطالب پہنائے ہیں، اور اُن کو غلط فہمی ہو رہی ہو کہ ان کے ان دور از کار مطالب کی شاید قرآنی یا نبوی الفاظ میں کچھ گنجائش نکلتی ہو، ان کو چاہیے کہ ہندوستانی علمار کی ان تریاقی شرحوں کا مطالعہ کرلیں، جن میں نحو جیسے علم کی کتاب سے تصوف کے مسائل نکالے گئے ہیں، اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ بھینس سے انڈے اور انڈوں سے روغن گل نکالنے کا کرشمہ جو آپ بڑے ناز و انداز، فخر و غرور سے دکھا رہے ہیں، یہ شاطروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، آپ اسی کو داہنے ہاتھ سے کھیلنے کی ناحق تکلیف اُٹھا رہے ہیں، آپ کی ذہنی سمیت ان شاء اللہ ان کتابوں سے زائل ہو جائیگی، آخر اتنا غبی کون ہوگا، جو واقع میں یہ باور کرنے لگے کہ ابن حاجب کی مُراد کافیہ کی عبارتوں سے حقائق و معارف کے مسائل ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر کچھ بھی کسی میں سمجھ ہوگی، ضمیر میں تھوڑی سی زندگی بھی جن کے باقی ہوگی، اُن کی گردنیں ان کتابوں کے دیکھنے کے بعد شرم سے جھک جائینگی ثابت ہوگا کہ اُنھوں نے بڑا بُرا کھیل کھیلا، کھیلنا تھا تو کچھ اسی قسم کی کتابوں کو بساط بنا کر کھیلتے، جن کے ساتھ اس قسم کی بازیگری شاید گناہ نہ ہو۔

ہندوستانی نظامِ تعلیم کے سلسلہ کی ایک اور بات جو بہ ظاہر خواہ جتنی بھی ناقابلِ لحاظ نظر آئے مگر میرے خیال میں اربابِ فکر کے لیے خاص توجہ کی دعوت دے رہی ہے وہ شیخ محدث دہلوی کی خود اپنی خود نوشتہ سوانح عمری کا وہ جز ہے جس میں اُنھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کی یہ عجیب خصوصیت بیان کی ہے، شیخ نے اپنے حالات اخبار الاخیار کے آخر میں لکھے ہیں، اسی میں ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے والد نے

"اوّل از قرآن مجید بے سابقہ تعلیم و قواعد حروف تہجی کہ اطفال خوانند دو سہ جز، بلکہ کمتر واللہ اعلم تعلیم فرمودند"

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ہجار کے حروفِ مفردہ کی تعلیم کے بغیر براہ راست قرآن کے حروفِ مرکبہ ہی سے شیخ کی تعلیم شروع ہوئی اور یہی بات سوچنے کی ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ

"سبق در سبق ایشاں می نوشتند و من می خواندم"

یعنی روزانہ قرآن کی چند سطریں لکھ کر ان کو پڑھاتے تھے، حروفِ تہجی کی شناسائی کے بغیر مرکب الفاظ سے تعلیم کا آغاز اور اُس میں اتنی کامیابی کہ شیخ فرماتے ہیں کہ وہی "دو سہ جز" جو اس طریقہ سے والد نے پڑھایا تھا۔

"قرآن ہمیں مقدار تعلم کردہ ام"

آگے قرآن خوانی کا ایسا ملکہ پیدا ہو گیا، اور

چناں قوت رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم

پیش ایشاں (والد) می گذرانیدم

سنتے ہیں وہی قرآن جسے عموماً بچے برس برس بلکہ اس سے زیادہ مدت میں ختم کرتے ہیں، شیخ فرماتے ہیں

در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم" اخبار۔ ص ۳۱۱

بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مجھے ذاتی تجربہ نہیں ہے لیکن شیخ نے جو بات لکھی ہے اگر یہ ان کے والد کی کرامت یا خود ان کی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، تو ان لوگوں کے لیے جو اس مسئلہ میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور عملی تجربات کے مواقع بھی ان کو حاصل ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا، کہ اس کا تجربہ کریں، بظاہر اتنی بات تو میری سمجھ میں بھی آتی ہے کہ حروفِ مفردہ کی تعلیم میں بچوں کو جیسے حروف سکھائے جاتے ہیں، الف، با کی شکلیں پہچنوائی جاتی ہیں، بجائے ان کے خود الحمد اور اللہ وغیرہ کی شکلیں ان کو کیوں نہ پہچنوائی جائیں، تاہم مسئلہ غور طلب ہے، ہندوستان کی تاریخ میں چونکہ اس کا تجربہ ہوا ہے اس لیے اربابِ نظر و فکر کے لیے اس کو پیش کر دیا گیا مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ چند سال ہوئے حیدر آباد کی نمائش میں ایک صاحب

نے اُردو کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کے تجربہ کا دعویٰ کیا تھا، لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا غالباً اُنھوں نے اپنی کتاب کا نام "بولتا قاعدہ" رکھا تھا، کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے، مجھ سے بھی ملے تھے کہتے تھے کہ میرا قاعدہ تجربہ کی منزل سے گذر چکا ہے لیکن کسی نے توجہ نہ کی، شیخ نے اِسی سلسلہ میں اپنی فارسی تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ

"شاید کہ چند جزو از بوستاں و گلستاں و دیوان خواجہ حافظ تعلیم کردہ باشند"

ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی نظم و نثر کی تعلیم ان کی بس ان ہی چند کتابوں کے انتخابات تک محدود تھی اس کے بعد اُنھوں نے جو کچھ پڑھا عربی زبان ہی کے متعلق پڑھا، اور اِس سے میرے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے فارسی کی جو شکل بنا دی ہے، اور عربی الفاظ سے اس زبان کو اُنھوں نے مالامال کر کے جو قالب اس کا تیار کر دیا ہے، کم از کم اس فارسی میں قابلیت حاصل کرنے کے لیے مسلسل فارسی ہی کی کتابیں پڑھتے چلے جانا جیسے کسی زمانہ میں رواج تھا، یعنی یوسف زلیخا کی مثنوی، سکندر نامہ بدر چاچ بہار دانش، طغرا، مینا بازار، رقعات عالمگیری، سہ نثر ظہوری، ترشیزی، ابوالفضل کے مکاتیب، انشائے خلیفہ، انوار سہیلی وغیرہ وغیرہ بیسیوں کتابوں کا ایک طومار تھا لیکن پھر بھی جہاں کہیں کوئی قرآن کی آیت، عربی کا کوئی شعر، یا فقرہ یا عربی کا کوئی نامانوس لفظ یا نادر الوواب کے الفاظ ان کتابوں میں آجاتے تو طلبہ ہی کی نہیں مدرس صاحب کی پالکی بھی وہیں رکھ دی جاتی تھی، بچپن کے زمانہ میں خیال آتا ہے کہ گلستاں کے عربی اشعار کا ترجمہ مکتب کے جو مولوی صاحب بآسانی کرا سکتے تھے، اُن کا شمار فضلاءِ وقت میں ہوتا تھا، میرا خیال ہے کہ نظم، خصوصاً نثر کی ان تمام فارسی کتابوں کی ساری دشواریاں عربی الفاظ سے پیدا ہوئی ہیں، معمولی صرف و نحو، قدرے عربی ادب کے جاننے والوں کے نزدیک طغرا اور بدر چاچ، درہ نادرہ، انوار سہیلی وغیرہ کی عبارتوں کا حل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہوتا کہ ان کی دشواری عربی الفاظ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی لیے میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ

فارسی کی تھوڑی سی مناسبت پیدا کر دینے کے بعد فارسی اور اردو ادب کی تکمیل کے
لیے ضرورت ہی کہ بچوں کو عربی کی ابتدائی کتابیں بلکہ قرآن اور حدیث کے ذریعہ سے
ادب عربی کی تعلیم صرف ونحو کی معمولی تعلیم کے بعد دلانی زیادہ مفید ہو سکتی ہی، جس کی
شہادت میں شیخ محدث دہلوی کو میں پیش کر سکتا ہوں، گلستاں بوستاں اور دیوانِ حافظ
کے چند انتخابات کے سوا اُنھوں نے فارسی میں کچھ نہیں پڑھا تھا لیکن فارسی زبان
پر ان کو جو قدرت حاصل ہی، اُس کا اندازہ ان کی فارسی کتابوں سے ان کے مکاتیب
وغیرہ سے ہو سکتا ہی، ان کی معیاری فارسی کا کون انکار کر سکتا ہی، فارسی کے بڑے سے
بڑے انشاپرداز کے مقابلہ میں شیخ کا قلم پیچھے نہیں رہ سکتا، نظم بھی اچھی لکھتے ہیں[1]
اور یہی مشورہ میرا اُردو کے لیے ہی کہ اُردو کے لیے اُردو ہی کی کتابوں پر کتابیں پڑھانے سے
زیادہ بہتر یہ ہی کہ تھوڑی بہت فارسی وہی جزو سے چند از گلستاں و بوستاں و خواجہ حافظ
اسی قسم کے منظومات و منثورات سے گذارنے کے بعد بچوں کو عربی میں لگا دیا جائے،
عربی کی تعلیم میں فارسی اور اردو دونوں کی قوت اور ترقی کا راز مضمر ہی، کم وقت میں فائدہ
زیادہ اور بہت زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہی، بلکہ عربی کی تعلیم اگر قرآن کے پاروں اور مختصر
حدیثوں کے ذریعہ سے دی جائے، یعنی بجائے ادبی قصوں اور اشعار کے ان ہی کو ادب
عربی کے سکھلانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو پھر مسلمان جس دینیات کے لزوم کا مطالبہ کرتے
ہیں، اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، وقتی طور پر دینیات کے چند مسائل کا
سکھا دینا، اور عمر بھر کے لیے بچوں میں اس کی صلاحیت پیدا کر دینی کہ براہِ راست
خطابِ الٰہی کے وہ مخاطب اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کو پیغمبر ہی کی زبان
میں سمجھنے پر قادر ہو جائیں، دونوں میں کوئی نسبت بھی ہی، میں نے پہلے بھی اپنے اس
مالیخولیا کا ذکر کیا ہی، اور دوبارہ پھر دہرایا ہی، شاید کہ کسی صاحبِ دل صاحبِ عمل کو

[1] حدائق الحنفیہ کے مصنف نے لکھا ہی کہ شیخ کی مکتوبہ سطروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچتی ہی۔

ان ناچیز مشوروں کی طرف توجہ ہو جائے۔

ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام میں جس چیز کی ہمیں کمی نظر آتی ہے، یا کم از کم اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا، وہ عجیب بات ہے کہ ریاضی (حساب) کا مسئلہ ہے، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں ہندوؤں کے سوا خود مسلمانوں میں بھی بعض بڑے بڑے محاسب گذرے ہیں[1]، لیکن مکتب خانوں میں بچوں کو حساب بھی سکھایا جاتا تھا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چلتا، ہندوؤں کے یہاں تو جیسا کہ اب تک پاٹھ شالوں میں رواج ہے، تقریباً حساب ہی سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اور یہ خاص قومی مزاج کی علامت ہے جس پر یہ قوم مفطور ہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں پر خواہ وہ کسی حال میں ہوں، دین کا پہلو ہمیشہ غالب رہا ہے، اسی لیے سب سے پہلی چیز جس سے ان کے یہاں تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے وہ قرآن کے حروف ہجا کی تعلیم ہے، ان کا خیال ہے اور بجا خیال ہے کہ آئندہ بچہ کے ساتھ کس قسم کے حوادث پیش آئینگے اسے کون جان سکتا ہے تعلیم میں وہ کہاں تک جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے، اسی لیے ان کی نگاہ میں جو چیز ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، یعنی قرآن اس سے بچوں کو آشنا کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں، آئندہ اگر کچھ بھی نہ پڑھ سکا تو بیچارہ مر پٹ کر کچھ قرآن تو پڑھتا رہیگا، دنیا نہ سہی دین تو سنبھال لیگا، میرا بھی یہی خیال ہے کہ کچھ اور ہو یا نہ ہو، لیکن قرآن کی حرف شناسی کا جو مرحلہ ہے، اس کو تمام مراحلِ تعلیم پر مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک دلچسپ چیز اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری "حیات النذیر" میں نظر آئی، مطلب یہ ہے کہ جب سے ہندوستان میں جدید نظامِ تعلیم کا رواج ہوا ہے، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو معنی مطلب سمجھے بغیر بچوں کو قرآن پڑھانے کا مخالف ہے اور یہ گروہ اس طبقہ کے سوا ہے جو سرے سے قرآن پڑھانے کا ہی قائل نہیں، ظاہر ہے کہ یہ

---

[1] مآثر الامراء دیکھیے خود فتح اللہ شیرازی خان اعظم ان لوگوں کا شمار تو اس فن کے نوابغ (جینیس) میں ہے۔

طبقہ تو قابل خطاب بھی نہیں ہی، کیونکہ ان کا مسلمانوں سے صرف نسلی تعلق ہی، دینی حیثیت سے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن دولت کو چھوڑ چکے ہیں، اپنے مرنے جینے کا فلسفہ اُنھوں نے خود گڑھ لیا ہی یا بجائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلسلہ میں وہ کسی دوسرے کے مشوروں پر ایمان لا چکے ہیں۔

لیکن جو ابھی مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، اور مسلمان ہی مرنا چاہتے ہیں خود بھی یہی چاہتے ہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بھی یہی چاہتے ہیں، اگر باوجود اس کے ان کے دماغ میں کسی نے یہ وسوسہ پھونک دیا ہی کہ معنی مطلب سمجھے بغیر قرآن کے خود پڑھنے یا بچوں کو پڑھوانے کا کیا فائدہ ہی، یہ ترقی پسندوں کا گروہ ہی، شروع شروع میں ترقی پسندوں کی جو ٹولی ہندوستان میں بنی تھی اس کے ایک سرگرم رکن جیسا کہ سب جانتے ہیں ڈپٹی نذیر احمد صاحب بھی تھے، تجدد مآبی کا جنون جب شباب پر تھا، اُس وقت ڈپٹی صاحب کے خیالات بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق جو تھے، اسی کتاب میں ڈپٹی صاحب کے ایک خط سے (جو اپنے لڑکے مولوی بشیر احمد مرحوم کے نام اُنھوں نے لکھا تھا، ان الفاظ میں منقول ہیں، ڈپٹی صاحب نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔

تم کو پہلے قرآن شریف شروع نہیں کرایا، کہ تم اس کو نہیں سمجھ سکتے اور بے سمجھے الفاظ کا رٹنا بے فائدہ اور لاحاصل ہی

لیکن جوں جوں "ترقی پسندی" کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا، قبر کا گڑھا، منہ پھاڑے سامنے جھانکتا نظر آنے لگا تو ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ڈپٹی صاحب کے ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے، اس کے بعد بچوں کو قرآن پڑھانے کے متعلق اپنی بدلی ہوئی رائے جو اُنھوں نے قلم بند کی تھی وہ اسی کتاب میں یہ ہی:

'بڑے ہو کر [illegible] اعصاب دہن (یعنی مُنہ کے رگ پٹھوں) میں کچھ ایسی [illegible] سختی وکرختگی) آجاتی ہی کہ زبان جن حروف کے ادا کرنے کی ابتدا سے

خوگر نہیں ہوتی پھر وہ اس سے بڑی عمر میں ادا نہیں ہو سکتے"

اور اسی تجربہ اور مشاہدہ نے ڈپٹی صاحب کو اس خیال کے قائم کرنے پر مجبور کیا کہ

"طوطے کی طرح پڑھنا بھی خاص کر مسلمان بچوں کے لیے ضروری ہے"

ڈپٹی نذیر احمد نے اس کے بعد ایک اور دل چسپ دلیل اس کی یہ پیش کی ہے۔

"اگر یہ بے سود ہو، تو مولود (پیدا ہونے والے نوزائیدہ بچے) کے کان میں اذان کا دینا اس سے بھی زیادہ بے سود فعل عبث ہے"

کوئی شبہ نہیں کہ ڈپٹی صاحب کا یہ سوال ایک چبھتا ہوا سوال ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس دقیانوسی ترقی پسند انسان کو کیا معلوم کہ جس چیز کو آپ حجت میں پیش کر رہے ہیں، یعنی نومولود بچوں کی کان والی اذان خود اُسی کے افادہ پر ان ہی کے پروردہ ترقی پسند نوجوانوں کو کب اعتماد ہے۔

ڈپٹی صاحب نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ اور تجربہ کی بات یہ بھی بیان کی ہے کہ

"سب سے بڑا فائدہ بچوں کو طوطوں کی طرح بے فہم مطلب قرآن پڑھانے سے مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ چاہے کوئی اس کو حسنِ عقیدت سمجھے، یہ ہے کہ قرآن خواں لڑکے زیادہ مودب اور کم آزار دیکھے جاتے ہیں، وجہ یہ کہ قرآن شریف پڑھنے کے لیے مؤدب بٹھائے جاتے ہیں، اور ادب رفتہ رفتہ داخل عادت ہو جاتا ہے"

ایک فائدہ یہ بھی بتایا ہے کہ

"قرآن سے بچوں کو تعلیم شروع کرنے کا یہ مفاد بھی کچھ کم نہیں کہ ذہین بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں مماثلت خطی کے سہارے قرآن کا اُردو ترجمہ پڑھنے پر قادر ہو جاتے ہیں، بہ یک کرشمہ دو کار"

یہ بھی ان ہی کا آخری تجربہ ہے۔

تعلیم کے پُرانے طریقے کے رو سے قرآن پڑھنے کے ضمن میں بچے چھوٹی چھوٹی دس پانچ سورتیں بھی نماز کے لیے یاد کر لیا کرتے تھے، یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے جو جدید طریقہ سے تعلیم پا رہے ہیں ان کو "الحمد" تک پوری نہیں آتی، درود اور التحیات کی کون کہے، اور آئے کہاں سے، بیچاروں کو راستہ پر ڈالا ہی نہیں۔ ص ۱۲ حیات النذیر

ایجوکیشنل کانفرنس کے پُرانے جلسوں میں قدیم تعلیم کی تضحیک و تحمیق پر لکچر دینے والوں کو دیکھ رہے ہیں، وہی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو اپنی راہ سے پھیرا تھا، آج اس کا دُکھڑا لے کر بیٹھے ہیں کہ مسلمان بچوں کو "الحمد" بھی پوری یاد نہیں ہوتی۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے عفا اللہ عنہم

بہر حال اگر ہمیں اس ملک میں مسلمان ہو کر جینا ہے اور مرنا بھی ہے اسلام اور ایمان کے ساتھ، اپنے متعلق بھی جن کا یہی خیال ہے، اور اپنے بچوں کے متعلق بھی جن کی یہی آرزو ہے، ان کے لیے ناگزیر ہے، خواہ کچھ بھی کہا جائے کچھ بھی سُنا جائے لیکن قرآن مجید سے بچوں کی تعلیم کی ابتدا، کا جو قاعدہ تیرہ سو سال سے نسلاً بعد نسلٍ ہر ملک اور خطہ میں چلا آ رہا ہے، اس کو بہر حال باقی رکھنا چاہیے۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

لیکن اِسی کے ساتھ اس زمانہ کے جدید اسکولوں میں بچوں کو حساب کی تعلیم جس وقت اور جس عمر سے شروع کرائی جاتی ہے، اس سے بھی غفلت نہ برتنی چاہیے، میں نے جیسا کہ عرض کیا ہندوستان میں کیا ہوتا تھا، اس وقت تک کوئی وثیقہ اس باب میں نفیاً یا اثباتاً مجھے نہیں ملا ہے، لیکن ابن خلکان سے ابن سینا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق جو فقرہ میں نے نقل کیا تھا، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ ساتھ حساب الہند اور دوسرے

حسابی قواعد بچوں کو قدیم زمانہ سے سکھانے کا رواج مسلمانوں میں پایا جاتا تھا[1]۔ بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے کہ عام سرکاری مدارس کے میٹرک کلاس تک حساب کی جتنی تعلیم دی جاتی ہے، اسلامی مکاتب میں اتنی تعلیم حساب کی تو ضروری ہے، گویا اُردو اور اردو کو قوی کرنے کے لیے فارسی، فارسی میں زور پہنچانے کے لیے عربی کا ایک سلسلہ جاری رہیگا۔ اور دوسرا مضمون اسی کے ساتھ ساتھ حساب کا بھی مسلسل جاری رہنا چاہیے میٹرک کی منزل تک اسی سلسلہ کو پہنچا دینا چاہیے، نیز حکومتِ وقت کی جو زبان ہو اس کی تعلیم کی بھی گنجائش آغاز تعلیم کے تیسرے چوتھے سال سے نکالنی چاہیے، قرآن کے سوا ان تینوں سلسلوں کو مکاتب میں جہاں تک میرا خیال ہے لازمی طور پر ہر بچہ کے لیے جاری رہنا چاہیے، البتہ عمر کے حساب سے بعض سلسلے، مثلاً حکومت کی زبان کا سلسلہ خصوصاً جب اجنبی زبان ہو، مناسب ہوگا کہ چند سال کے بعد شروع کیا جائے۔

ان تین لازمی سلسلوں کے ساتھ اور بھی کچھ گنجائش نکلے تو ایسے مضامین جو تعلیم کے بغیر نہیں آسکتے، ان کو بھی رکھا جا سکتا ہے، لیکن مسلمانوں کو بہر حال بزرگوں کا وہ طریقہ یعنی قرآن سے تعلیم کی ابتدا، اس کو کسی حال میں قطعاً کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے البتہ سہولت پیدا کرنے کے لیے طریقۂ تعلیم میں ردو بدل ممکن ہے، مثلاً شیخ محدث نے جو طریقہ اپنی تعلیم کا بتایا ہے اُس کو آزما کر دیکھا جائے، بہر حال کچھ بھی ہو، قرآن سے آغازِ تعلیم یہ ہمارے بزرگوں کا وہ متروکہ ہے جس پر ہر زمانہ میں ہر اسلامی ملک نے اصرار کیا ہے، اسلامی گھرانوں میں بشرطیکہ وہ اسلامی باقی بھی رہ گئے ہوں، تسمیہ خوانی کی رسم کو جن خصوصیتوں کے ساتھ ہم آج پا رہے ہیں، بجنسہ اپنے ان ہی لوازم کے ساتھ یہ رسم اسی ملک میں آج سے پانچ چھ سو سال پیشتر بھی ادا ہو رہی تھی، فوائد الفواد میں

---

[1] ابوالفضل نے آئین اکبری میں عہد اکبری کے نصاب کا ذکر کیا ہے، اس میں اور چیزوں کے ساتھ حساب و ریاضی کا بھی ذکر ابتدائی مکتبی تعلیم کے سلسلہ میں کیا گیا ہے ۱۲۔

امیر حسن علا سنجری ناقل ہیں کہ

شنبہ شانزدہم ماہ محرم ۷۱۶ سنہ سعادت دست بوس حاصل شد، بندہ آں روز خردکے را از اعزہ پیش برد، عرضداشت کرد کہ ایں را بہ قرآن خواندن فرستادہ می شود اول بخدمت مخدوم آوردہ شدہ است تا بہ برکت نظر مخدوم دنفس پاک خدائے تعالیٰ اورا قرآن روزی کند" صہ ۱۰۱

اور یہی رواج بحمد اللہ مسلمانوں میں اب تک جاری ہے کہ شہر یا قصبہ، گاؤں میں نسبتاً جو زیادہ صاحبِ دین وعلم ہو، بچوں کا مکتب ان ہی سے کراتے ہیں، امیر حسن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے یہ سُن کر " دعا رخیر ارزانی داشت"

جب دعا ہو چکی

بعد ازاں تختہ بدست مبارک گرفت و نوشت "بسم اللہ الرحمن الرحیم"

"اللہ الرحمن الرحیم" کی یاد تو ہر کام سے پیشتر مسلمانوں کا دستور ہی ہے، لیکن عجب بات ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ آج بھی بچوں کے مکتب کا آغاز ہوتا ہے، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں بھی آغاز کے وہی الفاظ مروج تھے حسن لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کے بعد حضرت والا نے ارقام فرمایا۔

"رب یسر ولا تعسر" (اے اللہ علم کو آسان کر اسے دشوار نہ بنا)

"ا ب ت ث ج"

ہجا کے یہ حروف سلطان المشائخ نے اپنے دست مبارک سے لکھے، خردک آگے بڑھایا گیا، اور حضرت والا نے

"آں گاہ ایں حروف را بزبانِ مبارک خود تلقین کرد"

یہ چھ سو سال کی تسمیہ خوانی اور آغاز مکتب کی رپورٹ دلّی کی ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، کہ مسلمان اس ملک کے جس گوشہ میں بھی آباد تھے، باوجود مسافت کے رنگ

سب کا ایک تھا، عہد خلجی و تغلقی میں یہ تماشا آپ کو دلی میں نظر آرہا ہے، آئیے، سیکڑوں میل دور دلی سے مشرق چلے آئیے، بہار آجائیے، یہاں مخدوم الملک حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ مسند ارشاد پر جلوہ فرما ہیں، ان کے ملفوظات طیبہ معدن المعانی کے نام سے مطبوع ہو چکے ہیں، ایک مجلس کا ذکر جامع ملفوظ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"قاضی شرف الدین خواہرزادۂ خود بردہ بود و عرضداشت کہ امروز روز تعلیم خواہر زادۂ بندہ ماست، مطلوب ایں است کہ اول تختہ پیش مخدوم آغاز کند"

ایک ذہنیت، ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ سے دلی میں بھی بچے آغاز مکتب کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں اور بہار میں بھی۔

دلی میں بھی آپ نے دیکھا تھا کہ تختہ کو لے کر سلطان المشائخ نے اس میں ارقام فرمایا تھا، یہاں بھی دیکھیے جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ قاضی شرف الدین نے عرض کیا

"اول تختۂ بندگی مخدوم بدست مبارک نویسد، بندگی مخدوم عظمہ اللہ اجابت فرمود بدست مبارک ایں چہار حرف نبشت ا ب ت ث بعدہ اورا ہمیں چار حرف تعلیم کرد"

البتہ یہاں طریقہ تلقین میں ذرا سا فرق ہے، یعنی مخدوم الملک نے اس کے بعد خواہرزادۂ قاضی کو کہا۔

"بگو بسم اللہ الرحمن الرحیم ان پسرک (اللہ الرحمن الرحیم کے نام سے کہ علم کو تجھ پر آسان کرے)"

بچہ نے

"بسم اللہ تمام گفت بعدہٗ ان چہار حرف تعلیم تلقین فرمود"

اور بچہ سے صرف چار حروف ہی بسم کے ساتھ ادا نہیں کرائے گئے بلکہ

ان پسرک نیز چنانچہ بندگی مخدوم تعلیم فرمود ہمچناں حرف نہا را بگفت"

واللہ اعلم خود بچے نے سب کے ساتھ اسے بھی ادا کر دیا یا ادا کرایا گیا، مکتب کی رسم ادا ہوگئی۔

بعدہ برلفظ مبارک راند کہ "الحمد للہ" وایں دعا در حق وے ارزانی فرمود کہ حق تعالیٰ ترا عالم گرداند"

بچہ کا مکتب ختم ہوگیا، اب بڑوں کی تعلیم شروع ہوئی جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ اسی مناسبت سے حضرت والا نے انسانیت کی ان بلندیوں کی طرف اشارہ فرمایا جو آدمی زادہ کو تعلیم عطا کرتی ہے، فرمایا عجب بات فرمائی

"از الف تا با و تا کجا بازد رسانید"

خود جو یہ کہہ رہا تھا، اُسی الف تا با نے دنیا اور دین کی مخدوم الملکی کے کس مقام تک اُسے پہنچایا، کہ ابوالفضل جیسا طاغی بھی ان کے ترجمہ میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

فراواں تصنیف از و یادگار ازاں میان مکتوبات او در شکستگی نفس آزموں دارد (ج ۳ ص ۱۷۲)

شیخ محدث نے تو بجائے تعارف کے یہ ارقام فرماکر

"وے از مشاہیر مشائخ ہندوستان ست چہ احتیاج کہ کسے ذکر مناقب او کند او را تصانیف عالی ست" ص ۱۱۷

اور صرف چند مکاتیب کو نقل کر کے بجائے بگوئد کے مشک کے لیے بہ بوید کے تجربہ پر ان کے فضائل کو محول کر دیا۔

مکتب کے اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حسب دستور مکتب کے بعد دعوت یا مٹھائی وغیرہ کوئی چیز تقسیم ہوئی یا نہیں، غالب گمان یہ ہے کہ یہ رسم ادا ہوئی ہوگی، امیر حسن علا نے ذکر نہیں فرمایا، لیکن مخدوم الملک کے جامع ملفوظات نے اس کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں

طعامے نیز آوردہ بودند پیش یاراں کشیدند یک کاک (بسکٹ) وقدرے
شیرینی بندگی مخدوم بستد وہماں پسرک را خورانیدن گرفت وایں لفظ فرمود
کہ "ما خدمت تو کنم" (معدن المعانی ص ۴۲)

ہر پہلی نسل پچھلی نسل کی خادم ہے، گویا اسی نظریہ کی طرف گو مزاحًا سہی اشارہ تھا، رحمہم اللہ اجمعین، شاید اس بہاری مخدوم کے اس بہاری خادم کی غرض اپنی بکواس سے بھی یہی ہو۔ اللّٰھم ارزقنا اتباعھم، وتقبل منا انك انت السمیع العلیم، ھذا واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

۱۷/ ربیع المنور سنہ ۱۳۶۱ھ پنجشنبہ

حیدرآباد دکن، جوار الجامعۃ العثمانیہ

دعاء خاتمہ

کتابوں میں "خاتمہ" لکھنے کا بھی عام دستور ہے، جب میرے اس مضمون نے کتاب ہی کی شکل اختیار کرلی، تو یہ رسم بھی کیوں چھوڑی جائے۔ لیکن کیا لکھوں ؟ بعض کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ دیباچوں، یا تمہیدی کلام ہی میں ان کے مصنفین کتاب کے ناظرین سے صلہ کی خواہش خواہ وہ کسی شکل میں ہو مثلاً دعا ہی کی آرزو اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے کرتے ہیں، مگر بظاہر میرے خیال میں یہ استدعا کچھ قبل از وقت ہے، یہ [illegible] م اس کا خاتمہ ہی ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد اگر کسی کو اس کتاب سے یا اس کے کسی جزء سے کسی قسم کا کوئی فائدہ محسوس ہوا ہو، تو غالباً اس کے بعد "دعا بظہر الغیب" کی تمنا بے جا نہ ہوگی، اسی بنیاد پر اب میری التجا ہے کہ خود مجھے میرے والدین مرحومین اور میرے اساتذۂ کرام کو ناظرین حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعاؤں سے محروم نہ فرمائینگے، علی الخصوص عم محترم استاذ معظم حضرت مولانا الحکیم الحاج السید محمد ابو النصر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کی آغوش تربیت میں فقیر کی تعلیم ہوئی، اور سلامت روی کی راہ کا بڑا حصہ ان ہی کی پاک صحبتوں میں میسر آیا، فاتحہ خیر سے ان کی روح پرفتوح کو سکون بخشینگے،

اللّٰھم ارحمہ کما ربیانی صغیرا

اسی کے ساتھ آخر میں اپنے عزیز دوست و صاحب مولوی محمد مخدوم محیی الدین صاحب حیدرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ خود اپنی طرف سے اور ان تمام لوگوں کی طرف سے ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں جو اس کتاب کو اپنے مطالعہ سے سرفراز فرمائینگے۔ مخدوم صاحب نے بڑی جانکاہی اور محنت سے میرے مسودہ (نامہ سیاہ) کو سچ پوچھیے تو مبیضہ (نامۂ سفید) کی شکل میں بدل دیا ہے، اگر ان کی دستگیری میسر نہ آتی، تو جس طرح میرے بہت سے مسودے مسودوں کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے اس کا حال بھی یہی ہو جاتا، ناظرین اپنی دعاؤں سے ان کو بھی اور ان کے والد مرحوم کو فراموش نہ فرمائینگے۔

غالباً خواہد کشود از خامہ‌ام کارے کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبحِ آمیں می‌دمید
(عارف شیرازی)

۲۶۔ ذی حجہ سنہ ۱۳۶۱ھ م یکم اسفندیار سنہ ۱۳۵۲ف

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات، آج ۴۔ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء روز دوشنبہ بعد الظہر اپنے وطن گیلانی (بہار) میں اس مبیضہ کی نظرِ ثانی سے فراغت میسر آئی

کہف الایمان "گیلان" (بہار)